پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
شخصیت اور علمی و ادبی خدمات

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

دسمبر ۲۰۰۲ء

مقالہ نگار

محمد ابرار الباقی

ایم۔اے، ایم۔فل،

نگران

ڈاکٹر محمد انور الدین

پروفیسر، شعبۂ اردو۔

شعبۂ اردو۔ اسکول آف ہیومانیٹیز۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۴۶

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

فہرستِ مشمولات

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

- پیش لفظ ۵ تا ۱۶

- پہلا باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سوانح و شخصیت ۱۷ تا ۳۵

- دوسرا باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے علمی و ادبی کارنامے ۳۶ تا ۴۲

- تیسرا باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت محقق ۴۳ تا ۹۴

- چوتھا باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت مدون و مرتب ۹۵ تا ۱۳۸

- پانچواں باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت خاکہ نگار ۱۳۹ تا ۲۲۱

● چھٹا باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت سوانح نگار ۲۲۲ تا ۲۵۸

● ساتواں باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت نقاد ۲۵۹ تا ۲۷۳

● آٹھواں باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے متفرق علمی و ادبی کارنامے ۲۷۴ تا ۲۸۱

● نواں باب

ادارہ ادبیاتِ اردو اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۲۸۲ تا ۲۹۴

● دسواں باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نقادوں اور معاصرین کی نظر میں ۲۹۵ تا ۳۴۴

● گیارہواں باب

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے علمی و ادبی خدمات کا اجمالی و تنقیدی جائزہ ۳۴۵ تا ۳۵۳

● کتابیات ۳۵۴ تا ۳۶۲

پیش لفظ

تمام حمد و ثنا اس رب عظیم کی جس کی ذات سب سے بڑی تخلیق کار ہے اور جس نے کن " کی صدا کے ساتھ یہ عظیم الشان کائنات تخلیق کی اور اپنی تخلیق کے شاہکار " انسان " کو علم و عقل کی بنیاد پر " اشرف المخلوقات " کے خطاب سے سرفراز فرماتے ہوئے اسے نیابت کا شرف بخشا اور انسان کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی کتاب کی پہلی وحی کا آغاز لفظ " اقرا " (پڑھ) سے کرتے ہوئے یہ ضابطہ حیات پیش کیا کہ علم کے نور سے ظلمت کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔ تمام درود و سلام نبی رحمتؐ پر جن کی ذات سارے عالم کے لیے رحمت ہے اور جن کے فرمان "گود سے گور تک علم حاصل کرو" کے مصداق خدا نے مجھے اپنے فضل و کرم سے نہ صرف ایک علمی گھرانے میں پیدا کیا بلکہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی۔

حصول علم کی طلب مجھے ابتدا ہی سے رہی اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے مجھے گریجویشن کی تکمیل کے بعد جامعاتی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ گچی باؤلی حیدرآباد میں مکان سے قریب واقعہ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں تعلیم حاصل کرنے کا میرا خواب ایم۔اے میں داخلہ کے ذریعہ پورا ہوا۔ ۱۹۹۷ء میں ایم۔اے کی تکمیل کے بعد اسی یونیورسٹی سے میں نے ۲۰۰۰ء میں پروفیسر محمد انور الدین صدر شعبہ ٔ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے نگرانی میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تصانیف کی وضاحتی کتابیات کے موضوع پر ایم۔فل کا مقالہ مکمل کیا اور اپنی تحقیقی تشنگی کو دور کرنے اور اس میدان میں اپنی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشنے کے لیے میں نے پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا۔ موضوع کا انتخاب تحقیق کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ نظم کے مقابلے میں نثر میں تحقیقی کام کا رجحان میرے اندر پایا جاتا ہے۔ چناں چہ اسی رجحان کو رہنما بنا کر میں نے موضوع

کی تلاش شروع کی۔ اپنے اساتذہ سے مشورہ کیا اور ان سے موضوع کے انتخاب میں رہنمائی کی درخواست کی۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد میں دورانِ تعلیم مجھے یہاں کی ادب نواز فضاؤں میں مختلف سمیناروں، سمپوزیموں اور ادبی مقابلوں میں حصہ لینے اور مختلف لائبریریوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ اس دوران حیدرآباد کی مشہور علمی دانش گاہ جامعہ عثمانیہ بھی کئی بار جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے اساتذہ سے استفادے کا موقع بھی ملا۔ ان اساتذہ میں مجھے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے تبحرِ علمی اور شخصی برتاؤ سے کافی متاثر کیا۔ ادارہ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد کے اردو امتحانات کے ضمن میں اور ادارہ کے کتب خانے کے استفادے کے لیے بھی اکثر ادارہ جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ یہاں بھی ان کی حرکی شخصیت و معتمد شعبہ امتحانات کی حیثیت سے ان کی شخصیت کا تاثر مجھ پر گہرا پڑا۔ میں نے ان کی تصنیفات کے بارے میں سرسری طور پر سن رکھا تھا۔ خود ان سے استفسار کر کے اور اپنے اساتذہ سے مشورہ کرنے کے بعد میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصنیف کردہ کتابیں مرزا علی لطف حیات اور کارنامے، دیوانِ لطف، عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے اور خوش نفساں کا مطالعہ کیا۔ تو مجھے یہ احساس ہوا کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کے محقق ہیں بلکہ ایک اچھے مدون و مرتب، سوانح نگار، خاکہ نگار، نقاد اور انشا پرداز بھی ہیں اور اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس شخصیت کے تحقیقی و تنقیدی کارنامے یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر مفصل تحقیقی کام کرتے ہوئے ان کو ادبی حلقوں سے متعارف کرایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ میں نے پہلے یہ طمانیت حاصل کرلی کہ کہیں ان پر کسی اور جگہ کسی قسم کا تحقیقی کام تو نہیں ہوا۔ چناں چہ مجھے یہ جان کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ پر کسی بھی جامعہ میں ایم۔ فل یا پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ چناں چہ میں نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف کے مختصر تعارف کے ساتھ "پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ شخصیت اور علمی و ادبی خدمات" کے عنوان سے Synopsis تیار کر کے شعبہ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں داخل کیا اور یہ اصرار کیا کہ مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میرا تجویز کردہ موضوع منظور کرلیا گیا اور مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ نگران کے لیے میں نے اپنے ایم۔ فل کے

نگران اور مشفق استاد پروفیسر محمد انور الدین صدر شعبہ سے مودبانہ گزارش کی کہ آپ میرے تحقیقی سفر میں آگے بڑھنے کے لیے میرے نگران بننا قبول کریں چناں چہ میری درخواست کو انھوں نے قبول کرلیا۔ اس طرح میرا داخلہ پی ایچ۔ ڈی میں ہو گیا۔

تحقیق میں موضوع کے انتخاب کے بعد کا دوسرا اہم مرحلہ مواد کی فراہمی کا ہوتا ہے۔ چناں چہ میں نے مواد کے حصول کی کوشش شروع کر دی۔ میرا موضوع چوں کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کے متعلق ہے اور موضوع سے متعلقہ شخصیت پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ فضلِ تعالیٰ بہ قید حیات ہیں۔ لہٰذا مجھے تحقیقی مقالے کے پہلے جز پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی حیات کے بارے میں مواد اکٹھا کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ چناں چہ شخصی انٹرویو، اہلِ خاندان سے ملاقاتوں اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے ہم عصر اساتذہ، ادیبوں، شاعروں اور دوست احباب سے ملاقاتیں کرتے ہوئے میں نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی حیات سے متعلق کافی معلومات اکٹھا کیں۔ اس ضمن میں خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے رہنمائی کی۔ اپنی اہلیہ، بیٹی اور بیٹوں سے ملاقاتیں کراتے ہوئے اپنے کوائف بہم پہنچائے۔ ایک محقق کو پہلے مفروضہ قائم کرنا پڑتا ہے اور اس پر آگے چل کر استخراج نتائج کی منزل آتی ہے تحقیق کا طالب ہونے کے ناطے اس کے مزاج میں شک کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ ہمیں پڑھایا گیا تھا کہ محقق کا مزاج مشکک ہونا چاہیے اور اسے کسی بھی بات پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہ کرنا چاہیے بلکہ ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے چناں چہ میں نے بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بیان کردہ حالات کو دیگر ذرائع سے تصدیق کر کے ان کی حیات اور شخصیت و سیرت و علمی و ادبی کارناموں کے بارے میں اپنے رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں میں نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی جملہ تصانیف اور ان کے مختلف مضامین جو موقر اخباروں اور رسالوں میں بکھرے پڑے تھے جمع کرنے شروع کیے۔ اسی کے ساتھ حسبِ ذیل کتب خانوں اور لائبریریوں سے مواد حاصل کیا۔

۱	اندرا گاندھی میموریل لائبریری	یونیورسٹی آف حیدرآباد گچی باؤلی حیدرآباد
۲	عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری	عثمانیہ یونیورسٹی کیمپس حیدرآباد

۳	کتب خانہ آصفیہ	افضل گنج حیدر آباد
۴	نظام ٹرسٹ لائبریری	ملک پیٹھ حیدر آباد
۵	ادارہ ادبیاتِ اردو لائبریری	پنجہ گٹہ، حیدر آباد
۶	اردو ہال لائبریری	حمایت نگر، حیدر آباد
۷	اردو اکیڈمی لائبریری	پرانی حویلی، حیدر آباد
۸	استاد شیخ داؤد میموریل لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر	ٹولی چوکی حیدر آباد
۹	سٹی گرند ھالیہ	نارائن گوڑہ، حیدر آباد
۱۰	سٹی گرند ھالیہ	بازار گارڈ، نامپلی حیدر آباد
۱۱	نجی کتب خانہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ	حیدر گوڑہ، حیدر آباد
۱۲	نجی کتب خانہ پروفیسر محمد انور الدین	آغاپورہ، حیدر آباد

ان کتب خانوں کے علاوہ میں نے روز نامہ سیاست اور روز نامہ منصف کے دفتر پہنچ کر ان اخبارات کے خصوصی سپلمنٹوں کی قدیم فائلوں سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحریر کردہ مضامین حاصل کیے اور بہ حیثیت مجموعی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی شخصیت کے بارے میں معاصرین کی آراء حاصل کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی مواد کی فراہمی میں بھرپور تعاون کرتے ہوئے اپنی تمام تصانیف اور زیرِ طبع تصانیف کے زیراکس اور مسودے بہم پہنچائے۔

مواد کے یکجا ہو جانے کے بعد تحقیقی مقالے کا سب سے اہم مرحلہ مواد کو مناسب انداز میں سمیٹتے ہوئے مقالہ کی تسوید کا ہوتا ہے۔

موضوع کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنے کے بعد ایک ایک باب کی تسوید اور اس کی جانچ کے دوران میرے نگران پروفیسر محمد انور الدین نے میری ہر لمحہ رہنمائی کی اور ان کی رہنمائی کے بعد میرے تحقیقی مقالہ " پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ شخصیت اور علمی و ادبی خدمات " مکمل ہوا۔

زیرِ نظر مقالہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

پہلا باب پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح اور شخصیت کے عنوان سے ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاندانی حالات کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کے آباد و اجداد، والدین، پیدائش، مقام پیدائش، ابتدائی تعلیم، گھریلو ماحول، اعلیٰ تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، ملازمت کے دوران پیش آنے والے واقعات، تصانیف و تالیف، انعامات و اعزازات، مختلف انجمنوں اور اداروں سے وابستگی، بیرونی سفر، ملازمت سے سبک دوشی اور بعد سبک دوشی مصروفیات مسلک مذہبی عقیدہ کا ضمنی عنوانات کے تحت تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی شخصیت کے عنوان کے تحت حلیہ، وضع قطع، لباس، پسند، ناپسند اور مختلف مشاغل وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا باب "پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے علمی و ادبی کارنامے" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف، ان کی زیرِ طبع تصانیف، ان کے تحریر کردہ مقالے و مضامین، مختلف اداروں سے ان کی وابستگی کی تفصیلات، سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت اور وہاں پڑھے جانے والے مقالوں و مضامین کی تفصیلات ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کرنے والے طلباء ان کے تحقیقی مقالوں کے عنوانات کی تفصیلات کا ضمنی عنوانات کے تحت اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب "پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت محقق" کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں تحقیق کی تعریف پیش کرنے اور تحقیق کے مختلف مبادیات کا تذکرہ کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیقی کاوش "مرزا علی لطف" کا تحقیقی و تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے یہ تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ جسے بعد میں زیور طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرایا۔ اس کتاب میں شامل فورٹ ولیم کالج سے وابستہ اور اپنی زندگی کے آخری ایام حیدرآباد میں مختلف نوابوں کے دربار میں گزارنے والے مرزا علی لطف کی حیات، ان کے تذکرہ گلشنِ ہند پر تبصرہ اور ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور بہ حیثیت محقق پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ادب میں مقام تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا باب " پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت مدون و مرتب " کے عنوان سے ہے۔ ہر اچھا محقق کچھ نہ کچھ قدیم متون کی تدوین کے کام بھی کرتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی لطف کی حیات پر تحقیقی کام کے دوران جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ سے لطف کے کلام کا مخطوطہ تلاش کیا۔ چناں چہ انھوں نے تذکرہ "گلشنِ ہند" کے مختلف دست یاب مسودوں میں شامل لطف کے کلام کا موازنہ جامعہ عثمانیہ سے حاصل ہونے والے مخطوطے سے کرتے ہوئے "دیوانِ لطف" کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ اور مشکل الفاظ کی فرہنگ کے ساتھ لطف کا دیوان مدون کیا۔ "دیوانِ لطف" کے علاوہ انھوں نے "دیوانِ حفیظ" کی تدوین بھی کی۔ اور حفیظ کے کلام پر ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے حیدرآباد کے مشہور شاعر برق موسوی کا کلام " یدِ بیضا " کے عنوان سے اپنے ایک طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ان تدوین کے کاموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی مدونہ و مرتبہ کتابوں کا تدوین متن کے اصولوں کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ تدوین متن کے مختصر اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔

پانچواں باب " پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت خاکہ نگار " کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں خاکہ نگاری کی تعریف، اس کے درکار لوازمات اور اردو میں خاکہ نگاری کی روایت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے دو مجموعے " خوش نفساں " اور " نفوسِ گرامی " (زیرِ طبع) میں شامل خاکوں کا تفصیلی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ " خوش نفساں " میں شامل بارہ خاکے ہیں اور " نفوسِ گرامی " کے مسودے میں شامل خاکوں سے سات خاکوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور خاکہ نگاری کے میدان میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ خاکے چوں کہ حیدرآباد کی سماجی، علمی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں لکھے گئے ہیں چناں چہ اس باب میں بیسویں صدی کے حیدرآباد کی سماجی و ادبی زندگی کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

چھٹا باب " پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت سوانح نگار " کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانحی و تحقیقی کتاب " محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے " کا سوانح

نگاری کے اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ عزیز مرزا بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ریاست حیدرآباد کے وزیر داخلہ تھے۔ موسیٰ ندی میں ۱۹۰۸ء میں آئی قیامت خیز طغیانی کے بعد عزیز مرزا کی امدادی کاموں میں لی گئی دل چسپیوں کے احوال اور عزیز مرزا کی علمی وادبی خدمات کی تفصیلات اس باب میں درج ہیں۔

ساتواں باب "پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت نقاد" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں تنقید کی تعریف اور تنقید کے مختلف دبستانوں کے تعارف کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تنقیدی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تنقیدی مضامین، مقدموں، تبصروں، تقاریظ وغیرہ کی شکل میں ملتے ہیں۔ چناں چہ مختلف تنقیدی دبستانوں کی نمائندگی کرنے والے مضامین، مقدموں اور تبصروں کا جائزہ لیتے ہوئے اس باب میں بہ حیثیت نقاد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مقام کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

آٹھواں باب "پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے متفرق علمی و ادبی کارنامے" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی مرتبہ دو کتابیں (۱) ابتدائی تلگو ریڈر، (۲) تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی (تعارفی) کتاب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں اردو زبان والوں کو تلگو سکھانے کے لیے مرتب کی گئی تھیں۔ اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا بہ حیثیت شاعر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی مذہبی مضامین کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

نواں باب "ادارۂ ادبیاتِ اردو اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ" کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی ادارۂ ادبیاتِ اردو سے وابستگی اور ان کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے معتمدِ شعبۂ امتحانات ہیں اور گزشتہ آٹھ سال کے دوران ادارہ سے وابستگی کے بعد ادارہ کی ترقی کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

دسواں باب "پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نقادوں اور معاصرین کی نظر میں" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف اور علمی و ادبی کارناموں کے بارے میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اردو کے محققین، نقادوں، ادیبوں اور شاعروں کی آرا اور دوست احباب، رشتہ داروں،

شاگردوں اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے معاصرین کے تاثرات کو پیش کیا گیا ہے ۔ ان آرا کو پڑھنے اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے والوں کی ایک طویل فہرست کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہند و پاک کی ایک مقبول عام شخصیت ہیں اور ان کے کارناموں کی گونج ہندستان میں چار سو سنائی دیتی ہے۔

گیارہواں اور آخری باب " پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی علمی و ادبی خدمات کا اجمالی تنقیدی جائزہ " کے عنوان سے ہے ۔اس باب میں بہ حیثیت مجموعی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور بہ حیثیت محقق ،نقاد ،خاکہ نگار و سوانح نگاران کے فن کا بھی جائزہ لیا گیا ہے ۔

مقالہ کے آخر میں کتابیات کے عنوان سے ان کتابوں ،رسائل ، جرائد اور اخبارات کی فہرست دی گئی ہے جن کی مدد سے مقالہ کی تسوید عمل میں آئی ۔

زیرِ نظر مقالہ کمپیوٹر پر کمپوز کیا گیا ہے اس لیے اقتباسات وغیرہ کے حوالے ہر صفحے کے نیچے درج کرنے کے بجائے ہر باب کے آخر میں درج کیے گئے ہیں۔

تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق، تحقیق کی دشمن ہوتی ہے ۔ راقم الحروف نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ موضوع کے ہر باب سے بھرپور انصاف کیا جائے اور موضوع سے متعلق کوئی اہم بات چھوٹنے نہ پائے ۔ پھر بھی اگر کوئی اہم بات یا اہم نکتہ چھوٹ گیا ہو تو معافی کا خواست گار ہوں۔

مقالے کی تیاری کے لیے اساتذہ اکرام کی رہنمائی او رہبری بے حد ضروری ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ دوست احباب اور دیگر کرم فرماؤں کی حوصلہ افزائی اور تعاون بھی گزیر ہوتا ہے ۔ میں ان تمام اصحاب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے استاد محترم و نگران پروفیسر محمد انور الدین صاحب سابقہ صدر شعبہ ء اردو کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ جو میرے شفیق استاد بھی نہیں بلکہ ادب و صحافت کی دنیا کے بہترین نامور محقق اور

نقاد ہیں۔ یہ ان ہی کی مہربانی ہے کہ مجھے اپنی پسند کا موضوع عنایت فرمایا اور ہر وقت اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ مقالہ مکمل ہی نہیں ہو پاتا۔ مقالہ کے آغاز سے اختتام تک ہر مرحلہ پر استاد محترم کا مکمل و بھرپور تعاون حاصل رہا۔ جب کبھی میں اپنی کسی الجھن کو لے کر ڈاکٹر صاحب سے رجوع ہوتا تو انھوں نے اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر مجھے زیادہ سے زیادہ وقت دیا اور مکمل رہنمائی کی اور میری الجھن فوری دور کر دی۔

دورانِ تحقیق پروفیسر صاحب نے مجھے کئی مفید مشورے دیے لیکن کبھی اپنی رائے کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پروفیسر صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ طلباء کے اختلاف رائے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ طلباء میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ایک ہی کیا بے شمار ریسرچ اسکالرز پروفیسر صاحب کے خرمن کتب کے خوشہ چین رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کے علاوہ دیگر خزائن ادب سے بھی بہ نفس نفیس میری مطلوبہ کتابیں فراہم کیں۔ پروفیسر صاحب کے تعلق سے جس بات کا ذکر میں یہاں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے ایک دوستانہ فضاء اور برادرانہ ماحول میں کام کرنے کا موقعہ دیا۔ جس کی وجہ سے مختلف شکوک و شبہات پر پروفیسر صاحب سے کھل کر بحث کر سکا۔ پروفیسر صاحب جو مختلف علوم میں گہری بصیرت رکھتے ہیں میرے تمام شکوک کا شافی و کافی ازالہ کر دیتے تھے۔ ثنا خوانی مقصود نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ شعر و ادب، تحقیق و تنقید کے ہر شعبہ میں پروفیسر محمد انورالدین صاحب کی سی رحان نظر بہت کم کسی کو میسر ہوتی ہے۔

پروفیسر محمد انورالدین صاحب کے علمی وادبی احسانات کے لیے "شکریہ" کا لفظ قطعی ناکافی اور روایتی ہے۔ لیکن اس کے متبادل میرے حقیر ذخیرہ الفاظ میں کوئی اور لفظ بھی نہیں ہے جو میرے دلی جذبات کی عکاسی کر سکے۔

اس کے ساتھ صدر شعبہ اردو پروفیسر رحمت یوسف زئی صاحب کا میں ممنون و متشکر ہوں کہ ان کی ہی حوصلہ افزائی اور مفید مشورے میرے لیے مشعلِ راہ کا کام انجام دیے۔

شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے ہردل عزیز اساتذہ صاحبان ڈاکٹر میر محبوب حسین صاحب

ریڈر اور ڈاکٹر حبیب نثار صاحب اور ڈاکٹر نسیم الدین فریس صاحب کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں ۔ جن کی مہربانیاں اور کرم فرمائیاں ہمیشہ میرے شامل حال رہی ہیں۔

استاذالاساتذہ محترم المقام عالی جناب پروفیسر مغنی تبسم صاحب معتمد ادارہ ، ادبیاتِ اردو اور پروفیسر غلام عمر خاں صاحب اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب،ڈاکٹر مجید بیدار صاحب اور ڈاکٹر قاسم علی خاں صاحب کا میں بے حد ممنون و مشکور ہوں جن کے مفید مشورے مقالہ کی تکمیل میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔

اس مبارک موقع پر میں اپنے والد محترم جناب محمد مظہر الباقی (ریٹائرڈ گزیٹیڈ ہیڈ ماسٹر) کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی شفقت نے مجھے آج اس مقام پر پہنچایا اور ان کی بار بار کی توجہ دہانی تکمیل مقالہ کی ضامن بنی ۔ میرے والد محترم نے میرے لیے کافی تکالیف برداشت کیں اور وظیفہ ، حسن خدمت پر سبک دوش ہونے کے باوجود مجھے زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ اللہ میرے والد محترم کو عمر خضر عطا کرے اور انھیں دونوں جہاں کی خوشیاں نصیب کرے۔ (آمین)

میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ سب میری ماں کی دعاؤں کا طفیل ہے جن کی بے لوث محبت اور رات دن کی ریاضت نے مجھے اس مقام پر پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری والدہ محترمہ کو صحت کامل عطا فرمائے اور ان کا سایہ میرے سر پر تادیر قائم رکھے۔ (آمین)

میرے بڑے بھائی جناب محمد انوار الباقی (ایم۔ ایس۔ سی) جن کی برادرانہ حوصلہ افزائی نے میرے لیے کامیابی کی راہ ہموار کی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے بھائی کو دینی و دنیوی درجات میں ترقی دے اور ان کی ہر مشکل آسان کر دے اور انھیں ہر مصیبت و پریشانی سے دور رکھے۔

اس موقع پر میں اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد انتصار الباقی (سیول انجینئر) اور بہنوں و بہنوائیوں اور میرے تمام افراد خاندان کا بھی شکر گزار ہوں۔ جن کی ہمت افزائی اور بے لوث محبت مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔

اسی کے ساتھ میں اپنے تمام ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میرے مقالہ کے لیے مواد کی فراہمی میں مختلف موقعوں پر میری مدد کی۔ حالاں کہ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے بے پایاں خلوص کا شکریہ ادا

نہیں کیا جاسکتا۔

میرے ہم جماعت کلیم محی الدین جنھوں نے میرے مقالے کے مواد کی فراہمی میں مکمل تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ انھیں اعلیٰ مقام عطا کرے (آمین)۔

آخر میں اپنے ایک عزیز دوست محمد جعفر جری کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے میری خاطر اپنی تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر میرے مقالے کی کمپوزنگ کی اور وہ ہمیشہ میری کامیابی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ان کے اسی جذبے کے لیے شکریہ کا لفظ انتہائی حقیر ہے مگر میں مجبور ہوں کیوں کہ اس موقع پر کوئی اور لفظ میرے حقیر ذخیرہ الفاظ میں موجود نہیں ہے۔ اس موقع پر میرے عزیز دوست کے لیے میری خدا سے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں بھی جلد از جلد ادب کا ڈاکٹر بنادے اور انھیں ان کے شایانِ شان اچھی ملازمت بھی دلادے (آمین)۔

آخر میں بس اتنا کہوں گا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جان نچھاور کرنے والے والدین اور مشفق و مہربان اساتذہ اور ادب نواز دوست، خوش مزاج بھائی بہن اور عزیز رشتے داروں کا تعاون عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی مہربانیوں پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس خوشی کے عالم میں خالق کائنات کے آگے میرا سر جھکا جاتا ہے۔

راقم

محمد ابرار الباقی

ایم۔اے، ایم۔فل

۳۱/ دسمبر ۲۰۰۲ء

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
سوانح اور شخصیت

حیدر آباد فرخندہ بنیاد ایک تہذیبی شہر ہے۔ اپنی تاسیس کے چار سو سال مکمل کر لینے کے بعد اب اس شہر کی گنگا جمنی تہذیب کے اثرات چار سو پھیل گئے ہیں۔ جس طرح حیدر آباد کی پہچان اس کی عظیم تہذیبی روایات سے ہوتی ہے اسی طرح یہاں کی تاریخی نشانیوں چارمینار، قلعہ گولکنڈہ، مکہ مسجد وغیرہ بھی حیدر آباد کی پہچان کا ایک ذریعہ ہیں۔ علمی اعتبار سے ساری دنیا میں حیدر آباد کی پہچان مادرِ علم جامعہ عثمانیہ سے ہوتی ہے۔ گزشتہ ساٹھ ستر سال میں اس عظیم جامعہ سے فارغ التحصیل علم کے پروانے اپنی صلاحیتوں کا لوہا دنیا کے کونے کونے میں منوا رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو سے فارغ ہونے والے طلباء اردو کے نامور محققین، ادیب، شاعر، قابل اساتذہ بن کر ابھرے ہیں۔ ان میں ایک نام پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اردو کے نامور محقق، معتبر نقاد، بلند پایہ خاکہ نگار، مشہور سوانح نگار و انشا پرداز، ماہرِ تعلیم اور ایک مشفق استاد ہیں۔ ان کا شمار جامعہ عثمانیہ کے ان عظیم سپوتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زمانہ طالبِ علمی سے ہی اس مادر جامعہ سے اپنا نام روشن کیا تھا اور اسی جامعہ میں بہ حیثیت استاد اردو اپنی خدمات انجام دیں۔ سینکڑوں طالبِ علموں کی علمی پیاس بجھائی اور مختلف ادبی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی انجمنوں سے وابستہ رہتے ہوئے حیدر آباد کی گنگا جمنی تہذیب کی ایک نمائندہ شخصیت بن گئے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔

ذیل میں ان کے آباد و اجداد کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

• **آباد و اجداد :**

مرزا اکبر علی بیگ فوجی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ دادھیال کے تقریباً تمام افراد خاندان پولیس یا فوج سے منسلک تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کا خاندان نادر شاہ کی فوج میں شامل تھا۔ جو ایرانی نژاد تھے اور ایران سے ہندستان منتقل ہو کر یہیں کی بود و باش اختیار کی۔

• **خاندان :**

مرزا اکبر علی بیگ کے جد اعلیٰ (دادا) فوج میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ان کے چاروں لڑکے فرماں روائے سلطنت آصفیہ میر عثمان علی خاں آصف سابع کے دربار میں محکمہ پولیس سے وابستہ تھے۔ مرزا اکبر علی بیگ کا دادھیال سپاہیانہ صفات کا حامل تھا تو ننھیال علمی و ادبی سرمائے سے مالا مال تھا۔ان کے نانا حکیم میر نادر علی رعد حیدر آباد کے ایک ممتاز صاحبِ دیوان شاعر رہ چکے تھے۔اس کے علاوہ انھوں نے تاریخ میں ایک مبسوط کتاب "گنجینۂ تاریخ" کے عنوان سے قلم بند کی تھی جو علمی و ادبی حلقوں میں مستند مانی گئی۔ مرزا اکبر علی بیگ کے خاندان کے بارے میں سیدہ طیبہ بیگم اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

"انسپکٹر پولیس مرزا غضنفر علی کے صاحب زادے مرزا اکبر علی بیگ کا دادھیال اہلِ سیف اور ننھیال اہلِ قلم موسوی سعادات سے ہے۔ اکبر علی بیگ کے نانا حکیم میر نادر علی رعد اور ان کے بڑے بھائی نوزش لمحہ۔ ماموں ڈاکٹر مہدی علی اور برق موسوی اردو ادب کے طالبِ علموں کے لیے غیر مانوس نہیں ہیں اس ادبی ماحول نے اس ہونہار بروا کے روشن مستقبل کی تعمیر کی۔۔۔" (۱)

• **والدین :**

مرزا اکبر علی بیگ کے والد مرزا غضنفر علی بیگ محکمہ ٔ پولیس میں امین تھے۔ان کی خدمت کے لیے ایک سائیں اور گھوڑا ہمیشہ ان کے گھر پر موجود رہتا تھا۔ ان کی شادی حکیم میر نادر علی رعد کی منجھلی صاحب زادی اصغری بیگم سے ہوئی۔ جن سے دو صاحب زادیاں اور دو صاحب زادے تولد ہوئے۔

- **پیدائش :**

مرزا غضنفر علی بیگ شادی کے بعد جدید ملے پلی حیدرآباد کے ایک مکان میں رہنے لگے تھے۔ اسی مکان میں ۹ / اپریل ۱۹۴۰ء (۲) کو مرزا اکبر علی بیگ پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش پر کافی خوشیاں منائی گئیں۔

- **نام :**

سپاہیانہ خاندان سے تعلق رکھنے والے دادھیال اور علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھنے والے ننھیال کے ملے جلے رنگ کے ساتھ مرزا غضنفر علی بیگ کے گھر میں پیدا ہونے والے اس چشم و چراغ کا نام مرزا اکبر علی بیگ رکھا گیا اور وہ اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے ایک مضمون میں انکشاف کیا کہ ان کی عرفیت (مغل) تھی اور پروفیسر مغنی تبسم انھیں اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔

- **بھائی بہن :**

مرزا اکبر علی بیگ سے بڑی دو بہنیں سکینہ بیگم اور زہرا بیگم ہیں اور ان سے ڈیڑھ سال چھوٹے بھائی مرزا قمر علی بیگ تھے جن کا کم سنی میں انتقال ہوگیا تھا۔ مرزا اکبر علی بیگ کے چار سوتیلے بھائی بہن بھی ہیں بڑی بہن شاہدہ حسن اور تین بھائی مہدی حسن، ڈاکٹر مسیح الحسن اور جمیل الحسن ہیں۔

- **بچپن :**

مرزا اکبر علی بیگ ابھی دو سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے سر سے ان کے والد مرزا غضنفر بیگ کا سایہ اٹھ گیا۔ اس وقت ان کی والدہ کی عمر بہ مشکل انیس سال تھی۔ ایسے نازک حالات میں مرزا اکبر علی بیگ اور ان کی دو بڑی بہنوں سکینہ بیگم اور زہرہ بیگم کی پرورش ان کی چھوٹی پھوپھی فاطمہ خانم نے بڑی شفقت سے کی اور والد کی کمی کو محسوس ہونے نہیں دیا۔ ادھر خاندان کے بڑے بوڑھوں کی رائے سے مرزا اکبر علی بیگ کی والدہ کا عقد ثانی جناب غلام حسن ہیڈ ماسٹر مدرسہ فوقانیہ گولکنڈہ حیدرآباد کے ساتھ کر دیا تھا۔ ان سے انھیں ایک لڑکی اور تین لڑکے تولد ہوئے۔ مرزا اکبر علی بیگ کے سگے اور سوتیلے تمام بھائیوں اور بہنوں نے زندگی کے عملی میدان میں کافی ترقی کی۔ ان میں کئی بیرون ملک مقیم ہیں۔

- **ابتدائی تعلیم و تربیت :**

گھر میں ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی روایتی تعلم کا پہلا قدم ملے پلی کے گورنمنٹ پرائمری اسکول واقع سیتارام باغ میں رکھا۔ وہ زمانہ تھا جب سرکاری مدارس میں قابل اساتذہ درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے اور ہونہار طلباء کو داخلہ دیا جاتا تھا امراء و نوابوں کے بچے بھی ان مدارس کے ذریعہ ہی اپنے علمی مدارج طے کرتے تھے۔ مرزا اکبر علی بیگ کے اسکول میں اس وقت میر کاظم حسین، عبدالقادر صاحب اور ماسٹر عبدالسلام صاحب (ہیڈ ماسٹر) وغیرہ جیسے قابل اساتذہ تھے اس اسکول سے چوتھی جماعت کامیاب کرنے کے بعد مرزا اکبر علی بیگ نے پانچویں جماعت میں داخلہ مڈل اسکول آصف نگر میں لیا یہ اسکول اب ہائی اسکول بنا دیا گیا ہے یہاں کے ہیڈ ماسٹر انگلستان کے فارغ التحصیل جناب سلطان محی الدین صاحب تھے۔ اساتذہ میں محمد علی خاں اور شیخ محبوب صاحب وغیرہ قابل ہیں۔

مرزا اکبر علی بیگ نے اس اسکول سے ساتویں جماعت کامیاب کرنے کے بعد گورنمنٹ سٹی کالج کے ہائی اسکول سکشن میں داخلہ لیا۔ سٹی کالج اس زمانے میں تعلیم و کھیل کود کے معیار کے اعتبار سے ریاست کے دیگر تعلیمی اداروں سے آگے تھا۔ مرزا اکبر علی بیگ پڑھائی کے ساتھ کھیل کود میں بھی دل چسپی لیتے رہے وہ ہاکی میں دل چسپی رکھتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں ان کے کلاس ٹیچر غلام عمر خاں صاحب تھے جو آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی کے مایہ ناز اور نامور پروفیسر (ماہرِ اقبالیات اور ماہرِ دکنیات) اور صدر شعبہ اردو بھی رہے۔ ہائی اسکول کے دیگر اساتذہ میں سید علی محمد، مولوی اکبر الدین صدیقی، ضیاء الحسن جعفری، نذیر الدین احمد، سید احمد حسین نقوی (والد ڈاکٹر صادق نقوی) وغیرہ شامل ہیں۔ مرزا اکبر علی بیگ ریاضی میں کم زور تھے۔ اس لیے انھوں نے اختیاری مضمون ریاضی کے بجائے تاریخ انگلستان لیا۔ جسے آستھانہ صاحب پڑھاتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں مرزا اکبر علی بیگ نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔

- **پہلی ملازمت :**

مرزا اکبر علی بیگ والد کے سایہ سے محروم تھے اور پھوپھی کے زیرِ پرورش تھے۔ ان پر دباؤ تھا

کہ وہ کچھ فکر معاش بھی کریں۔ گھریلو حالات اتنے سازگار نہ تھے کہ آگے تعلیم جاری رکھ سکیں۔ حالاں کہ ان کا داخلہ پی یو سی (کامرس) میں نظام کالج میں ہوگیا تھا۔ لیکن اسے ترک کرتے ہوئے عثمانیہ میڈیکل کالج کے ایک سالہ سانیٹری انسپکٹر کورس میں داخلہ لیا۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں یہ کورس بہ ذریعہ انگریزی کامیاب کیا اور خوش قسمتی سے انھیں فوری ملازمت بھی مل گئی۔ چناں چہ ۷ / ستمبر ۱۹۵۹ء کو بہ حیثیت ہیلتھ انسپکٹر ضلع کھمم اپنی پہلی ملازمت کا آغاز کیا۔ ان دنوں کھمم ہیضہ کی وباؤ سے متاثرہ ضلع تھا۔ آئے دن وہاں دریائے گوداوری میں طغیانی و سیلاب کی وجہ سے ہیضہ پھوٹ پڑتا تھا۔ مرزا اکبر علی بیگ بور گم پہاڑ، پالونچا، کتہ گوڑم اور بھدرا چلم میں کارگزار رہے۔ ان دنوں وہاں ڈاکٹر سید حسین الحسن ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر، ڈاکٹر محمد غوث ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر، جناب سید ہاشم علی اختر کلکٹر اور عسکری باقری ڈپٹی کلکٹر کتہ گوڑم تھے۔ تقریباً ڈھائی سال ان علاقوں میں کام کرنے کے بعد مرزا اکبر علی بیگ کا تبادلہ پرائمری ہیلت سنٹر نارسنگی حیدرآباد ہوا۔ یہاں تقریباً پانچ سال کام کرنے کے باوجود کوئی ترقی نہیں ملی۔ مرزا اکبر علی بیگ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوئے اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے اور بالآخر تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ کرلیا۔

- **اعلیٰ تعلیم :**

۱۹۶۳ء میں ڈپلوما ان اورینٹل لینگویجس (ڈپ۔او۔ایل) کامیاب کیا۔ اس وقت پروفیسر سید محمد مرحوم کالج کے پرنسپل تھے۔ ممتاز اساتذہ میں پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر حسینی شاہد، بدیع حسینی، نصیرالدین ہاشمی اور مقبول احمد صدیقی شامل ہیں۔ مرزا اکبر علی بیگ کا تبالہ نارسنگی سے میڑچل اور پھر ایک سال بعد اسکول ہیلتھ سرویس حیدرآباد ہوا۔ نئے پل کے قریب اسکول ہیلتھ کلینک تھا یہاں اکثر شعرا اور ادبی شخصیتیں آتی جاتی رہتی تھیں۔ مرزا اکبر علی بیگ کا ان سے میل ملاپ بڑھا اور ان کا علمی و ادبی ذوق بھی پروان چڑھے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اردو کالج سے بی او۔ ایل امتیازی نشانات سے کامیاب کیا۔

- **زمانۂ طالبِ علمی کے واقعات :**

اردو کالج کے ادبی میگزین کے مدیرِ اعلیٰ مغنی تبسم تھے۔ اس میگزین کے لیے

مرزا اکبر علی بیگ نے ڈاکٹر جان کینڈی پریسڈنٹ آف امریکہ کی ناگہانی موت پر ایک تاثراتی مضمون لکھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ بی او ایل کے سال آخر میں دوسرا شمارہ "اکبر الہ آبادی نمبر" شائع ہوا۔ اس میں مرزا اکبر علی بیگ کا مضمون "اکبر الہ آبادی اور صنف لطیف" شائع ہوا جس کو سبھی علمی و ادبی حلقوں نے پسند کیا۔

بی او۔ ایل کی بنیاد پر ایم۔ اے میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ چناں چہ مرزا اکبر علی بیگ نے انگریزی کے ساتھ ایک اور مضمون جنرل ایجوکیشن کا پرچہ بھی کامیاب کرتے ہوئے بی۔ اے ایک سالہ کورس کی تکمیل (۱۹۶۶ء) کی۔ بی۔ او۔ ایل امتیازی نشانات سے کامیاب کرنے پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی نے انعام سے نوازا۔ مرزا اکبر علی بیگ کی محکمہ صحت میں ملازمت کا سلسلہ جاری تھا اور وہ ایم۔ اے میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ جہاں تعلیم دن میں ہوتی تھی وہ تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ناظم صحت ڈاکٹر غلام احمد صاحب سے رجوع ہو کر درخواست پیش کی کہ میں ایم۔ اے کرنا چاہتا ہوں۔ میرے حالات ایسے نہیں کہ میں نوکری چھوڑ کر تعلیم جاری رکھ سکوں۔ اگر رات کی نوکری مل جائے تو تعلیم جاری رکھ سکتا ہوں۔ مرزا اکبر علی بیگ کی علمی تڑپ دیکھ کر انھوں نے درخواست منظور کر دی اور ان کا تبادلہ فیور ہاسپٹل کر دیا گیا۔ جہاں وہ رات کو نوکری کرنے لگے اور دن میں تعلیم جاری رکھنے کا سرکاری اجازت نامہ بھی انھیں حاصل ہو گیا۔

ایم۔ اے میں داخلہ کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک ان کی تعلیم برابر جاری رہی۔ ایم۔ اے فائنل کے عین امتحانات سے قبل ان کا تبادلہ اسکول ہیلتھ سرویس اور پھر وہاں سے نظام آباد ہو گیا۔ مجبوراً رخصت لے کر انھوں نے ایم۔ اے تکمیل کیا۔

- **شادی :**

مرزا اکبر علی بیگ جب ایم۔ اے سال آخر کے طالب علم تھے۔ تب ان کی پھوپھی فاطمہ خانم نے ان کی شادی ان کی پھوپھی زاد بہن (زینب خانم کی بڑی بیٹی) کنیز سکینہ سے کر دی۔ مرزا اکبر علی بیگ کی شادی ۱۱/ ستمبر ۱۹۶۷ء کو ہوئی (دعوت نامہ کا زیراکس اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)۔ شادی کی تقریب میں شعبۂ اردو کے اساتذہ پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر زینت ساجدہ اور دوسرے شریک ہوئے۔ اس خوش گوار موقع پر جناب اسحاق حیدر

عزیزم مرزا اکبر علی بیگ سلمہٗ فرزند جناب مرزا غضنفر علی بیگ صاحب مرحوم کی

محفلِ عقد میں شرکت کی آرزومند

بتاریخ ۱۱ر ستمبر ۱۹۶۷ء م ۶ر جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ
روز دوشنبہ
عقد: ۵½ ساعت شام
جلوہ: ۸ ساعت شب

اہلیہ مرزا عباس علی صاحب مرحوم

پتہ: بمکان جناب میر محمد علی صاحب مرحوم
نمبر ۳۲۹-۱-۱۲ متصل
بائز پرائمری اسکول تلگو میڈیم روبرو
باغ طلعت جنگ آصف نگر حیدرآباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب شادی خانہ آبادی محبی جناب اکبر علی بیگ [illegible]

منعقدہ بروز پیر ۱۱ ستمبر ۱۹۶۷ء

سہرا

کتنے انداز سے ہے تم نے سجایا سہرا ٭ حسن ہی حسن ہے اللہ یہ پیارا سہرا
گل کی رنگت گل کی خوشبو نزاکت بھی ہے ٭ چاند کی چاندنی صبح کا اجالا سہرا
ساری دنیا کی بہاریں ہیں اس میں پوشیدہ ٭ گلاب چنبیلی نے کچھ اور نکھارا سہرا
خلوص و پیار کے دھاگے سے پروئے ہیں پھول ٭ حسن اور عشق کی خوشبو سے مہکایا سہرا
حسن کہتے ہیں کسے اور مسرت کیا ہے ٭ آج نوشہ نے مجھے اپنا بتایا سہرا
خود ہے نوشہ حسین اور پھر یہ گل پوشی ٭ حسن کو چار چاند آج لگایا سہرا
ہم نے دیکھے ہیں زمانہ میں ان گنت سہرے ٭ لاکھ سہروں میں بھی ہے یار تمھارا سہرا
دن خوشی کے مسرت کی یہ راتیں بھی ہیں ٭ یا خدا تیری ہی مرضی نے بنایا سہرا

دیکھ اکبر تیرا مشکور ہوا ہے حیدر
حسن میں بے مثال تو نے دکھایا سہرا

منجانب
اسحاق حیدر
[illegible]

صاحب نے دولہا دلہن کو مبارک پیش کرتے ہوئے سہرا بھی پڑھا تھا اس کا عکس بھی شامل مقالہ ہے۔

مرزا اکبر علی بیگ کی اہلیہ کنیز سکینہ نہ صرف ان کے لیے ایک محبت کرنے والی شریکِ حیات ثابت ہوئیں بلکہ بچوں کی بہتر پرورش کرنے والی ماں بھی ثابت ہوئیں۔ شادی کے وقت وہ پی۔ یو۔ سی اور ایس۔ جی۔ پی۔ ٹی ٹریننگ کامیاب تھیں اور گورنمنٹ ہائی اسکول آصف نگر میں بہ حیثیت ٹیچر کارگزار رہ چکی ہیں۔

- **اولاد :**

ایم۔ اے سال آخر کا نتیجہ آنے تک مرزا اکبر علی بیگ ایک لڑکی کے باپ بن چکے تھے۔ ۱۵/ جون ۱۹۶۸ء کو وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل میں ان کی بڑی لڑکی فردوس فاطمہ تولد ہوئیں۔ دو سال بعد یکم اگست ۱۹۷۰ء کو ان کے یاں ایک لڑکا تولد ہوا۔ جس کا نام دادا کے نام پر غضنفر علی بیگ رکھا گیا۔ تین سال بعد ۲۰/ اپریل ۱۹۷۳ء کو دوسرا لڑکا تولد ہوا۔ جس کا نام مرزا مرتضیٰ علی بیگ رکھا گیا۔ اس طرح مرزا اکبر علی بیگ کی اولاد میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ ان کی پرورش مرزا اکبر علی بیگ نے بڑے لاڈ و پیار سے کی اور ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے انھیں اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ چناں چہ ان کی لڑکی فردوس فاطمہ ڈاکٹر (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، ایم۔ ڈی) اور دونوں لڑکے مرزا غضنفر علی بیگ، مرزا مرتضیٰ علی بیگ انجینئر (B.E.M.S) ہیں لڑکے آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔

- **دوسری ملازمت :**

مرزا اکبر علی بیگ ۱۹۶۸ء میں ایم۔ اے امتیازی نشانات سے کامیاب ہوگئے اور اپنی سابقہ ملازمت پر نظام آباد جا کر رجوع ہوگئے۔ اسی اثنا میں شعبہ اردو گورنمنٹ سٹی کالج سے ٹیوٹر اِن اردو کی جائیداد کے لیے اعلامیہ جاری ہوا۔ مرزا اکبر علی بیگ نے بھی اس جائیداد کے لیے درخواست دی اور چالیس امیدواروں میں ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ چناں چہ استاد اردو کی حیثیت سے گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد سے مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی ملازمت کے دوسرے دور کا آغاز کیا اور حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ شادی اور دوسری آسودہ حال ملازمت مل جانے کے بعد ان کے استاد مغنی تبسم

صاحب نے انھیں مشورہ دیا کہ اب آپ نے غم جاناں اور غم روزگار دونوں سے فراغت پالی ہے اس لیے اب وہ تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹریٹ کریں۔

● **ڈاکٹریٹ :**

اساتذہ کے مشوروں اور ذاتی دل چسپی کی بنا پر مرزا اکبر علی بیگ نے عثمانیہ یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ سینئر ریڈر نظام کالج، عثمانیہ یونیورسٹی نے درخواست فارم پر دست خط کیے اور ان کے لیے پی ایچ۔ ڈی کا موضوع "مرزا علی لطف، حیات اور کارنامے" تجویز کیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ جب صدر شعبہ ہو گئیں تو طلباء کو دوسرے نگرانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ چناں چہ مرزا اکبر علی بیگ کچھ عرصہ پروفیسر سیدہ جعفر اور بعد میں پروفیسر مغنی تبسم کے زیرِ نگرانی میں آ گئے اور بالآخر انہی کے زیرِ نگرانی انھوں نے اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل کی اور انھیں پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے تحت ریسرچ کرنے والے پہلے امیدوار کا اعزاز حاصل ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے رویے کے بارے میں مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "میرے تحقیقی مقالے کے مسودوں کو مغنی صاحب بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ بعض ابواب کو از سر نو لکھنے کی تاکید کرتے۔ بعض حصوں کو دیکھنے کے بعد مزید نظر ثانی کرنے کی ہدایت دیتے۔ اسی دوران مقالے کے ٹائپ کیے ہوئے کاغذات لے کر میں ان کی خدمت میں پہنچا تب وہ ان ٹائپ شدہ کاغذات کو دیکھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اس صفحے میں سے صرف اس پیراگراف کو رکھو باقی سب نکال دو۔ بعض صفحات میں سے تو چند سطور ہی باقی رکھے گئے۔ باقی عبارت کاٹ دی۔ سنسر (CENSOR) کی قینچی میں سنتا آیا تھا۔ مگر مغنی صاحب کی قینچی سے جب میرا سامنا ہوا تب میرے پسینے چھوٹ گئے"۔ (۳)

مرزا اکبر علی بیگ نے ۱۹۸۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس موقع پر انھیں ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد اور پروفیسر مغنی تبسم نے مبارک باد دی اور مغنی تبسم کے مشورے پر تفریح کے لیے بنگلور بھی گئے۔ سٹی کالج کی ملازمت کے دوران وہ جامعہ، عثمانیہ میں بہ حیثیت لکچرر خدمات پیش کرنے

کے لیے کوشاں رہنے لگے۔

- **مرزا اکبر علی بیگ اور عثمانیہ یونیورسٹی :**

عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلینے کے پانچ سال بعد ۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کو مرزا اکبر علی بیگ کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت لکچرر اردو ہوا۔ ان دنوں وہ سٹی کالج میں بہ حیثیت لکچرر اردو اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور ڈاکٹر محمد علی اثر کا بھی انتخاب عمل میں آیا۔ کچھ عرصہ ہوا تھا کہ ریڈرشپ کے لیے انٹرویوز ہوئے اور بہ حیثیت ریڈر مرزا اکبر علی بیگ کا انتخاب ہوا۔ ان کے ساتھ ریڈرشپ کے لیے ڈاکٹر اشرف رفیع، غیاث متین اور ڈاکٹر حبیب ضیاء کا بھی انتخاب عمل میں آیا۔ انھوں نے ۱۲/ مارچ ۱۹۸۴ء کو بہ حیثیت ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنے نئے عہدے کا جائزہ حاصل کیا۔ بارہ سال تک وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت ریڈر کے اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور پھر ان کا تبادلہ پوسٹ گریجویٹ کالج بشیر پر ہوا دو سال تک یہاں خدمات انجام دیتے رہے۔ یکم جنوری ۱۹۹۲ء کو بہ حیثیت پروفیسر اردو منتخب ہوئے۔ ۲۴/ جولائی ۱۹۹۴ء کو ان کی گراں قدر تعلیمی و ادبی تنظیمی خدمات کو سراہتے ہوئے وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی انھیں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کا صدر منتخب کیا۔ مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ان کو صرف چھ ماہ کے بعد کرسی صدارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ۲۹/ جنوری ۱۹۹۵ء تک صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کارگزار رہے اور پھر پی۔ جی کالج سکندرآباد حیدرآباد میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔

- **تصانیف اور تالیف :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو ابتدا ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چناں چہ ان کی اب تک نو کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱ مرزا علی لطف حیات اور کارنامے (۱۹۷۹ء)

۲ خوش نفساں (خاکوں کا مجموعہ) (۱۹۸۳ء)

۳ "دیوانِ لطف" (تدوین، ۱۹۸۳ء)

۴ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" (سوانح ۰ ۱۹۸۸ء)

۵ "نظیر شناسی" بہ اشتراک ڈاکٹر محمد علی اثر (مضامین کا مجموعہ) ۰ (۱۹۸۸ء)

۶ "دیوانِ حفیظ دہلوی" (تدوین ۰ ۱۹۹۴ء)

۷ یدِ بیضا (تدوین ۱۹۹۵ء)

۸ تلگو ریڈر (مشقی بیاض) (۱۹۹۹ء)

۹ تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی (تعارفی) کتاب (۱۹۹۹ء)

● **زیرِ طبع تصانیف** :

۱ نگارشاتِ عزیز	(عزیز مرزا کے انشائیے اور مضامین)
۲ مکاتیبِ عزیز	(عزیز مرزا کے خطوط)
۳ تذکرہ گلشنِ ہند	(مرتبہ)
۴ نفوسِ گرامی	(خاکے)
۵ محور	(ادبی تبصرے)
۶ نقطۂ نگاہ	(تنقیدی مضامین)
۷ محمد عزیز مرزا حیات اور کارنامے	(انگریزی)

● **انعامات و اعزازات** :

۱ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" پر تین ریاستوں آندھرا پردیش، اترپردیش اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انھیں انعامات سے نوازا۔

۲ "دیوانِ لطف" (تدوین) پر تین ریاستوں آندھرا پردیش، اترپردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے انھیں انعامات دیے۔

۳ "خوش نفساں" پر بہار اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا۔

۴ محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے پر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے انعام دیا۔

۵ "یدِ بیضا" کو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے ایوارڈ دیا۔

۶ "بیسٹ ٹیچر ایوارڈ" لائینس کلب حیدرآباد نے ۱۹۸۰ء میں عطا کیا۔

۷ پارٹ ٹائم ریسرچ فیلوشپ دو سال کے لیے حکومت آندھرا پردیش نے عطا کی۔

۸ مجموعی خدمات پر انعام برائے "تعلیم ایوارڈ" (منجانب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش)

● **اعزازات و رکنیت :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ریاست کی علمی و ادبی، تعلیمی و تہذیبی انجمنوں و اداروں سے اعزازی طور پر وابستہ ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیلات درج کی جا رہی ہیں۔

۱ رکن عاملہ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی

۲ رکن نصابی کمیٹی آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی

۳ رکن برائے بورڈ آف اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی، (پوسٹ گرایجویٹ اور انڈر گریجویٹ)

۴ رکن برائے ڈپارٹمنٹ کمیٹی۔ شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

۵ جوائنٹ سکریٹری عثمانیہ یونیورسٹی ریسرچ ایسوسی ایشن

۶ انچارج سکریٹری شعبۂ امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو (پروفیسر مغنی تبسم کے غیاب میں چار بار)

۷ اعزازی معتمد، شعبۂ امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

۸ رکن عاملہ ادارۂ ادبیاتِ اردو مجلسِ انتظامی

۹ رکن عاملہ ابوالکلام آزاد ریسرچ سنٹر حیدرآباد

۱۰ رکن عاملہ حیدرآباد ریسرچ ایسوسی ایشن حیدرآباد

۱۱ رکن ایلڈر کونسل آف انڈیا حیدرآباد

۱۲ رکن حیدرآباد لٹریری فورم

۱۳ رکن عاملہ باب العلم سوسائٹی حیدرآباد

۱۴ رکن عاملہ حکیم شمس اللہ قادری ریسرچ ایسوسی ایشن حیدرآباد

- **دیگر انجمنوں سے وابستگی :**

۱ مشیر اردو یونین پی۔ جی کالج سکندرآباد

۲ مشیر فصاحت جنگ جلیل لٹریری سوسائٹی۔

۳ کلب سکریٹری گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد۔

۴ صدر تلنگانہ گورنمنٹ کالج ٹیچرس ایسوسی ایشن۔

۵ کنوینر گیمس کمیٹی گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد۔

۶ رکن عاملہ این۔ ایس۔ ایس۔

۷ انچارج فزیکل ڈائرکٹر گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد (دو مرتبہ)۔

- **بیرونی سفر :**

پروفیسر مرزا علی بیگ نے ۱۹۹۳ء میں ایران کا دورہ کیا تھا۔ ایک ماہ تک ملک ایران کے تاریخی شہروں، تہران خم اور مشہد وغیرہ میں مقیم رہے۔ ۱۹۹۹ء میں اپنی اہلیہ کنیز سکینہ کے ہم راہ حج کی سعادت حاصل کی اور واپسی میں بارہ اماموں کی زیارت بھی کی۔

- **وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوشی :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ۷/ستمبر ۱۹۵۹ء میں بہ حیثیت ہیلتھ انسپکٹر اپنی پہلی ملازمت شروع کرتے ہوئے زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھا تھا۔ ۲۸/اگست ۱۹۶۹ء میں سٹی کالج میں استاد اردو کی حیثیت سے اپنی دوسری ملازمت کا آغاز کیا اور ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے بعد ۱۹۸۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں بہ حیثیت لکچرر تقرری کے بعد ریڈر اور پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز رہے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کے تقریباً اٹھارہ سال مکمل کرنے کے بعد ۳۰/اپریل ۲۰۰۰ء کو وظیفہ حسن پر سبک دوش ہوئے۔

- **مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت استاد :**

مرزا اکبر علی بیگ ایک ہر دل عزیز استاد اور ماہر نگران تھے سٹی کالج اور جامعہ ، عثمانیہ کے تمام طالبِ علم ان سے بے حد خلوص و محبت رکھتے تھے وہ ڈسپلن کے پابند تھے۔ طلباء سے دوستانہ ماحول میں بات چیت کرتے ۔ ریسرچ اسکالرز کو اپنے نظریات کھل کر پیش کرنے کی پوری اجازت دیتے خود کے نظریات اور خیالات کو ان پر زبردستی مسلط نہیں کرتے ۔ طلباء کی غلطیوں کی بڑی شفقت کے ساتھ نشان دہی کرتے جس سے طلباء خوشی سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلیتے ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تعلق سے ان کے شاگرد ڈاکٹر عارف مجاہد اپنی کتاب " ڈاکٹر حفیظ قتیل حیات و خدمات " کے دیباچہ میں یوں رقم طراز ہیں:

" مجھے ناز ہے کہ ادب کی دنیا میں پہلا قدیم ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ صاحب ریڈر شعبہ ، اردو جامعہ ، عثمانیہ کی شفقت و محبت کے سائے میں رکھ رہا ہوں ۔ یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت کم ریسرچ اسکالرز کو اپنے استاد ، اپنے شفیق نگران کی اتنی محبت ملی ہوگی جتنی کہ مجھے ڈاکٹر بیگ صاحب سے ملتی رہی ہے ۔" (۴)

ڈاکٹر عارف مجاہد اپنی کتاب " ڈاکٹر حفیظ قتیل حیات و خدمات " کا انتساب بھی اپنے استاد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے نام کیا ہے ۔

" انتساب

استادِ محترم

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب

صدر شعبہ ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی

کے نام

جن کی باوقار شخصیت کا عکس

راقم کی تحریر زندگی پر سایہ فگن ہے ۔" (۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک ہر دل عزیز استاد رہے ۔ ہر شاگرد کے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت

تھی۔ طلباء ان کا احترام کرتے تھے اور وہ بھی اپنے شاگردوں سے بہت ہی خلوص سے ملتے تھے۔ ان کی شفقت و مہربانی کے بارے میں ان کے ایک شاگرد احمد حسین سعید نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقدمہ میں لکھا کہ:

"مجھے (احمد حسین سعید کو) شفیق و مہربان اور طالبِ علم کو کام پر اکسانے اور ترتیب دینے والی شخصیت مل گئی۔ وہ علمی شخصیت جس کی عملی مصروفیت نے مجھ میں کام کرنے کی امنگ پیدا کی۔ وہ شخصیت عالی جناب مرزا اکبر علی بیگ صاحب پروفیسر شعبہ ، اردو جامعہ ، عثمانیہ حیدرآباد کی ہے۔" (۹)

احمد حسین سعید کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ طلباء میں کس حد تک مقبول تھے۔

- **موجودہ مصروفیات :**

اپریل ۲۰۰۰ء میں جامعہ ، عثمانیہ سے وظیفہ پر سبک دوش کے باوجود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اردو کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ ایک طرف تحقیق و تصنیف کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی کئی کتابیں عن قریب شائع ہونے والی ہیں اور اسی کے ساتھ وہ معتمد شعبہ ، امتحانات ادارہ ، ادبیاتِ کے شعبہ ، امتحانات کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور سال میں دو امتحانات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لیے وہ رات دن دیگر عملے کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔

- **مذہبی عقائد مسلک :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اثنائے عشری شیعہ مسلک کے عقیدہ کے حامل ہیں۔ لیکن وہ دیگر مسالک اور مذاہب کا خاص احترام کرتے ہیں۔ اپنے ایک شخصی انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ وہ نماز جمعہ کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں رمضان کے روزے پابندی سے رکھتے ہیں اور یہ کہ گزشتہ پچاس سال سے انھوں نے رمضان کا کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔ محرم کی مجالس میں عقیدت سے شرکت کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی مجلس نہیں پڑھیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"میں محرم کی مجالس سنتا ہوں پڑھتا نہیں۔ ابنِ حسن نونہروی کی مجالس میں پابندی سے

شرکت کرتا ہوں۔ جو پروفیسر شہید الحسن نونہروی کے والد تھے میرے گھر پر مولود کعبہ کا جشن بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ رجب کے کنڈے یعنی ماہ رجب میں کھیر پوریوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے"۔ (۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تحقیق اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں بھی مذہبی عقائد کی پاسداری کی۔ اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے واقعہ کربلا سے متعلق کئی مضامین لکھے جن میں اہلِ بیت اطہار سے ان کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے " مرزا علی لطف " پر جو تحقیقی کام کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف بھی اثنائے عشری عقیدے سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف کے مصنفین حفیظ دہلوی، برق موسوی اور خاکوں میں شامل بیش تر شخصیتیں ان کی ہم مسلک تھیں۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے یا حسنِ انتخاب کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جن شخصیتوں پر کام کیا وہ ان کے ہم ملک و ہم عقیدہ تھیں۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی شخصیت کے بارے میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ وہ دیگر عقائد کا بھی اتنا ہی احترام کرتے تھے۔ اس طرح مذہبی رواداری کے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا بھی تعارف ہو جاتا ہے۔ منجملہ ان تمام امور کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک متاثر کن شخصیت کے حامل انسان ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی شخصیت

- **حلیہ اور وضع قطع :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بلند قامت، لحیم شحیم گورے رنگ کے زندہ دل انسان ہیں۔ دادھیال کا فوجی انداز اور ننھیال کی علمی شان ان کی شخصیت میں یکساں طور پر سما گئی ہیں۔ گرج دار آواز کے مالک مرزا اکبر علی بیگ اگر غلطی سے خاکی کپڑے پہن لیں تو لوگ یقین کر لیں گے کہ کہیں یہ شخص پولیس کا افسر تو نہیں ہے۔ چوڑی پیشانی، چہرہ داڑھی اور مونچھوں سے صاف اکثر سفاری یا پینٹ شرٹ یا کوٹ یا شیروانی میں چال ایسی

جیسے کوئی شیر کچھار سے جھومتا ہوا آرہا ہو۔ بھاری بھر کم وضع کے باوجود جب گفتگو کرتے تو بردباری، حلم ہم دردی اور چاشنی کا اظہار ہوتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں شاگردوں اور دوست احباب میں اپنی گفتگو سے بے انتہا مقبول ہیں۔ جو بھی کام کرتے ہیں لگن و جستجو، انہماک سے کرتے ہیں اور کوئی کام اپنے ذمہ لے لیں تو اس کے پائے تکمیل تک پہنچنے تک بے چینی و اضطراب کا عالم رہتا ہے۔ ان کے کام کی اسی لگن و جستجو سے متعلق پروفیسر غلام عمر خاں صاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو اسے انہماک، جان فشانی اور سلیقے کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔" (۸)

کام کی جستجو کے علاوہ ایمان داری، جھوٹ سے نفرت، سچائی پر فریفتہ ہونا، دغا بازی، دھوکہ دہی سے کوسوں دور رہنا، صاف گوئی، حقائق پسندی، بذلہ سنجی، شوخی وغیرہ چند ایسی صفات ہیں جو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ میں بہ درجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ دوستوں کی محفلوں میں کھل کر اور صاف گوئی سے بات کرتے ہیں حیدرآباد کے نامور شاعر صلاح الدین نیر نے اپنی کتاب "روشنی، خوش بو، مہک" میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے دوستوں کے ساتھ محفلوں میں برتاؤ کے بارے میں لکھا ہے:

"اکبر علی بیگ اپنے دوستوں سے کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ چاہے گفتگو کا موضوع علمی و ادبی ہو کہ معاشرہ کے کسی خاص پہلو سے تعلق رکھتا ہو دوٹوک انداز میں بلا کسی ذہنی تحفظات کے اظہارِ خیال کرنا ان کا طرزِ عمل ہے ان کی گفتگو دل چسپ ہوتی ہے۔ دورانِ گفتگو لطائف سنا کر بھی محفل کو مزید خوش گوار بناتے ہیں یہ بہ ظاہر سخت گیر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ایسے ہیں نہیں۔۔۔ان کے لب و لہجہ میں بے ساختگی رہتی ہے۔" (۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہنس مکھ و زندہ دل شخص ہیں شوقیہ طور پر کبھی کبھی سگریٹ پی لیتے ہیں پان کے عادی ہیں۔ اچھے کھانوں کا انھیں شوق ہے اس لیے دعوتوں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں اور کبھی

کبھی وہ بھی دعوت کا اہتمام کرتے ہیں۔ اچھے کھانوں کے شوقین ہیں اور خوش خوراک بھی ہیں۔ گوشت ان کی مرغوب غذا ہے، ترکاریوں میں پالک کی بھاجی کی شیدائی ہیں۔ لیکن کھانے میں پسند ناپسند کا امتیاز نہیں کرتے جو ملا وہ بہ خوشی کھالیتے ہیں۔ صبح جلد اٹھنے کے عادی ہیں اور بیڈ ٹی کے عادی ہیں۔ اخبار کے مطالعہ کے بعد نہا دھو کر ناشتہ سے فارغ ہوتے ہیں، وقت کے بڑے پابند ہیں اگر کسی کو وقت دیے ہوں تو اس وقت پر ضرور موجود رہتے ہیں۔ انجمنوں اداروں کی میٹنگوں اور کانفرنسوں میں وقت مقررہ پر پابندی سے پہنچ جاتے ہیں۔ وقت کی ناقدری اور تضیع اوقات کرنے والوں سے چڑتے ہیں روزانہ شام کو چہل قدمی کے عادی ہیں۔

- **ازدواجی زندگی :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اپنے گھر کے سارے افراد سے دوستانہ ماحول میں رہتے ہیں اہلیہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک ادا کرتے ہیں اتنے برسوں کی ازدواجی زندگی کے باوجود آپسی تعلقات بڑے خوش گوار ہیں۔ اس کی اہم وجہ ان دونوں کے ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ایک دوسرے کہ غم و پریشانیوں، دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ چوں کہ دونوں بھی پڑھے لکھے ہیں ایک دوسرے کی نفسیات سے بہ خوبی واقف ہیں۔ کون سی چیزیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کی ناخوشی و ناراضگی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ اس سے دور رہتے اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کی رضا و خوش نودی کا سبب ہیں اس کو اپنانے کی کوشش کرتے مرزا اکبر علی بیگ کی اہلیہ (کنیز سکینہ) نے اپنے ایک شخصی انٹرویو میں کہا:

> "ڈاکٹر صاحب مجھے شادی کے بعد اعلیٰ تعلیم کی ترغیب دیتے رہے ان کی ترغیب و تحریک کی وجہ سے میں نے شادی کے بعد گریجویشن اور بی۔ ایڈ کیا جوان ہی کی مرہون منت ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ یہ مشکل موڑ پر مجھ سے ضرور مشورہ لیتے ہیں اور گھر کے اہم کام ہم دونوں کے مشوروں ہی سے انجام پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا آپس میں بگاڑ نہیں ہے۔۔۔" (۱۰)

ڈاکٹر صاحب کی بردبار و حلیم الطبع فطرت نے ان کے سارے گھر والوں کے دل موہ لیا ہے۔

○●○

حوالے

۱ سیدہ طیبہ بیگم "روز نامہ منصف" حیدر آباد ۳۰/ دسمبر ۱۹۸۳ء ص: ۲

۲ S.S.C کے ریکارڈ کے مطابق

۳ مرزا اکبر علی بیگ پروفیسر تبسم اردو مغنی تبسم مشمولہ نذر مغنی تبسم مرتبہ سلیمان اطہر جاوید۔ حیدر آباد جولائی ۲۰۰۰ء ص ص: ۳۴۸۔۳۴۷

۴ عارف مجاہد ڈاکٹر "ڈاکٹر حفیظ قتیل حیات و خدمات" سنہ اشاعت ۱۹۹۴ء بار دوم ص: ۳

۵ عارف مجاہد ڈاکٹر "ڈاکٹر حفیظ قتیل حیات و خدمات" انتساب

۶ احمد حسین سعید۔ باقر امانت خانی کی ادبی خدمات۔ مخطوطہ مقالہ پی ایچ۔ ڈی مخزونہ عثمانیہ یونیورسٹی۔

۷ محمد ابرار الباقی۔ شخصی انٹرویو مرزا اکبر علی بیگ۔ ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۲ء بہ مقام حیدر گوڑہ حیدر آباد

۸ پروفیسر غلام عمر خاں بہ حوالہ "دیوانِ لطف" ص: ۸

۹ صلاح الدین نیر۔ "روشنی، خوش بو، مہک" مئی ۲۰۰۲ء حیدر آباد ص: ۱۵۹

۱۰ محمد ابرار الباقی۔ شخصی انٹرویو کنیز سکینہ (اہلیہ مرزا اکبر علی بیگ) یکم نومبر ۲۰۰۲ء بہ مقام حیدر گوڑہ، حیدر آباد۔

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
کے علمی و ادبی کارنامے

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ایک ایسے سپوت ہیں جن کے علمی و ادبی کارناموں کا سفر جاری و ساری ہے۔ تحقیق، تدوین، تنقید، خاکہ نگاری، سوانح نگاری و مضمون نگاری پر مشتمل جہاں ان کے علمی و ادبی کارنامے ہیں۔ وہیں بہ حیثیت مشفق استاد انھوں نے کئی طلباء کو تحقیق میں رہنمائی کرتے ہوئے چراغ سے چراغ جلا کر ترسیل علم کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی علمی استعداد و صلاحیت کو مختلف سمیناروں، ورک شاپ، ادبی جلسوں وغیرہ میں پیش کرتے ہوئے اہلِ علم سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں اور وہ اپنے علمی و ادبی و تحقیقی کارناموں سے تشنگان علم کی پیاس اس طرح بجھاتے ہیں جیسے بارش بلالحاظ تفریق ہر خطے اور ہر علاقے کو سیراب کرتے ہیں۔ ذیل میں علم و دانش کے اس مینارہ نور کے علمی و ادبی کارناموں کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

- **تصانیف اور تالیف :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف کی تفصیل اس طرح ہے۔

ا مرزا علی لطف حیات اور کارنامے (۱۹۷۹ء) :

یہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا پہلا تحقیقی کام ہے جو انھوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے کیا تھا بعد میں اسے زیور طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرایا۔ اس میں مرزا علی لطف کی حیات ان کے تذکرہ گلشنِ ہند پر تبصرہ اور ان کے کلام کا تفصیلی جائزہ شامل ہے۔

۲ خوش نفساں (خاکوں کا مجموعہ) (۱۹۸۳ء) :

"خوش نفساں" خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں حیدرآباد کی سیاسی و سماجی و ادبی شعبوں سے وابستہ انیسویں اور بیسویں صدی کی اہم شخصیات کے خاکے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ خاکے میر عابد علی خاں صاحب مدیر "سیاست" کی خواہش پر لکھے تھے اور بعد میں یہ سلسلہ وار روزنامہ سیاست میں شائع ہوتے گئے۔ بعد انھیں "خوش نفساں" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

۳ دیوانِ لطف (۱۹۸۳ء) :

دیوانِ لطف پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تیسری تصنیف ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ سے "دیوانِ لطف" کا نسخہ تلاش کرنے کے بعد اس کے مزید نسخوں کو حاصل کرتے ہوئے لطف کے کلام کی تدوین کی اور ایک بسیط اور عالمانہ مقدمہ لکھ کر "دیوانِ لطف" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔

۴ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے (۱۹۸۷ء) :

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ چوتھی تصنیف ہے۔ یہ ایک تحقیقی کام ہے جو سوانحی نوعیت کا ہے اس کتاب میں انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں نظام حیدرآباد کے دورِ حکومت میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے کام کرنے والے عزیز مرزا کے مفصل حالاتِ زندگی اور ان کی سماجی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا اہم کارنامہ ہے۔

۵ نظیر شناسی (۱۹۸۸ء) :

نظیر کی شخصیت اور فن پر مختلف مکاتیب فکر اور نقادوں کے مضامین پر مشتمل یہ کتاب پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے رفیق ڈاکٹر محمد علی اثر کے تعاون سے ترتیب دی ہے۔ اس کتاب میں مرتبین کا بھی ایک مضمون شامل ہے۔

۶ **دیوانِ حفیظ دہلوی (۱۹۹۴ء)** :

حفیظ دہلوی کے دیوان کی تدوین پر مشتمل پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ پانچویں تصنیف ہے۔ یہ کتاب انھوں نے کتب خانہ و ادارہ۔ تحقیق مخطوطات مشرقی آندھرا پردیش کے زیرِ اہتمام شائع کرائی۔ حفیظ دہلوی نے مرزا علی لطف کے ساتھ کچھ عرصہ حیدرآباد میں قیام کیا تھا۔ ان کے کلام کے دست یاب نسخوں کا موازنہ کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے دیوان کی تدوین کی اور حفیظ کے حالاتِ زندگی اور کلام کو سمجھانے کے لیے "دیوانِ حفیظ" میں ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔

۷ **" ید بیضا " (۱۹۹۵ء)** :

حیدرآباد کے مشہور شاعر کاظم علی برق موسوی کا کلام " ید بیضا " کے عنوان سے ترتیب دیا اور ان کے حالاتِ زندگی اور کلام پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے مقدمہ بھی لکھا۔

۸ **ابتدائی تلگو ریڈر (مشقی بیاض) (۱۹۹۹ء)** :

اردو زبان والوں کو تلگو زبان سکھانے کے لیے تلگو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے کچھ کوششیں کی گئی ہیں۔ تاکہ آندھرا پردیش کا اردو داں طبقہ بھی اپنے علاقہ کی زبان سیکھ سکے اور اس کی تہذیب و تمدن سے واقف ہوسکے۔ یعنی تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی کتاب کو تلگو اکیڈمی نے ۱۹۹۹ء میں جاری کیا۔ جس کو بزبان تلگو لکھنے والے ڈاکٹر پی۔ دکشنا مورتی ڈپٹی ڈائرکٹر (موظف) تلگو اکیڈمی ہیں۔ جب کہ اس کے مدیر ڈاکٹر ایم۔ راما ریڈی ہیں۔ تلگو اسباق کا اردو میں ترجمہ کرنے والے مسیح انجم بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ہیں۔ جب کہ اردو میں ادارت کے فرائض پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تفویض کیے گئے ہے۔

۹ **تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی (تعارفی) کتاب (۱۹۹۹ء)** :

تلگو اکیڈمی کی جانب سے تلگو زبان سیکھانے کے لیے دو کورسیس کا اہتمام کیا ہے۔ یہ کتاب دوسرے کورس کے لیے مختص ہے۔ یہ کورس بھی چار ماہ کو محیط ہے ویسے تلگو زبان میں یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں لکھی گئی لیکن اردو ترجمہ کے ساتھ اردو ملازمین یا تلگو سیکھنے کے خواہش مند افراد کے لیے ۱۹۹۹ء

میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے تلگو نصاب کی تیاری ڈاکٹر پی وکشنا مورتی ڈپٹی ڈائرکٹر تلگو اکیڈمی کے سپرد تھی جب کہ تلگو اڈیٹر کے فرائض ڈاکٹر ایم راما ریڈی ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر تلگو اکیڈمی نے انجام دیے۔ اردو ترجمہ کے لیے ریاست علی تاج ریٹائر لکچرر کی خدمات حاصل کی گئیں جب کہ اردو مدیر کی حیثیت سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خود کو وقف کیا۔

- **زیرِ طبع تصانیف :**

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی حسبِ ذیل تصانیف زیرِ طبع ہیں۔

١ نگارشاتِ عزیز (عزیز مرزا کے انشائیے اور مضامین)

٢ مکاتیبِ عزیز (عزیز مرزا کے خطوط)

٣ تذکرہ گلشنِ ہند (مرتبہ)

٤ نفوس گرامی (خاکے)

٥ محور (ادبی تبصرے)

٦ نقطۂ نگاہ (تنقیدی مضامین)

٧ محمد عزیز مرزا حیات اور کارنامے (انگریزی)

- **دیگر مقالے و مضامین :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بیسوں مضامین و مقالے ملک و بیرونِ ملک کے مختلف ادبی جرائد، رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سب رس (حیدرآباد)، سب رس (پاکستان)، روزنامہ سیاست (حیدرآباد)، روزنامہ منصف (حیدرآباد)، شاعر (بمبئی)، ہماری زبان، ہفتہ وار (دہلی)، ہندستانی زبان (بمبئی)، نیا دور (لکھنو)، علی گڑھ میگزین (علی گڑھ)، قومی زبان (حیدرآباد)، آندھرا پردیش (حیدرآباد) قابلِ ذکر ہیں اس کے علاوہ آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی کے لیے اسباق تیار کیے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے اسباق تیار کیے، کرناٹک اوپن یونیورسٹی کے لیے اسباق تیار کیے، ملک کی مختلف جامعات مثلاً

علی گڑھ یونیورسٹی، بھوپال یونیورسٹی، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد، عثمانیہ یونیورسٹی، ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی حیدرآباد اور نظام ٹرسٹ حیدرآباد میں کئی توسیعی لکچرس و خطابات دیے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے نیرنگ پروگرام سے وقتاً فوقتاً ادبی تحقیقی موضوعات پر ان کے مضامین نشر ہوئے۔

- **سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حسبِ ذیل سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور مقالے پیش کیے۔

۱ نظام ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ۱۷/ جنوری ۱۹۸۱ء کو منعقدہ کل ہند سمینار بہ عنوان "فانی" مقالہ پڑھا۔

۲ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نئی دہلی کے زیرِ اہتمام ۱۱ تا ۱۲/ مارچ ۱۹۸۲ء حیدرآباد میں "اردو کتابوں کے جائزے" کے عنوان سے منعقدہ قومی ورک شاپ میں شرکت کی اور مقالہ پڑھا۔

۳ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نئی دہلی کے زیرِ اہتمام ۲۳ تا ۳۰/ مارچ ۱۹۸۲ء حیدرآباد میں منعقدہ قومی سمینار بہ عنوان "آبادی تعلیم" میں شرکت کی اور مقالہ پڑھا۔

۴ عثمانیہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ۳ تا ۵/ جنوری ۱۹۸۶ء کو منعقدہ قومی سمینار بہ عنوان "حیدرآباد میں بیرونی شعرا" میں مقالہ پڑھا۔

۵ علی گڑھ یونیورسٹی میں ۲ تا ۴/ جولائی ۱۹۸۶ء میں "ہندستانی جامعات میں اردو نصاب" کے عنوان سے منعقدہ قومی سمینار میں مقالہ پڑھا۔

۶ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منعقدہ (۶) سمیناروں میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔

- **ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی طلباء کے لیے ریسرچ گائیڈ :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے زیرِ نگرانی (۱۶) طلباء و طالبات نے ایم۔ فل اور (۶) طلباء و طالبات نے پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی ہے اور مزید نو ریسرچ اسکالر، ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ ذیل میں چند طلباء و طالبات کے نام ان کے مقالوں کے عنوانات اور تکمیل کی تاریخ دی جارہی ہے۔

سنہ تکمیل	مقالہ نگار کا نام	مقالہ کا عنوان	سلسلہ نشان
۱۹۹۸ء	احمد النساء بیگم	جہاں بانو نقوی کی ادبی خدمات	۱
۱۹۸۷ء	محمد عبدالسعید	حکیم میر نادر علی رعد حیات اور کارنامے	۲
۱۹۸۹ء	رفعت شاہین	خاور نوری حیات اور کارنامے	۳
۱۹۹۸ء	محمد عبدالوہاب غوری	عظمت عبدالقیوم بہ حیثیت شاعرہ	۴
۲۰۰۰ء	امتیاز حسین احمد	برق موسوی حیات اور کارنامے	۵
۱۹۸۹ء	محمد تاج الدین شمیم	سید مظفرالدین خاں حیدرآبادی حیات اور کارنامے	۶
۱۹۹۰ء	بابا قدیر احمد	اشاریہ اردو انجمن ترقی اردو۔ سہ ماہی رسالہ	۷
۱۹۸۶ء	عارف مجاہد	ڈاکٹر حفیظ قتیل حیات و خدمات	۸

● **پی ایچ۔ڈی مقالے :**

سنہ تکمیل	مقالہ نگار کا نام	مقالہ کا عنوان	سلسلہ نشان
۱۹۹۱ء	فضل الحق	شیخ محمد حفیظ۔ حفیظ دہلوی حیات اور کارنامے	۱
۲۰۰۰ء	احمد حسین سعید	باقر امانت خانی کی ادبی خدمات	۲
۱۹۹۳ء	معصومہ بیگم	ٹیگور کا اثر اردو ادب پر	۳
۱۹۹۲ء	محمد مظہر الزماں صدیقی	علمائے دین کی ادبی خدمات بہ حوالہ خصوصی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۴

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
بہ حیثیت محقق

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا تحقیقی کارنامہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ہے۔ انھوں نے یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۷۰ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا اور بعد میں ان کی یہ تحقیقی کاوش کتابی شکل میں ۱۹۷۹ء میں ادارہ شعر و حکمت کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی اور ادبی حلقوں میں اسے سراہا گیا۔

مرزا علی لطف کا نام اردو ادب کی تاریخ میں اردو کے اولین تذکرہ نگاروں کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے تذکرہ "گلشنِ ہند" کے سبب جانے جاتے ہیں۔ لیکن مرزا علی لطف خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے تحقیقی مقالہ میں پہلی مرتبہ مرزا علی لطف کی حیات ان کی شاعری اور ان کے تذکرے کا مبسوط انداز میں جائزہ لیا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیقی کاوش "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" پر تفصیلی جائزے سے قبل تحقیق کے فن اور اس کی مبادیات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ تحقیق کے معنی حقائق کی کھوج، تفتیش، دریافت، چھان بین اور تلاش کے ہیں تحقیق عربی زبان کے لفظ حق سے مشتق ہے۔ جس کے معنی حق کو ثابت کرنے یا حق کی طرف پھیرنے کے ہیں حق کے معنی سچائی کے ہیں اور اس طرح تحقیق سچ یا حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ مختلف نقادوں اور ماہرینِ فن نے تحقیق کی مختلف تعریفیں کی ہیں ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

> "تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔" (۱)

قاضی عبدالودود کے بہ موجب۔

"تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔" (۲)

پروفیسر گیان چند جین تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو انشا کرنے کا باضابطہ عمل ہے اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے نامعلوم یا کم معلوم کو جاننا، یعنی جو حقائق ہماری نظروں کے سامنے نہیں ہیں انھیں کھوجنا جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں ان کی دھند دور کر کے انھیں آئنہ کر دینا۔" (۳)

ڈاکٹر شارب ردولوی تحقیق کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا پتہ لگانا ہے خواہ وہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں مدفون حقائق کو روشنی میں لانا ہو یا موجود مواد کو از سر نو ترتیب دینا ہو۔" (۴)

تحقیق کی مختلف تعریفوں اور توضیحات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحقیق حرکت و عمل و زندگی کی علامت ہے۔ اگر تحقیق رک جائے تو زندگی بھی رُک جاتی ہے۔ اردو میں ادبی تحقیق کے ضمن میں مصنفین اور ان کی تخلیقات کی بازیافت، ادبی تحریکات صحت متن کی تحقیق و تدوین، لسانی حقیقتوں کی کھوج جس میں قدیم زبان، محاورات، عروض اور رسم الخط وغیرہ شامل ہیں جیسے امور پر بحث کی جاتی ہے اور بعد تحقیق ادب کے سرمائے میں اضافہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق میں کسی موضوع کے انتخاب کے بعد قائم کردہ مفروضات سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق کبھی حتمی اور فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ ایک تحقیق مزید تحقیق کی راہیں کھولتی ہے۔ تحقیق کا فن صبر آزما فن ہے۔ اس کے لیے جگر کاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس خیال کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ:

"یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں بڑی جگر کاری محنت اور صبر کی ضرورت ہے۔ جلد اکتا جانے والا انسان تحقیق کی راہ میں زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے کہ حقائق کی تلاش

بہت دشوار کام ہے "۔ (۵)

بعض لوگ تحقیق کو بیکار کام اور گڑے مردے اکھاڑنے کا کام سمجھتے ہیں اور اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشہور نقاد ڈاکٹر محمد احسن فاروقی بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحقیق کے فن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> "۔۔۔ تحقیق ایک قسم کی منشی گیری ہے۔ اس کے لیے وہ خصوصیات کافی ہیں جو کسی معمولی ذہن کے انسان میں ہوں۔ اس میں جدت طبع، قوت اختراع کی ضرورت نہیں۔ محض ایک کام سے لگ جانا ہے اور ٹکے بندھے طریقے پر ایک لکیر پر چلتے رہنا ہے پھر اس میں جس قسم کی محنت درکار ہے اس کو اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ تخیل رکھنے والا انسان کبھی بھی نہ قبول کرے گا۔۔ ۔ تحقیق کرنے والے کی حیثیت ایک مزدور کی سی ہوتی ہے جو اینٹیں اٹھا کر لاتا ہے اور ان کو جوڑ کر دیوار بناتا ہے۔۔۔" (۶)

ڈاکٹر احسن فاروقی نے تحقیق کے بارے میں اپنے یہ نظریات جامعاتی تحقیق کے معیار کو دیکھ کر پیش کیے ہوں گے کہ وہاں سند کی خاطر تحقیق کی جاتی ہے جب کہ تحقیق اس کی اہمیت کے احساس اور پوری لگن سے کی جائے تو اس سے بڑے معنی خیز نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

تحقیق کا فن بہ ذات خود تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ تخلیق اور تنقید کا رشتہ بھی جڑا ہوا ہے۔ تحقیق اور تنقید تخلیق کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ ایک تخلیق وجود میں آنے کے بعد اس کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے اور تنقید کے ذریعہ اس کے مقام کا تعین کیا جاتا ہے۔ لیکن ان تینوں میں اولیت کا مسئلہ ماہرین کے نزدیک زیرِ تصفیہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک انسان میں تنقیدی رجحان نہ ہو۔ چیزوں میں انتخاب اور ترک کرنے کی صلاحیت نہ ہو وہ کوئی تخلیق نہیں پیش کر سکتا۔ اس طرح تخلیق سے پہلے تنقیدی شعور کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح تحقیق کے دوران بھی بہت سی موجود اشیا میں صحیح چیزوں یا باتوں کا انتخاب ایک اچھے محقق کی تنقیدی صلاحیت کی دلالت کرتا ہے۔

تحقیق و تنقید کے رشتہ کے بارے میں ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ:

"تنقید و تحقیق کو ہم معنی یا ایک دوسرے کے مترادف سمجھنا یا ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق سمجھنا غلط ہے۔ اس لیے کہ بغیر تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کے تحقیق مکمل نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی تحقیق بغیر تنقیدی بصیرت کے ہے تو وہ معاشیات اور مالیات کے اعداد و شمار کی طرح ہوگی جس سے معنی خیز نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی۔۔۔ تحقیق بغیر تنقید کے مکمل نہیں ہے اور تنقید میں تحقیق سے بعض معنی خیز نتائج رونما ہوتے ہیں۔" (۷)

تحقیق و تنقید کے مابین اس رشتہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کامیاب محقق کے لیے اسے ایک اچھا نقاد بھی ہونا ضروری ہے اردو تحقیق کے ابتدائی نقوش میں تنقیدی شعور کی کمی پائی گئی ہے۔ لیکن جیسے جیسے وسائل بڑھے اور زبان ترقی پاتی گئی تحقیق کے معیارات میں بھی تبدیلی آئی اور تنقیدی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو کے محققین نے سائنٹفک انداز میں تحقیق کی اور اپنی تحقیقات میں بہت کم خامیاں چھوڑیں۔ آزادی کے بعد اردو تحقیق میں ہونے والی پیش رفت کے بارے میں ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ:

"آزادی کے بعد اردو میں تحقیقی کاموں کی رفتار میں کافی اضافہ ہوا ہے اور بہت سی اہم چیزیں سامنے آئی ہیں۔ جن سے ایک طرف ادب کے سرمایے میں اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف لوگوں کی معلومات میں۔ ان محققین میں بیشتر ایسے ہیں جو تنقید و تحقیق کو برابر اہم سمجھتے ہیں اور تنقیدی شعور کے ساتھ تحقیقی فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح تحقیق بھی تنقید کی ایک روایت بن جاتی ہے۔" (۸)

تحقیق کی مختلف تعریفوں، اردو میں تحقیق کی نوعیت اور روایت اور تحقیق و تنقید میں پائے جانے والے رشتے کے بارے میں جاننے کے بعد اب یہ دیکھا جائے تاکہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تحقیقی کاوش مرزا علی لطف حیات اور کارنامے میں تحقیق و تنقید کے اصولوں کو کس حد تک بروئے کار لایا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ تحقیقی کتاب "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" پہلی مرتبہ پانسو کی

تعداد میں ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے یہ کتاب اپنی پھوپھی فاطمہ بیگم (مرحومہ) کے نام معنون کی ہے اور ان کی شفقت اور سرپرستی سے محرومی کا اظہار کرتے ہوئے انتساب میں وقار صدیقی کا یہ شعر نقل کیا ہے:

ہم بھلانے چلے بھی ہیں کس کو

جس کی ہر بات یاد آتی ہے

اس کتاب کے ابواب کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ مرزا علی لطف کی حیات سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ ان کے کارناموں اور شاعری سے متعلق ہے۔ پہلے حصے میں نام، والد، پیدائش، مولد، تعلیم و تربیت، شعر گوئی کی ابتدا، تلمذ، ترکِ وطن، لکھنؤ کو روانگی، لطف کی کلکتہ میں آمد، گلشن ہند کی وجہ تالیف لطف کی کلکتہ سے حیدرآباد میں آمد، نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی سرپرستی، اعظم الامراء اور ارسطو جاہ کی مصاحبت، لطف کی میر عالم سے وابستگی، حیدرآباد دکن میں لطف کے معاصر شعرا، لطف کی وفات، مرزا علی لطف کی سیرت، مذہبی عقائد، تاہل، لطف کے تلامذہ، لطف تخلص کے دیگر شعرا، عنوانات ہیں جب کہ دوسرے حصہ میں لطف کے کارناموں کے تحت تذکرہ نگاری اور اس کا فن گلشن ہند کا ماخذ، تذکرہ گلزارِ ابراہیم اور اس کا مصنف، گلزار ابراہیم کے ترجمہ اور ان کا موازنہ، تذکرہ گلشن ہند کے قلمی نسخے، تذکرہ گلشن ہند کے مطبوعہ نسخے، اردو تذکروں میں گلشنِ ہند کا مرتبہ، لطف کا اسلوب بیان عنوانات ہیں اور شاعری کے تحت دیوانِ لطف، لطف کی غزل گوئی، منتخب کلام، لطف کی قصیدہ نگاری، لطف کی مثنوی نگاری، لطف کی رباعیات، لطف کی تاریخ گوئی، لطف کا فارسی کلام عنوانات کے تحت معلومات پیش کی گئی ہیں اور کتابیات کے بعد، ۴۳ صفحات پر مشتمل اس تحقیقی کتاب کا اختتام عمل میں آتا ہے۔

مرزا علی لطف حیات ار کارنامے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب کے گرد پوش (ڈسٹ کور) پر ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب نے مرزا علی لطف کے تذکرہ " گلشن ہند " کی اہمیت اور اس کی وجہ تصنیف بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس تحقیقی کاوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

" فورٹ ولیم کالج پر پہلی کتاب " ارباب نثر اردو " جناب سید محمد نے آج سے کوئی

۴۲ سال قبل شائع کی تھی۔ اس دوران میں فورٹ ولیم کالج سے متعلق متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے مقالہ کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تصور کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے حالات کی چھان بین میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے انھوں نے تمام قابلِ حصول ماخذوں کو ٹٹولا ہے مدلل بحثیں کی ہیں، مختلف بیانات کی تنقیح کی ہے اور اصابت رائے کے ساتھ نتائج اخذ کیے ہیں اسی طرح انھوں نے ایک طرف " گلزار ابراہیم " اور گلشنِ ہند " کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور دوسری طرف پیش رو تذکروں سے گلشنِ ہند کا موازنہ کر کے شعرائے اردو کے تذکروں میں گلشنِ ہند کے مقام اور مرتبہ کا تعین کیا ہے۔" (۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس تحقیقی کاوش پر " تاثرات " عنوان کے تحت تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

" مرزا علی لطف دور فورٹ ولیم کالج کی ان ادبی شخصیات میں سے ہیں جن پر اب تک پوری توجہ نہیں کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے تذکرے کے تمام نسخوں کا موازنہ کر کے اس بارے میں نہایت اہم معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس مقالے کے ذریعہ مرزا علی لطف کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا ہے وہ ہے ان کی تخلیقی حیثیت۔ مصنف نے مرزا علی لطف کا دیوان عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں کھوج نکالا ہے۔۔۔ اور سارے شعری سرمایہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور لطف کی خوش گوئی اور سخن آفرینی کی تحسین و قدر کی ہے۔ مقالے کے آغاز میں لطف کی سوانحی کڑیاں ملائی گئی ہیں اور ان کی شخصیت کو مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر جگہ تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اپنی معلومات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔" (۱۰)

اسی طرح ڈاکٹر نثار احمد فاروقی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اس تحقیقی کام کے بارے میں اپنے خیالات، تاثرات کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ استاد شعبہ اردو سٹی کالج حیدرآباد نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کے لیے مرزا علی لطف کی شخصیت اور تصانیف کو منتخب کیا ہے۔ انھوں نے تمام معلوم مصادر کے علاوہ بعض ایسے ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جن کا ابھی تک پورا استعمال نہیں ہوا تھا۔ فاضل مقالہ نگار نے بہت محنت اور سلیقے کے ساتھ یہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اس کی اشاعت سے نہ صرف مرزا علی لطف کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عہدِ متوسلین کی ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہمیں دست یاب ہو جاتی ہے۔" (۱۱)

پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے بھی تعارف کے عنوان سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحقیقی کام کی ستائش کی ہے اور بڑے ہی عالمانہ انداز میں اس کام کا جائزہ لیا ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس موہوم امید کے ساتھ کہ وہ لطف کی حیات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ان کی شعری تخلیقات تک رسائی حاصل کر سکیں گے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ ابتدا میں انھیں سخت مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری بالآخر ان کی مساعی بارآور ہوئیں۔ حیات لطف کے بارے میں چند اہم معلومات فراہم کرنے کے علاوہ انھوں نے تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لطف کے نام وطن تلمذ سے لے کر تاریخ وفات تک بہت سے متنازعہ فیہ امور کی یکسوئی کر دی دوسرا اہم کام انھوں نے یہ کیا کہ "گلشنِ ہند" کا گلزارِ ابراہیم اور دوسرے تذکروں سے موازنہ کرتے ہوئے لطف کے اس کارنامے کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں حیدری کے تذکرے "گلشنِ ہند" کے بارے میں انھوں نے جو انکشافات کیے ہیں وہ تحقیقی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے لطف کے دیوان کو کھوج نکالا اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لے کر لطف کو صف دوم کے ایک قابل ذکر شاعر کی

حیثیت سے متعارف کروایا۔۔۔ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی اپنے مقالے میں کچھ ایسے گوشے ابھارے ہیں جو اہلِ تحقیق کو دعوت فکر و نظر دیتے ہیں۔" (۱۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس تحقیقی کاوش پر ماہرین کی آرا، کے ساتھ "پیش لفظ" کے عنوان سے خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی وجوہات بتائیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی مرزا علی لطف کو بہ حیثیت تذکرہ نگار پیش کرنے کے علاوہ بہ حیثیت شاعر پیش کرنے میں بھی تحقیق کی گنجائش تھی اور ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات بھی تحقیق طلب تھیں۔ لہذا یہ مقالہ ان نکات کو پیش کرنے کی ایک سعی ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی اس تحقیقی کاوش کا آغاز مرزا علی لطف کی حیات کے حصے سے شروع کیا اور اس سے قبل مرزا علی لطف کے عہد کا پس منظر بیان نہیں کیا۔ اس سے قاری کو یہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ کس عہد کے اور کس علاقے کی شخصیت کے بارے میں مطالعہ کر رہا ہے۔ جب کہ فرد پر تحقیق کے سلسلے میں اگر قدیم زمانے کی شخصیت ہو تو اس کا پس منظر دینے کی ضرورت تحقیق میں محسوس کی گئی ہے اور اردو تحقیق میں اس کی روایت بھی موجود ہے۔ فرد پر تحقیق میں حیات سے قبل پس منظر کو مختصر طور پر بیان کرنے کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"فرد پر تحقیقی مقالے میں پہلے باب کے تعلق سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سیاسی اور سماجی پس منظر دیا جائے۔ سیاسی نہ ہو تو کم از کم سماجی ہی سہی پس منظر تاریخی تنقید کی اور اس سے بھی زیادہ مارکسی تنقید کی دین ہے اردو میں اس کی ابتدا شیخ چاند کے مقالے "سودا" سے ہوئی اور منتہا ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب میر حیات اور شاعری میں۔ اس کے کچھ بعد سے اس پہلو کی مقبولیت میں کمی آ رہی ہے۔ سیاسی تاریخ کا اسی صورت میں ذکر کرنا چاہیے جب کہ معاصر سیاست نے متعلقہ ادیب کی تخلیقات کو نمایاں طور سے متاثر کیا ہو۔ پھر یہ خیال رہے کہ تحقیقی مقالے میں وہی معلومات دینی چاہیں جن سے قاری واقف نہیں جو پہلی بار پیش کی جا رہی

ہیں اٹھارویں انیسویں صدی کی دلی اور لکھنو کے فرماں رواوں کے معاملات ہوں کہ بیسویں صدی کی جنگ آزادی کی شورشیں، اب ہر قاری ان سے واقف ہو چکا ہے۔ ان کی طرف صرف ایک اشارہ کر دینا کافی ہے۔" (۱۳)

پروفیسر گیان چند جین کے خیالات کے اعتبار سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو مرزا علی لطف کی حیات کی پیش کشی سے قبل مختصر سا سیاسی و سماجی پس منظر دینا بہتر تھا۔ مرزا علی لطف کو اس کتاب میں بہ حیثیت تذکرہ نگار اور بہ حیثیت شاعر پیش کیا گیا ہے اور ہر شاعر و تخلیق کار اپنے عہد سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ چناں چہ اس تخلیق کار کی تخلیقات کے مطالعہ کے لیے اس کے عہد سے اور اس وقت کے ادب سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے بھی اس چیز کی اہمیت بیان کی ہے:

"کوئی شاعر کوئی فن کار خواہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو۔ تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور اس کی بڑائی اسی میں مضمر ہے کہ پچھلے شعرا اور فن کاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے الگ رکھ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جاسکتی۔ اسے پچھلے شعرا اور فن کاروں کے درمیان رکھ کر تقابل و تفاوت کرنا ہوگا۔" (۱۴)

پس منظر کے بیان کے سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین نے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ایسے موضوعات اور ادیب بہت کم ہیں جن کے فن پر تبصرہ ان کے سیاسی اور تاریخی پس منظر ہی میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر قدما مثلاً ابن نشاطی باقر آگاہ، مضمون یک رنگ، آتش ناسخ امیر و داغ وغیرہ اور بیسویں صدی کے یلدرم، صفی، سیماب، اصغر یا جگر وغیرہ پر مقالہ لکھنا ہے تو کسی پس منظر کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر پریم چند اقبال، سجاد ظہیر یا فیض پر لکھنا ہو تو پس منظر دینا ہوگا۔ لیکن آٹھ دس صفحات سے زیادہ کا نہیں کیوں کہ آپ جو کچھ بیان کریں گے قاری اس سے پہلے ہی آگاہی رکھتا ہے۔" (۱۵)

پس منظر کے لیے شخصیت کی موزونیت کے ضمن پروفیسر گیان چند جین کے خیالات کی روشنی میں مرزا

علی لطف کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو پہلے زمرے میں مرزا علی لطف کا شمار موجودہ دور کی تحقیق کے اعتبار سے قدما میں ہوتا ہے لیکن دوسرے زمرے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مرزا علی لطف کا تعلق بھی ایک خاص تحریک سے تھا اور وہ تحریک فورٹ ولیم کالج کی تحریک تھی۔ چناں چہ فورٹ ولیم کالج کے پس منظر میں مرزا علی لطف کے دور کا جائزہ مناسب تھا۔ لیکن انھوں نے پس منظر نہیں دیا۔ لیکن ہوسکتا ہے شخصیت کے حالات کے بیان کے دوران اس شخصیت سے متعلق عہد اور دور کا پس منظر بھی بیان کیا ہو۔ پروفیسر گیان چند جین نے اس طرح کی گنجائش کا بھی ذکر کیا ہے اور اسے بہتر قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

"ابتدائی باب میں تاریخی سیاسی پس منظر دینے سے بہتر ہے کہ جب تخلیقات کا جائزہ لیا جائے وہیں انھیں بہ راہِ راست متاثر کرنے والے عوامل کا بیان کر دیا جائے۔" (۱۶)

"مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" کے آغاز میں سیاسی و سماجی پس منظر کی عدم موجودگی مقالہ کے آغاز کو اجنبیت فراہم کرتی ہے لیکن اس میں بھی اگر تجسس کا پہلو تلاش کیا جائے تو یہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی کامیابی تصور کی جائے گی کہ انھوں نے شخصیت کے تعارف میں تجسس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

مرزا علی لطف کے نام کے بارے میں انھوں نے "گلشنِ ہند" تذکرے میں اپنے نام کی صراحت کے سلسلے میں خود مرزا علی لطف کی تحریر "لطف تخلص مرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشاں کا" (۱۷) کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا کہ مرزا علی لطف کے نام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے لیکن دیگر تذکروں اور استاد شعرا کے شاگردوں کی فہرستوں میں مرزا علی لطف کے نام کے ساتھ ہونے والے مغالطوں کا بھی محققانہ انداز میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ تذکرہ "طبقات الشعرا" میں ان کا نام مرزا علی اور تذکرہ "گلستان بے خزاں" میں ان کا نام مرزا عالی لکھا گیا اسی طرح تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں سودا کے شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام "لطف علی بیگ" بتایا گیا ہے۔ لیکن لطف نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کے شاگرد نہیں۔ لہذا پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خود لطف کے بیان پر اکتفا کرتے ہوئے ان کے نام کے صحیح تعین کی کوشش کی ہے اور تحقیق میں ادیب کے بارے میں ماخذی مواد کے لیے اس کے مسودے، خطوط، ڈائری وغیرہ پر اکتفا کیا

جاتا ہے چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تحقیق کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے "مرزا علی لطف" کے نام کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ نام کے تعین کے سلسلے میں تفصیلات اس لیے ضروری ہیں کہ بعض دفعہ قدما میں نام سے ملتے جلتے کئی شاعر اور ادیب ہوسکتے ہیں اور ان کے کلام کے انتخاب میں دشواری پیش آسکتی ہے۔ مرزا علی لطف بھی چوں کہ قدما سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے نام کے صحیح تعین سے ان سے متعلق دیگر باتوں کے انتخاب میں سہولت پیدا ہونے کا امکان رہا ہوگا۔

مرزا علی لطف کے آباد واجدا کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ ان کا تعلق ایران سے تھا۔ والد کا نام کاظم بیگ خاں تھا۔ جو نادر شاہ کی افواج کے ہم راہ ۱۷۳۹ء میں ہندستان آئے تھے۔ لطف کے والد کے نام کے تعین کے سلسلے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "گلشنِ ہند" میں مرزا علی لطف کی تحریر کے حوالے سے لکھا کہ:

"اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔" (۱۸)

اپنے والد کے بارے میں مرزا علی لطف نے لکھا کہ وہ دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کس عہدے پر تھے اس کی صراحت نہیں کی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس بات سے یہ اندازہ لگایا کہ مرزا علی لطف کے والد دربار میں بہ حیثیت شاعر بادشاہ کے زمرہ معاصرین و مقربین میں شامل رہے ہوں۔ پروفیسر گیان چند جین نے آباد واجداد کے پیشوں اور ان کے احوال کے بارے میں ادیبوں کی جانب سے معلومات کی فراہمی میں کمی بیشی کے بارے میں ایک اہم نکتہ پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"مصنف اپنے بارے میں جو کچھ بیان کرے اس سے زیادہ معتبر اور کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ کوئی بھی راوی ہو، اس کی معروضیت اور غیر جانبداری اہم ہوتی ہے۔۔۔ کوئی ادیب اپنے سرگزشتانہ بیانات میں قصداً کسی غرض سے اپنے اجداد اور اپنے بارے میں غلط بیانی کرسکتا ہے یا پھر اس کا حافظ اور معلومات دھوکے دے سکتی ہیں۔" (۱۹)

پروفیسر گیان چند جین نے مثالوں کے ذریعہ واضح کیا کہ بہت سے ادیبوں نے جان بوجھ کر اور سہواً اپنے

آباد و اجداد کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا ہے اور ان کی اعلیٰ صفات بیان کرتے ہوئے انھیں باکمال انسان کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسی طرح بعض ادیب اپنے محسنوں، مربیوں اور اساتذہ کے بارے میں اہم معلومات کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ حالی کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ "یادگار غالب" میں انھوں نے غالب کی قمار بازی اور قید کی تفصیلات نہیں دیں۔ کیوں کہ غالب حالی کے استاد تھے۔ لیکن زندگی کے دیگر معاملات کی طرح ادب میں بھی گروہ بندی ہوتی ہے اور ایک گروہ کے افراد دوسرے گروہ کو بے عیب کرنے کی کوشش کرتے ہیں چناں چہ غالب کے مخالفین نے ان کا خوب کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ اس طرح ایک محقق کو کسی کے حالات کی تہہ تک پہنچنے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مرزا علی لطف کے گھرانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے دو بھائی علی رضا اور حاجی مرزا جان تھے دونوں اپنے زمانے کے مشہور سوز خواں تھے مرزا علی لطف کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کے تاریخ پیدائش یا سنہ پیدائش کی تعین کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس سلسلے میں کوئی اندازہ قائم کرنے کے بجائے دیگر محققین کے سنین کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کا سنہ ولادت خود لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند میں نہیں کیا اور نہ ہی کسی تذکرہ نگار نے کیا ہے۔ پروفیسر ثمینہ شوکت کے حوالے سے انھوں نے لکھا کہ "قدرت اللہ شوق نے اپنا تذکرہ طبقات الشعرا ۱۱۸۸ھ م ۱۷۷۴ء میں لکھا۔ جس میں لطف کا بھی ذکر ہے۔ اگر اس تصنیف کے زمانے میں لطف کی عمر کم سے کم انیس بیس برس فرض کی جائے تو ان کا سنہ ولادت ۱۱۶۸ھ م ۱۷۵۴ء کے لگ بھگ قرار پاتا ہے (۲۰)۔

پروفیسر ثمینہ شوکت کے قیاس کے علاوہ ڈاکٹر جاوید نہال نے مرزا علی لطف کا قیاسی سنہ ولدیت ۱۷۶۰ء اور قاضی عبدالودود نے ۱۱۷۱ھ اور ۱۱۷۵ھ کے درمیان بتایا ہے۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے قیاس کی وجوہات کو بھی ناکافی اور غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے ان تمام محققین کے قیاسوں کو غلط قرار دیا۔ پرانے ادیبوں کی سوانح مرتب کرنے کے دوران مختلف واقعات کے سنین کے تعین میں دشواری کا تذکرہ کرتے ہوئے

پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"کسی پرانے ادیب کی سوانح مرتب کرنا چاہیں تو اس کی تصانیف کے ابتدائی اور آخری صفحات میں جو کچھ مل جائے وہ بسا غنیمت ہے۔ اس کے علاوہ وہ تذکروں اور تواریخ ادب سے مدد لینی ہوتی ہے۔ ان میں بے احتیاطی پوری شان سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سنین کو لیجیے کسی کا سن وفات و ولادت کوئی کچھ لکھتا ہے کوئی کچھ۔ زندگی کے دوسرے واقعات کے سنین کا بھی یہی عالم ہوتا ہے۔ ان سب کا مقابلہ کر کے اپنی علمی سرمائے اور تحقیقی تجربے کی بنا پر کسی نتیجے تک پہنچیے۔ اگر آپ نے دوسروں کے مختلف بیانات درج کرنے پر ہی اکتفا کی تو آپ نے قاری کی کیا رہبری کی۔ محقق کی ذمہ داری سے تو عہدہ برآ ہوئے ہی نہیں جاسوس اور وکیل کی طرح چھان بین اور جرح کر کے قابل قبول نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کیجیے جو پوری حقیقت نہ سہی، حقیقت کے اس قدر قریب تو ہوگا جتنا موجودہ مواد کے پیش نظر ممکن تھا۔" (۲۱)

مرزا علی لطف کی سنہ ولادت کے تعین کے معاملہ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر گیان چند جین کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی دوسرں کے بیانات درج کرنے کے ساتھ حقائق جاننے کی کوشش کی ہے۔ تاہم تاریخ کے سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے بجائے انھوں نے مرزا علی لطف کے قریب تر سنہ ولادت کے تعین میں بھی اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے سہل نگاری سے کام لیا ہے۔

مرزا علی لطف کے وطن کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ لطف کے تذکرے میں ان کے خاندان کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ لطف کا مولد دہلی تھا لطف کی تعلیم و تربیت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مختلف تذکروں کے حوالوں سے لکھا کہ:

"لطف کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ لطف نے مختلف علما سے استفادہ کیا اور علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ عربی، فارسی اور ہندی میں اچھی استعداد پیدا کرلی۔۔۔ لطف کے بیان سے

اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد کا بھی بڑا حصہ رہا ہے لطف نے فارسی کی تحصیل انھیں سے کی اور اپنے فارسی کلام پر والد ہی سے اصلاح لی۔" (۲۲)

لطف کی شاعری کے آغاز کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ اس زمانے میں دلی شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ اردو شاعری کا زرین عہد تھا۔ دبستان دلی کے مشہور شعرا میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر محمد سوز کے اشعار خاص و عام کی زبان پر تھے۔ آئے دن مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ گمان اغلب ہے کہ لطف نے اپنی نوجوانی میں دلی کے ان مشاعروں میں شرکت کی ہوگی اس عہد میں ہر شاعر کسی نہ کسی استاد شاعر سے اپنے کلام کی اصلاح لیتا تھا۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے مرزا علی لطف کو میر یا سودا کا شاگرد بتایا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کی شاگردی کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں کے حوالے دیے اور خود گلشن ہند سے لطف کا یہ بیان نقل کیا کہ "اصلاح فارسی کی اس ہیچ مندان کو آپ ہی (مرزا کاظم بیگ ہجری) کی جناب سے ہے (۲۳)۔ مرزا علی لطف کے میر و سودا کی شاگردی سے انکار کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے چند ایک دل چسپ وجوہات بیان کی ہیں اور لکھا کہ میر یا سودا کا شاگرد کہلانا اس عہد میں مبتدی شعرا کے لیے باعث افتخار تھا۔ چناں چہ اگر لطف ان دونوں میں سے کسی کے شاگرد ہوئے تو ضرور اس کا اظہار کرتے۔ دوسری بات یہ کہ لطف کو میر سے تلمذ حاصل نہیں رہا یہ بات قطعیت سے کہی جا سکتی ہے کیوں کہ لطف نے جب اپنا تذکرہ لکھا اس وقت میر زندہ تھے اور میر کی موجودگی میں وہ اپنے تذکرے میں شاگردی سے متعلق غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتے تھے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لطف کے حالات بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ لطف کی ابتدائی تعلیم دلی میں ہوئی۔ دلی پر نادر شاہی حملوں کے سبب ہونے والی تباہی کے پیش نظر شعرا دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے جا رہے تھے جہاں چین و سکون تھا اور شعرا کی قدر دانی ہو رہی تھی۔ چناں چہ والد کے انتقال کے بعد وہ لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ لطف کے لکھنؤ منتقل ہونے کے سنہ کے سلسلے میں بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مختلف حوالوں سے تاریخ کے تعین کی کوشش کی ہے لکھنؤ میں لطف کے ہم عصر شعرا کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا

کہ لطف کے لکھنو ہم عصر شعرا میں سودا، میر، سوز، مصحفی، منت، وغیرہ شامل تھے اور جو بساطِ شعر دلی میں لٹ گئی تھی وہ ایک مرتبہ پھر شاہان اودھ کی سرپرستی سے لکھنو میں بچھ گئی تھی۔ مرزا علی لطف صغر سنی ہی سے آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ جب آصف الدولہ کا انتقال ہوا تو مرزا علی لطف نے ان کی یاد میں پُراثر اشعار کہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے:

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا　　ایک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا ہوتے ہی لبریز　　خالی سب عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتشِ غم سے　　دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سال تاریخ کا خیال کسے　　خشک شعر و سخن کا باغ ہوا
بولے یوں دور کر کے پائے عناد　　آج گل ہند کا چراغ ہوا (۲۴)

لکھنو کے قیام کے دوران لطف نے مرفع الحال زندگی گزاری تھی، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ لطف کے پاس اعلیٰ نسل کے کبوتر تھے۔ جن کی سارے شہر میں شہرت تھی۔ اس سے ان کی خوش حالی کا اندازہ ہوتا ہے آصف الدولہ کے انتقال کے بعد لطف عظیم آباد منتقل ہوگئے تھے۔ پروفیسر حامد حسن قادری اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے حوالے سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کی عظیم آباد روانگی کے احوال لکھے۔ لطف نے عظیم آباد میں زیادہ عرصہ تک قیام نہیں کیا اور چند دن کلکتہ میں گزارنے کے بعد وہ مستقل حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے۔ کیوں کہ اس زمانے میں لکھنو، عظیم آباد کے علاوہ حیدرآباد شعرا کی جنت سمجھا جاتا تھا۔ لطف کے سفر کے بارے میں پروفیسر سید محمد کے حوالے سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"لطف نے حیدرآباد کے سفر کا ارادہ کیا اور چند روز عظیم آباد پٹنہ میں گزار کر بنگال کی سیاحت کرتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ڈاکٹر گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی۔" (۲۵)

مرزا علی لطف نے کلکتہ میں قیام اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ان کی ملاقات اور فورٹ ولیم کالج سے ان کی وابستگی اور "تذکرہ گلشن ہند" کی تالیف کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد مرزا علی لطف لکھنو سے روانہ ہوئے اور براہ عظیم آباد مرشد آباد پہنچے۔ دو سال وہاں قیام کیا۔ اس دوران فورٹ ولیم کالج سے وابستہ شیر علی افسوس نے لطف کے پاس قیام کیا۔ شیر علی افسوس کی کلکتہ روانگی کے بعد ان کی دعوت پر لطف بھی کلکتہ پہنچے شیر علی افسوس نے لطف کا تعارف گلکرسٹ سے کروایا۔ وہ ان کی ادبی صلاحیتوں سے کافی متاثر ہوئے۔ گلکرسٹ اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے سربراہ تھے اور وہ بہت سے نادر ادبی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کروا رہے تھے۔ گلکرسٹ کی نظروں سے علی ابراہیم خلیل خاں کا فارسی تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" گزر چکا تھا اور وہ اسے اردو زبان میں ترجمہ کروانا چاہتے تھے۔ لطف کو اس کام کے لیے موزوں جان کر انھوں نے یہ ذمہ داری انھیں سونپ دی۔ فورٹ ولیم کالج سے لطف کی وابستگی کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ:

"فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہندستانی زبان (اردو) کی بیش تر کتابیں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئیں۔ بعض کتابیں کالج کونسل کی ایما یا منظوری سے لکھوائی گئیں۔ تصنیف و تالیف کے کام کے لیے منشیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ جس میں سے بعض مستقل تھے اور بعض جزوقتی۔ مرزا علی لطف کو جزوقتی منشی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ کالج کے مستقل ملازم نہیں تھے۔ لیکن ان سے "تذکرہ گلشنِ ہند" کی تالیف کے لیے فرمائش کی گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ مرزا علی لطف نے بہت ہی قلیل مدت تک کلکتہ میں قیام کیا۔ تذکرہ گلشنِ ہند کی تالیف (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء) کے بعد وہ حیدرآباد روانہ ہوگئے۔" (۲۶)

"لطف کی کلکتہ سے حیدرآباد میں آمد" کے عنوان سے باب مرزا علی لطف کی حیدرآباد آمد کی وجوہات اور حیدرآباد کے شاہوں کی سرپرستی کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تفصیلات پیش کی ہیں۔ گلشنِ ہند کے حوالے سے انھوں نے لکھا کہ لطف سیر کے ارادے سے حیدرآباد آنا چاہتے تھے۔ لطف لکھتے ہیں:

"اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا۔ لیکن اس خلق مجسم (گلکرسٹ) کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے بیان

فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کہ اور کچھ نہ بن آیا۔ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، الحمد للہ آج کے دن ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے ہیں۔ اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا۔" (۲۷)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے اس بیان کی تردید کی کہ وہ محض سیاحت کی خاطر حیدر آباد آئے تھے اور دلیل یہ پیش کی کہ اگر سیاحت کے لیے آتے تو چند دن قیام کے بعد چلے جاتے لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی علی رضا رضا کی ایما پر حیدر آباد آئے تھے اور نواب ارسطو جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ ویسے تو لطف حیدر آباد میں رہنے لگے تھے لیکن ان کا دل دلی میں اپنے دوستوں کی یاد میں لگا رہتا تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے چند ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے جن سے اپنے دوستوں اور دلی کی یاد کے بارے میں لطف کی سچائی جھلکتی ہے:

دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی ان سے ہیں مسدود ہیں نامہ و پیغام کی

یاد نے ان تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ ہر قدم پر جان ماری ہے دل ناکام کی

ہر صبح گھر سے دیتی ہے یاد وطن نکال

غربت میں عمر کٹ گئی صبا کی طرح (۲۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ لطف چند سال تک نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی سرپرستی میں بھی رہے۔ جن کا دور حکومت ۱۸۰۳ء تا ۱۸۱۰ء رہا ہے۔ انھوں نے لطف کی قدردانی کی اور انھیں چار سو روپے ماہوار اور پالکی کے ساتھ دربار میں رکھا۔ اس وقت حیدر آباد دکن میں اہم بیرونی و مقامی شعرا میں محمد حفیظ دہلوی، ماہ لقا بائی چندا، محمد صدیق متین، شیر محمد خاں ایمان، میر ذوالفقار علی صفا لکھنوی، شاہ کمال، احسن اللہ خاں بیان دہلوی، شاہ نصیر وغیرہ شامل ہیں نواب نظام علی خاں ثانی نواب ارسطو جاہ کو اورنگ آباد سے حیدر آباد طلب کر کے مدارالمہام (وزیر اعظم) کی خدمت عطا کی۔ ان کے دربار میں فارسی اور اردو کے کئی نامور شعرا رہا کرتے تھے۔ نواب ارسطو ہی نے پہلے لطف کو اپنی مصاحبین میں شامل کیا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا بعد میں نظام علی خاں کے حضور باریابی کا انتظام کیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی اس تحقیقی

کتاب میں لطف کے ایک قصیدے کے اشعار پیش کیے ہیں جس میں لطف نے ارسطو جاہ سے اپنے وظیفہ کے ناکافی ہونے اور اسے تین سو تک بڑھانے کی درخواست کی ہے۔لطف لکھتے ہیں:

سرکار سے تری جوز راہ تفضلات — ہے ڈیڑھ سو روپیہ خادم کا ماہ وار

ہرچند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں — جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

تصنیفِ فصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف — کیوں کے بے حیائی نہیں ہوتی بار بار

غالب ہے تجھ پر شاق نہ ہو میرے تین سو

چھ سو جب امیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار (۲۹)

مرزا علی لطف کے اس قصیدے کی مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ یہ ایک سو ایک (۱۰۱) اشعار کا طویل قصیدہ ہے۔ اس قصیدہ میں لطف نے حسنِ طلب سے پہلے نواب ارسطو جاہ کے خاندانی حالات و مراتب کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے اور خود اپنے سپاہی پیشہ ہونے پر ناز کیا۔انھوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنو میں وہ خوش حال تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے ایک اور قصیدہ کی تفصیلات بھی پیش کیں اور لکھا کہ یہ لامیہ قصیدہ (۵۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدہ میں انھوں نے نواب ارسطو جاہ کی تعریف کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے یہ قصائد ان کے دیوان کے مخطوطات سے حاصل کیے جو کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مخزونہ ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے حیدرآباد میں قیام کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۱۸۰۴ء میں نواب ارسطو جاہ کے انتقال سے لطف اپنے ایک مربیّ اور سرپرست سے محروم ہوگئے تھے۔ نواب سکندر جاہ نے میر عالم کو مدارالمہام بنایا۔ یہ بھی شعرا کی سرپرستی کے لیے مشہور تھے انھوں نے لطف کی قدر دانی کی۔ ۱۸۰۸ء میں میر عالم کا بھی انتقال ہوگیا۔ لطف نے میر عالم کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے۔ لطف کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حیدرآباد دکن میں لطف کے معاصر شعرا کے عنوان سے لطف کے عہد کے شاعرانہ مزاج کو پرکھنے کی کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں شیر محمد خاں ایمان، شیخ محمد حفیظ، حفیظ میر

ذوالفقار علی، صفا لکھنوی، غلام مصطفیٰ سخن، ماہ لقا بائی چندا، مہاراجہ چندو لال شاداں، شاہ کمال، میر شمس الدین محمد فیض، محمد صدیق قیس، شاہ نصیر دہلوی، میر احمد علی خاں، شہید، میر سجاد علی خاں سجاد، نواب میر عباس علی خاں کافی، میر عباس علی خاں احسان، خواجہ احسن اللہ بیان، شاہ تجلی علی تجلی، لچھمی نارائن شفیق وغیرہ کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے قدیم مخطوطات اور شعرا کے دیوانوں سے لطف کے معاصر شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے جمع کیے۔ ذیل میں مندرجہ بالا شعرا کے غزلوں کے نمونے کے طور پر ان کے نام کے ساتھ ان کا ایک شعر دیا جا رہا ہے تاکہ مرزا علی لطف کے معاصر شعرا کے کلام کا نمونہ معلوم ہو اور یہ بھی اندازہ ہو کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے معاصر شعرا کے موضوع کی تکمیل کے لیے کس جانفشانی سے تحقیق کا حق ادا کیا ہے:

شیر محمد خاں ایمان

رشک تیری دل ربائی کا زبس کھاتی ہے شمع
دیکھ تیرے تن کے شعلے کو جل جاتی ہے شمع

شیخ محمد حفیظ، حفیظ

دلِ جاناں سے جی اداس آیا
ہم کو آب بقانہ راس آیا

میر ذوالفقار علی، صفا لکھنوی

اے صفا کیوں نہ کلیجے کے پرخچے اڑ جائیں
پر خبردار اگر آنکھ سے آنسو نکلا

غلام مصطفیٰ سخن

دل اپنا صاف ہے اس سے وہ بدظن ہو تو بدظن ہو
وہ اپنا یارِ جانی ہے جو دشمن ہو تو دشمن ہو

میر سجاد علی خاں سجاد

ناصح مغز خراش تو عبث کرتا ہے
پند سننے کی ترے تاب کہاں ہے مجھ کو

نواب میر عباس علی خاں کافی

نہیں معلوم لگی کس کے جگر میں شمشیر
آج پھر باندھی ہے قاتل نے کمر میں شمشیر

میر عباس علی خاں احسان

نکل آیا وہ یوں خورشید تاباں
کہ مہ بدلی کے جیسے گھر سے نکلے

خواجہ احسن اللہ بیان

مجھے غم سے اِس واسطے پیار ہے
کہ مرے برے وقت کا یار ہے

شاہ تجلی علی، تجلی

دامن کا عکس کس کے پڑا ہے کہ آج تک
پھیلا رہا ہے سر لبِ جوئے یار ہاتھ

لچھمی نارائن شفیق

گلشن تری نگاہ سے مے خانہ بن گیا
نرگس کا پھول بادہ کا پیمانہ بن گیا (۳۰)

مرزا علی لطف کے معاصر شعرا کے غزلوں کے منتخب اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے شعرا میں دبستانِ دلی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیش تر شعرا شمالی ہند سے حیدر آباد دکن آئے تھے لہذا ان میں دبستان دلی کی خصوصیات جیسے داخلیت، سادگی، سوز و گداز وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ لطف کے معاصر شعرا کے مزاج کو دیکھنے اور آگے چل کر لطف کے کلام پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہو گا کہ لطف اپنے عہد کے شعرا سے کس حد تک متاثر تھے اور یہ کہ انھوں نے اپنے عہد کو کس حد تک متاثر کیا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے حالاتِ زندگی میں ان کی وفات کے ضمن میں لکھا کہ لطف کے تاریخ وفات کے سلسلے میں بھی تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لطف کا انتقال حیدر آباد میں ہوا تھا اور تذکرہ ان کا سنہ وفات ۱۸۱۲، ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۲ء تحریر کیا ہے۔ لطف کے حالاتِ زندگی میں جو مصدقہ تواریخ ملتی ہیں وہ خود لطف نے تذکرہ سے اخذ کردہ ہیں۔ لطف نے پیدائش کے زمانے کے مقابلے میں ان کی وفات کا زمانہ چوں کہ آگے کا زمانہ ہے لہذا ان کے سنہ وفات کا تعین ہونا تھا لیکن دکن میں چوں کہ اس وقت تک بھی شعرا کی حیات اور ان کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کا کوئی منصوبہ بند کام نہیں ہوا تھا لہذا ان کے سنہ وفات کے تعین میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو دشواری ہوئی۔ اس کے علاوہ لطف کے تلامذہ میں بھی کسی نے اپنے استاد کی سنہ وفات کو نہیں محفوظ رکھا۔

مرزا علی لطف کی حیات کے اہم پہلوؤں کو بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کی شخصیت اور ان کی سیرت کے بارے میں پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی ادیب یا شخصیت کی سیرت بیان کرنے کے سلسلے میں محقق کو غیر جانب داری کی تلقین کرتے ہوئے مشہور محقق گیان چند جین نے تحقیق کے دوران کسی شخصیت کی سیرت بیان کرنے کے چند اصول بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"شخصیت کی تعمیر میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ محقق کو زیرِ تحقیق ادیب کی شخصیت سو فی صدی سچ سچ پیش کرنی چاہیے۔ اس کی ذات کو بے داغ اور بے عیب بنا کر پیش کرنے کی کوشش ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ دراصل فاسق انسان کی شخصیت فرشتے سے زیادہ دل کش ہوتی

ہے۔ فن کار کو ولی یا درویش منش بنانا ضروری نہیں۔۔۔ تحقیق تو ہے ہی سچ کا سودا یہاں سوانح کا بیان ہو کہ شخصیت کا، ہر پہلو ہر واقعہ جیسا ہے بے کم و کاست بے رنگ آمیزی ویسے کا ویسا پیش کرنا ہے تاکہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے"۔ (۳۱)

مرزا علی لطف کی شخصیت اور سیرت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس عہد کے تذکرہ نگاروں شاہ کمال، غلام ہمدانی مصحفی اور ذوالفقار علی مست کے حوالے سے لکھا کہ لطف خوش فکر و خوش مزاج شریف انسان تھے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے لطف کی شخصیت اور ان کے اخلاق کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"آپ (لطف) خوش اخلاق و پسندیدہ شمائل و حمیدہ فضائل تھے سلیم الطبع و حلیم المزاج، ظریف و لطیف تھے۔ بذلہ سنجی ولطیفہ گوئی میں بے نظیر تھے۔ محفل کی زیب و زینت یاران ہم مشرب کو آپ کی صحبت میں لطف آتا تھا"۔ (۳۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی تذکرہ نگاروں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مرزا علی لطف کی سیرت و شخصیت کے مثبت پہلوؤں سے اتفاق کیا ہے۔ شخصیت کی سیرت سے متعلق پروفیسر گیان چند جین نے حقائق کے بیان سے متعلق جو باتیں کہی ہیں ان پر عمل اردو تحقیق میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ ایک شخص کے دنیا سے گزر جانے کے بعد لوگ اس کی برائیوں سے پردہ پوشی کر دیتے ہیں اور اس کی اچھائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی زندہ شخص کی سیرت کا بیان ہو تو قلم کار کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ شخصیت کی سیرت کے منفی پہلوؤں کو بے باکی سے بیان کرتے ہوئے اپنی تصنیف کو ردی کی ٹوکری کی نظر کرے لہذا اردو تحقیق میں اکثر شخصیت کے شب پہلو ہی بیان کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے سامنے ایک دشواری یہ بھی رہی ہوگی کہ جس شخصیت کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا تعین ہی نہ ہوسکا ہو اس کی شخصیت و سیرت کے پہلو کہاں سے ڈھونڈ لائیں۔ کیوں کہ پروفیسر گیان چند جین نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا کہ گزشتہ صدیوں کی شخصیتوں کے سیرت سے تعلق اتنا مواد نہیں ملتا کہ ایک باب کی تکمیل ہوسکے۔ بہ ہر حال پروفیسر مرزا اکبر علی

بیگ نے مرزا علی لطف کو ایک نیک صفت انسان کے طور پر پیش کیا ہے اور آگے لطف کے مذہبی عقیدے کی تفصیلات دے کر اپنے پہلے بیان کی تصدیق چاہی ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لطف کے مذہبی عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے اور لطف نے جا بجا اپنی شاعری میں شعیہ عقائد کو پیش کیا ہے۔ لطف کے کلام سے منتخبہ اشعار کو پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے مذہبی عقیدے کی گہرائی اور عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔

محبت شہ مرداں ہے شرطِ ایمان لطف
یہی ہے فرق مسلماں اور ہندو میں
ہے لطف علی قوت بازو کے ضعیفاں
ہر مور کھے کیوں نہ سلیماں سے گئے ہم
لطف تو اور آستانِ علی
واں ملائک جبیں رگڑتے ہیں (۳۳)

لطف کے شعیہ مذہب سے گہری وابستگی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"ان (لطف) کے والد کاظم بیگ خاں ہجری ایران سے ہندستان آئے تھے۔ ایران میں مذہب امامیہ کے ماننے والوں کی کثرت ہے۔ لطف کے آباد و اجداد بھی شعیہ ہی تھے۔ لطف کے اپنے عقائد کو کلام میں پیش کرنا ایک مذہبی فریضہ خیال کیا ہے۔ حضرت علی اور پنجتن پاک کی مدح اکثر جگہ پر انھوں نے کی ہے"۔ (۳۴)

مرزا علی لطف کی شخصیت اور ان کے مذہبی عقیدے کے بارے میں لکھنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے تلامذہ (شاگردوں) کے بارے میں لکھا ہے۔ لطف نے جس عہد میں شاعری کی تھی اس عہد میں ہر بڑے شاعر کے کثیر تعداد میں شاگرد ہوا کرتے تھے جو اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی شعری روایتوں کو فروغ دیتے تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بہ موجب لطف کا شمار بھی اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ ان

کے شاگرد شعرا میں میر غلام علی عشرت بریلوی مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ فرحت اللہ فرحت، محمد عسکری عیش، غلام ضامن کرم وغیرہ لطف کے شاگردوں میں تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مختلف تذکروں اور ادبی تواریخ سے لطف کے ان شاگردوں کے احوال اور ان کے کلام کے نمونے کو جمع کر کے پیش کیا ہے ذیل میں لطف کے تلامذہ شعرا کے نام کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے کے طور پر ایک شعر دیا جارہا ہے:

میر غلام علی عشرت بریلوی

مطلق نہیں ہے پرواہ سیر چمن کی عشرت
ہم داغِ دل کو اپنے گلزار جانتے ہیں

فرحت اللہ فرحت

یہ میری لوحِ تربت پر کھدانا
کسی سے کوئی دل کو مت لگانا

غلام ضامن کرم

کہیں ہیں دیکھ کے میری غزل کے شعر بلند
اسی زمین سے ہوتا ہے آسماں پیدا (۳۵)

مرزا علی لطف کے شاگرد شعرا کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بھی دہلوی رنگ چھایا ہوا تھا۔ داخلیت،جذبات،سوز و گداز، عشق کی کیفیت وغیرہ موضوعات ان شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔

لطف کے تلامذہ کے احوال پیش کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف نام کے دیگر شعرا کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے نمونہ کو پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان شعرا کے کلام کے نمونے اور لطف کے کلام کے نمونے میں فرق پایا جاتا ہے۔ کسی قدیم شاعر کے متن کی تدوین میں یہ مرحلہ سب سے اہم ہوتا ہے کہ ایک ہی تخلص کے کئی شعرا کا کلام سامنے آجائے تو محتاط انداز سے متنی تنقید کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیگر شعرا کے کلام کو زیرِ بحث شاعر کے کلام سے الگ کیا جائے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف

تخلص کے جو دیگر شعرا کے احوال اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے ان میں " باغ و بہار " کے لیے مشہور ہوئے میر امن ہیں جن کا تخلص لطف تھا۔ ان کے علاوہ لطف علی خاں لطف، میر لطف علی خاں لطف، لطف علی لطف، حفیظ اللہ لطف، لطف لکھنوی، لطف بریلوی، منشی لطف اللہ لطف، نواب محمد لطف الدین خاں لطف شامل ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان تمام شعرا کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے ذیل میں ان شعرا کے نام کے ساتھ ان کے کلام کے نمونہ کا ایک شعر دیا جارہا ہے:

میر امن لطف

ہزار حیف کہ دنیا نہیں وطن میرا
خطا نہیں جو مرے خونِ دل سے اشک کی بو

لطف علی خاں لطف

خانہ ء خانم زعم کر دی خراب
خوب کر دی خانہ ذات آباد باد

میر لطف علی خاں لطف

حاجت بہ فیضِ شعلہ ندارد چراغِ ما
روشن چولاز آتش خوشیں است داغِ ما

لطف علی لطف

وہ مزہ پایا ہے میں نے یار کی تلوار میں
سرگرائی اس نے میری دور کی اک وار میں

حفیظ اللہ لطف

وہ پڑھ کے سطر کون سی چیں بر جبیں نہیں
ہر چند خط میں حرف شکایت کہیں نہیں

لطف علی خاں لطف لکھنوی

حیف ہے اٹھ گئے کیا پیر و جوان دہلی
خاک باقی نہ رہا نام و نشاں دہلی

منشی لطف اللہ لطف

سرسبز بیاباں ہے تیرے دیدہ ء تر سے
یہ لطف تصدق ہیں تیری چشم تری کے

لطف علی لطف بریلوی

ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا
سرِ احمدؐ پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا

نواب محمد لطف الدین خاں لطف

ہم نشیں مونس و ہم دم مرے سب نام کے ہیں
میں وہ غم خوار ہوں میرا کوئی غم خوار نہیں (۳۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تحقیقی انداز اختیار کرتے ہوئے لطف نام و تخلص کے دیگر شعرا کی تفصیلات دی ہیں اور انھیں مرزا علی لطف کے نام اور کلام سے علاحدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ شاگردوں کا کلام استاد کے کلام میں مل جانا اور ایک ہی نام و تخلص کے ایک سے زیادہ شعرا کی موجودگی میں کلام خلط ملط ہونے کے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"بعض اوقات شاگردوں کا کلام استاد کے پاس رہ جاتا ہے اور شاگرد کے ساتھ ساتھ استاد کے مجموعے میں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کلیات سودا میں شاگردوں کی مثنویاں اور مرثیے شامل کر دیے گئے بعض اوقات دو ادیبوں کے تخلص یا نام کی یکسانی یا مماثلت کے سبب ایک کی چیز دوسرے کے نام سے منسوب ہو جاتی ہے۔۔۔ صحیح مصنف کا فیصلہ کرنے کے

لیے داخلی اور خارجی شہادتوں کا صحیح جائزہ لے کر تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کسی مصنف کی خصوصیات کا کسی تخلیق میں پایا جانا رہبری کر سکتا ہے۔۔۔ انسان مختلف ادوار میں نہ ایک طرح سوچتا ہے نہ ایک کام کرتا ہے اور مختلف ادوار ہی میں کیوں ایک ہی دور میں ایک ادیب کے ذہن میں مختلف شاذ متضاد دھارے بہتے ہیں شخصیت کوئی یک رنگ و یک رخی چیز نہیں۔ یہ بڑا ژوالیدہ بیابان ہے۔ اسلوب ہو یا موضوع یا نظریہ، کسی تخلیق کو کسی مصنف سے بالیقین منسوب کرنے یا بے دخل کرنے کی کوئی قطعی اور شافی شناخت نہیں۔ خارجی اور داخلی شہادتوں کو اپنی تحقیقی نظر کے سہارے پرکھیے اور دلیلوں کے ساتھ اپنا فیصلہ پیش کیجیے۔ ضروری نہیں کہ سب اس سے اتفاق کریں۔ تحقیق کی دنیا میں آمریت نہیں جمہوریت ہے"۔ (۳۷)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے شاگردوں اور ان کے ہم نام تخلص والے شعرا کی تفصیل ان کی حیات کے باب میں ہی دے دی اور ان کی شاعری کے باب کو تیسرے حصہ میں رکھا۔ اگر ان کی شاعری کا موازنہ ،ان کے شاگردوں کے کلام اور ان کے ہم تخلص شعرا کے کلام سے کیا جائے تو لطف کی علاحدہ شناخت میں مدد مل سکتی ہے۔ لطف کی حیات کے باب کی تکمیل کے بعد " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " تحقیقی کتاب کا دوسرا باب مرزا علی لطف کے کارنامے ہے۔ جس میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے بنیادی اور اہم کارنامہ ان کے تحریر کردہ تذکرہ " گلشنِ ہند " کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مرزا علی لطف چوں کہ اردو ادب کی تاریخ میں بنیادی طور پر اپنے تذکرے سے جانے جاتے ہیں لہٰذا ان کی شاعری سے قبل پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے تذکرے کا جائزہ لیا ہے۔ مصنف کے کارناموں اور ان کی تصانیف کے جائزے میں رہنمائی کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"تصانیف کا تعین کرنے کے بعد انھیں تاریخی ترتیب سے مرتب کیجیے تاکہ ادیب کا ذہنی اور فنی ارتقاء کھل کر سامنے آجائے۔۔۔ جن تخلیقات کی تاریخ کا پتہ نہ چل سکے ،ان کی پختگی ،اسلوب اور مواد کو دیکھ کر طے کیا جائے کہ وہ کس دور کی ہو سکتی ہیں"۔ (۳۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کے تذکرہ "گلشنِ ہند" کے جائزے سے قبل تذکرہ نگاری کے فن اور اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت سے متعلق اہم تفصیلات دی ہیں۔ جو "گلشنِ ہند" کے جائزے کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں۔ تذکرہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ تذکرہ نگاری اردو میں فارسی اور عربی کے اثر سے آتی ہے۔ عربی لغت میں تذکرہ کا معنی یاد کرنے کے ہیں۔ تذکرہ نگاری کی ابتدا "بیاض نویسی" سے ہوئی زمانہ ٔ قدیم میں جب کہ رسل و رسائل کے ذرائع محدود تھے عوام اور شائقین شعرا اپنے پسندیدہ شاعر یا شعرا کے کلام کو یکجا کرنے لگے۔ اسے "بیاض نویسی" کہا گیا۔ تذکرہ نگاری کے محرکات میں اول انسان کا یہ فطری جذبہ ہے کہ وہ اپنے بعد اپنی ایسی یادگار چھوڑ جانا چاہتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام باقی رہے۔ اس کے علاوہ لوگوں میں انتخاب اشعار اور بیاض نگاری کے ذوق کے سبب بھی تذکرہ نگاری کو تحریک ملی۔ معاصر شعرا کی چشمک سے بھی تذکرہ نگاری کو فروغ ہوا۔ شعرا میں گروہ بندی اور علاقائی تعصب کے سبب اپنے اپنے گروہ کے شعرا کے حالات یکجا کیے جانے لگے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا شاعرانہ ماحول بھی تذکرہ نگاری کا محرک بنا جب کہ شعر و شاعری عام بات تھی اور ہر کس و ناکس شاعر ہوا کرتا تھا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ تذکرہ نگاری کے بنیادی لوازم اور شرائط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"کسی اچھے اور معیاری تذکرے سے ہم یہ توقع رکھیں گے کہ وہ شاعروں کی حیات اور شخصیت کے بارے میں تشفی بخش معلومات مہیا کرے مثلاً یہ کہ جس کسی شاعر کا حال لکھا جا رہا ہے وہ کہاں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت کس طور پر اور کہاں ہوئی تھی۔ اس کے خصائل اور اخلاق و عادات کیسے تھے۔ شاعر کا ماحول اس کی صحبت اور اس کی زندگی کس طریقے سے گزری اس نے ادب کو اپنے دورِ حیات میں کیا کیا عطا کیا۔ شاعر کے دور میں سیاسی حالات کیا تھے۔ اس کا ذہنی ارتقاء کس شخصیت کے زیرِ اثر ہوا اس کے دور کے اخلاقی، مذہبی انقلابات کیا تھے۔ جس سے وہ متاثر ہوا۔ شاعر کے کلام میں اور اس کی حیات میں کیا محاسن معائب ہیں۔ اس کے معاصر کی رائے اس کے بارے میں کیا تھی۔ تذکرہ جس دور میں لکھا گیا اس زمانے میں کسی

زبان کے ادب کی تاریخ اور ملک کی ادبی تاریخ کا تصور یا وجود نہیں تھا"۔ (۳۹)

تذکرہ نگاری کی پرکھ کے لیے مندرجہ بالا اصول پیش کرنے کے باوجود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ اعتراف کیا کہ تذکرہ نگاری کی پرکھ کے یہ اصول حالیہ عرصہ میں اخذ کیے گئے ہیں جب کہ زمانہ ءقدیم میں چوں کہ تنقید پرکھ کے سائنٹفک اصول وضع نہیں کیے گئے تھے اور نہ ہی شعرا اور ادیبوں کے حالات جمع کرنے کا کوئی رواج تھا ایسے میں قدیم تذکروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تذکرے اردو ادب کی تاریخ کے اہم ماخذ ہیں۔

تذکرہ نگاری کی شرائط بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فارسی کے مشہور تذکروں کی ایک فہرست دی اور اس کے بعد اردو تذکروں کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا کہ اردو کے تذکرے فارسی طرز پر لکھے گئے اور ان میں جنوبی ہند کے بہت کم شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ کیوں کہ ایک عرصے تک شمالی ہند کے شعرا جنوب و دکن کے شعر و ادب سے ناواقف تھے۔ اردو کے پہلے تذکرے کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ میر کا تذکرہ نکات الشعرا (۱۷۸۱ء) اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مانا جاتا ہے اسی سال خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار" اور افضل بیگ قاقشاں اورنگ آبادی کا تذکرہ تحفۃ الشعرا بھی لکھا گیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تقریباً (۱۸) اردو تذکروں کی ایک فہرست دی ہے جس میں میر کے نکات الشعرا کے علاوہ، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو لچھمی نارائن شفیق کا چمنستانِ شعرا، علی ابراہیم خاں خلیل کا "گلزار ابراہیم" اور غلام ہمدانی مصحفی کا تذکرہ ہندی بھی شامل ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ یہ تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے اور تمام "گلشنِ ہند" سے قبل لکھے گئے۔ مرزا علی لطف نے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" سے استفادہ کرتے ہوئے بعض اضافوں کے ساتھ ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلشن ہند اردو میں تصنیف کیا اور خلیل کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

اڑ گئے کچھ حواس سے میرے

اٹھ گیا کون پاس سے میرے (۴۰)

"گلزارِ ابراہیم" کے ترجموں اور اس کے موازنہ کے سلسلے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ

لطف نے اپنا تذکرہ گلشنِ ہند ۱۸۰۱ء میں لکھا تھا۔ اس سے ایک سال قبل ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ منشی حیدر بخش حیدری نے " گلزارِ ابراہیم " کا ترجمہ و تلخیص " گلشنِ ہند " کے نام سے کی تھی۔ حیدری کے " گلشنِ ہند " میں " گلزارِ ابراہیم " کی معلومات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ملتی۔ صرف کہیں کہیں برائے نام کوئی تبدیلی یا اضافہ ملتا ہے جس سے یہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حیدری نے اپنے تذکرہ میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ ہو بہو " گلزارِ ابراہیم " کا ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے گلزارِ ابراہیم کا موازنہ حیدری کے گلشنِ ہند سے کرتے ہوئے تقریباً (۱۵) مثالیں دیں اور یہ ثابت کیا کہ حیدری نے اپنے ترجمے و تلخیص میں بہت کم تبدیلی کی ہے۔ احمد گجراتی کے احوال دونوں تذکروں میں اس طرح ملتے ہیں:

" گلزارِ ابراہیم "

۲۔ احمد۔ گجراتی معاصر ولی دکھنی بود۔ مہارت بزبان سنسکرت و بھاکا داشت و گاہے ریختہ می گفت۔ از وست احمد بتا میں کیا کروں اب راہ عشق میں سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے۔

" گلشنِ ہند "

۲۔ احمد۔ نام گجراتی معاصر ولی دکنی تھے۔ زبان سنسکرت اور برج بھاشا میں مہارت رکھتے تھے اور کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے تھے یہ ان سے ہے۔ احمد بتا تو کیا کروں اب راہِ عشق میں سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے۔ (۳۱)

تذکرہ گلشن ہند کے قلمی نسخوں کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ اس تذکرے کے بارہ (۱۲) قلمی نسخوں کا اب تک پتہ چلا ہے۔ ان میں سے چار نسخے انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان میں ہیں جب کہ بقیہ آٹھ نسخے ہندستان اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ہندستان میں یہ نسخے کتب خانہ سالار جنگ میوزیم (حیدر آباد)، اور ینٹل ریسرچ سنٹر (بمبئی) اور رضا لائبریری (لاہور) میں ہیں۔ جب کہ تین نسخے انگلینڈ کے لندن اور کیمبرج کے کتب خانوں میں اور ایک ایک نسخہ جرمنی اور فرانس میں ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے افسر صدیقی امروہوی اور سید سرفراز علی رضوی کے حوالے سے پاکستان میں موجود نسخوں کی

تفصیلات دی ہیں۔ تذکرہ، گلشن ہند کے مطبوعہ نسخے کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ تاحال اس کے دو نسخے شائع ہوئے ہیں پہلے نسخے کو عبداللہ خان نے ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ اس نسخے کی دست یابی کی دل چسپ داستان بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

" حیدر آباد دکن کی مشہور " موسیٰ ندی " میں ۱۹۰۸ء میں زبردست سیلاب آیا۔ اس سیلاب میں ہزاروں آدمی ہلاک اور عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ اسی سیلاب نے اپنے ساتھ کسی آفت زدہ کا ایک پورا کتب خانہ بھی بہا لایا جس میں یہ تذکرہ گلشن ہند بھی تھا۔ حسنِ اتفاق سے یہ تذکرہ مولوی غلام عمر مددگار کیبینٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھوں میں پہنچا۔ انھوں نے اس نایاب و کم یاب تذکرہ کو شمس العلماء شبلی نعمانی کو دکھایا۔ علامہ شبلی نے اس تذکرہ کو مطالعے کے بعد بہت پسند کیا۔ مولوی غلام محمد کی درخواست پر علامہ شبلی نعمانی نے اس تذکرے کو تصحیح و حواشی کے ساتھ ترتیب دیا۔ بعد ازاں عبداللہ خاں نے مولوی عبدالحق سے مقدمہ لکھوا کر اس کو ۱۹۰۶ء میں رفاہِ عام پریس ،لاہور سے چھپوا کر شائع کیا"۔ (۴۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ " گلشنِ ہند " کے اس مطبوعہ نسخے کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرزا علی لطف کے بشمول (۰) شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونہ ، کلام موجود ہے۔ شعرا کے حالاتِ زندگی قلمی نسخے کے مطابق ہیں۔ بعض مقامات پر کچھ رد و بدل کیا گیا ہے۔ جب کہ نمونہ ، کلام بہت زیادہ حذف کر دیا گیا ہے۔ ترتیب حروفِ تہجی میں ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ اٹھائیس برس بعد انجمن ترقی اردو نے شبلی کے مرتبہ گلشن ہند کے ساتھ گلزار ابراہیم کو ملا کر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے ترتیب دلا کر شائع کروایا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کے تذکرے کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لیے مرزا علی لطف کی کسی شاعر کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کا دوسرے تذکروں میں دی گئی معلومات سے تقابل کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سراج الدین علی خاں آرزو، شیخ محمد حاتم حاتم، مرزا مظہر جانِ جاناں ،مظہر ،میر تقی میر ،خواجہ میر درد ، مرزا محمد رفیع سودا ، محمد قیام الدین قائم ، میر حسن کے بارے میں

مختلف تذکروں میں تذکرہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات کا مرزا علی لطف کی فراہم کردہ معلومات سے تقابل کیا اور ہر شاعر کے مختلف تذکروں سے پیش کردہ حالات کے بعد تذکرہ نگاروں کی جانب سے کی گئی تبدیلی کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ موازنہ کے لیے انھوں نے میر تقی میر کے نکات الشعرا، سید فتح علی گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں، محمد قیام الدین قائم کے مخزنِ نکات، عنایت اللہ فتوت کے ریاضِ حسنی (قلمی) قیام الدین حیرت اکبر آبادی کے تذکرہ مقالات الشعرا، لچھمی نارائن شفیق کے چمنستانِ شعرا، قدرت اللہ شوق کے طبقات الشعرا، میر حسن کے تذکرہ شعرائے اردو اسد علی خاں تمنا کے گل عجائب، میر غلام حسین شورش کے تذکرہ شورش، ابوالحسن امیر الدین احمد کے مسرت افزا، مردان علی خاں مبتلا لکھنوی کے تذکرہ گلشن سخن، علی ابراہیم خاں خلیل (گلزارِ ابراہیم) غلام ہمدانی مصحفی کے عقد ثریا اور محمد وجہ الدین عشقی کے تذکرہ عشقی سے مرزا علی لطف کے گلشن ہند سے موازنہ کیا ہے۔ مرزا علی لطف کے تذکرے کے موازنہ کے لیے دو چار اہم تذکرہ نگاروں کے تذکرہ نگاروں سے موازنہ کافی تھا لیکن اتنے زیادہ تذکروں سے ایک ہی شاعر کے احوال جمع کرتے ہوئے گہرائی و گیرائی سے تحقیق کا ثبوت دیا ہے اور لطف کے تذکرہ کا موازنہ کرتے ہوئے دوسرے تذکروں کے مقابلے میں اس کے فنی محاسن بیان کرتے ہوئے اس کے مقام کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ لطف کے تذکرے کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "پیش رو تذکروں سے گلشن ہند کا جو موازنہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے اس سے لطف کے تذکرے کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ لطف نے محض گلزارِ ابراہیم کا ترجمہ نہیں کر دیا بلکہ اپنی تحقیق اور ذاتی معلومات کی بنا پر مختلف شعرا کے حالات میں قابلِ لحاظ اضافے بھی کیے ہیں... گلشن ہند کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ اردو شاعروں کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو اردو میں لکھا گیا ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ تذکرہ چند معمولی فروگزاشتوں کے قطع نظر مجموعی طور پر پیش رو تذکروں کے مقابلے میں زیادہ وقیع اور مستند ہے۔ اس تذکرے سے شعرا کے حالات کے علاوہ بعض

تاریخی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس دور کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

اردو میں تنقید کے اولین اور ابتدائی نمونے تذکروں ہی میں ملتے ہیں گلشنِ ہند میں نہ صرف شعرا کے حالات یکجا کر دیے گئے ہیں بلکہ ان پر تنقیدی آراء کا اظہار کرتے ہوئے ان کے مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔۔۔ تذکرے میں جا بجا ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف کے مزاج میں کسی قسم کا تعصب نہ تھا"۔ (۴۳)

لطف کے تذکرے کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کتاب کے بارے میں مشاہیر ادب کی آراء بھی جمع کر دی ہے۔

مولوی عبدالحق لطف کے تذکرے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا اور جو لوگ اردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے"۔ (۴۴)

مولوی عبدالحق کے علاوہ لطف کے تذکرے کے بارے میں حسرت موہانی، سید سلیمان ندوی، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر جاوید نہال، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی اور ڈاکٹر سلام سندیلوی کی ناقدانہ رائے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مختلف کتابوں سے جمع کرتے ہوئے لطف کے ادبی مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

"گلشنِ ہند" کے اسلوب کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"لطف کا تذکرہ "گلشنِ ہند" اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے بانی ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ایما پر لکھا گیا۔ لیکن اس میں ایسی زبان اور اسلوب بیان نہیں ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی خصوصیت ہے۔ اس کے برعکس لطف نے اپنے دور کے عام ادبی رجحانات کو پیش نظر رکھتے

ہوئے رنگین اور مقفی زبان استعمال کی ہے۔۔۔ گلشنِ ہند میں انھوں نے جو زبان اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑی حد تک اپنے دور کی عام روش کے مطابق ہے "۔ (۴۵)

لطف کی مقفی و مسجع زبان کی ایک مثال پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے دی ہے تاکہ ان کے اسلوب کا اندازہ ہو سکے۔ لطف لکھتے ہیں:

"تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں "سبحان اللہ" اور لفظ فارسی کی جگہ پادے تو ایسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ"۔ امید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور مقبول نگاہ خاص و عام ہو"۔ (۴۶)

لطف کے اسلوب کی جزئیات کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تحقیقی کاوش "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" کا تقریباً ۱۱۴ صفحات پر مشتمل لطف کی تذکرہ نگاری کا یہ باب ختم کیا۔ اس باب میں لطف کے کارنامے کے ضمن میں انھوں نے لطف کی تذکرہ نگاری کے جائزے کے ساتھ اس عہد کے اہم تذکروں سے متعلق اہم مواد اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ تذکرہ نگاری کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کے لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ تحقیقی کاوش ضرور مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے تحقیقی کام سے قدیم دور کے ایک اہم کارنامہ کو پیش کر کے بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

مرزا علی لطف کے کارناموں کے جائزے میں ان کی تذکرہ نگاری کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ مرزا علی لطف اپنے دور کے ایک استاد شاعر تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا تھا کہ دورانِ قیام حیدرآباد ان کی شاعری کا چرچا تھا اور ان کے کئی شاگرد بھی تھے۔ لطف کے دیوان کے سلسلے میں معلومات بہم پہنچاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کے تین نسخوں کا پتہ چلا ہے ان میں بھی صرف کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں موجود نسخہ ہی باقی رہا۔ جب کہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مجلس تحقیقاتِ اردو حیدرآباد دکن میں جس دوسرے نسخے کی موجودگی کی اطلاع دی وہ نسخہ ادارہ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی نہ رہا اور تیسرا نسخہ جس کی اطلاع پروفیسر سید محمد نے پہنچائی تھی

کہ یہ مولوی غلام محمد صاحب وفا مالک تاج پریس حیدر آباد کے ہاں ہے وہ بھی دست یاب نہیں ہوسکا۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کتب خانہ جامعہ ۔ عثمانیہ کے مخزونہ دیوان لطف کے نسخے سے استفادہ کرتے ہوئے لطف کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

دیوانِ لطف کے نسخے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ دیوانِ لطف کا دست یاب نسخہ کمل مخطوطہ ہے۔ پہلے صفحہ پر "دیوانِ منتخب مرزا علی خاں لطف" لکھا ہوا ہے۔ مخطوطہ کا داخلہ نمبر (۱۲۱) ہے۔ سائز "۱۰ ۱/۲/ ۵" ہے۔ ہر صفحہ پر سطور ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان ہیں۔ خط نستعلیق شکستہ ہے جگہ جگہ کرم خوردہ ہے۔ یہ مخطوطہ مرزا علی لطف کی غزلیات قصائد اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس کے اوراق ۲۴ اور صفحات ۴۸ کے درمیان ہیں۔ سرورق پر کسی نے "دیوانِ لطف از مرزا علی خاں لطف" لکھ دیا ہے۔ پہلے صفحہ پر فاضل بیگ ولد صفدر بیگ کی مہر ہے۔ جس پر سنہ ۱۲۵۹ھ بھی کندہ کیا ہوا ہے۔ یہ مخطوطہ ہاتھ سے تیار کیے ہوئے کاغذ پر تحریر کیا گیا ہے۔ سنہ کتابت نہیں دیا گیا۔ صرف مہر سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۵۹ھ کو یہ فاضل بیگ والد صفدر بیگ کی ملکیت بنا۔ مخطوطے کے آغاز سے پہلے "رب یسر بسم اللہ الرحیم و تمم بالخیر" لکھا ہے۔ اس کے نیچے اس شعر سے نسخے کا آغاز ہوتا ہے:

زیبِ لوحِ عرش ہے مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پُر سادہ و پُر کار مصرع آہ کا

مخطوطہ کا اختتام لطف کے اس شعر پر ہوا:

گلشنِ اقبال تیرا نت رہے با آب و رنگ
دہر کا شاداب و خرم جب تلک گلزار ہے

نسخے کے اختتام پر بھی فاضل بیگ ولد صفدر بیگ سنہ ۱۲۵۹ھ کی مہر ہے۔ دیوانِ لطف میں شامل کلام کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ لطف کے قلمی نسخے میں ۳، غزلیات ہیں۔ اشعار کی تعداد ۱،۴ ہے۔ متفرق اشعار ۱۰ ہیں ۹۰ رباعیات ہیں، پانچ قصائد ہیں جن میں کل ۲۷۷ اشعار ہیں۔ اس

طرح دیوان میں کل ۵۸، اشعار ہیں۔ اس میں لطف کی مثنوی شامل نہیں ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ایک رباعی اور چند اشعار ایسے پیش کیے ہیں جو لطف کے ہیں یہ اشعار تذکروں سے لیے گئے اور یہ اس دیوان میں موجود نہیں۔ رباعی اس طرح ہے:

جو کوئی کہ آفت نہانی مانگے
اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلادے اسے تو اپنی شمشیر نگاہ
جس کا مارا کبھی پانی نہ مانگے (۴۷)

اور متفرق اشعار میں سے ایک شعر یوں ہے:

لطف یہ شعر کہا جس نے عجب شاعر تھا
جس کے سننے سے ہوئے ٹکڑے ہزاروں دل کے (۴۸)

مرزا علی لطف کی غزل گوئی کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ لطف کی غزل میں دبستانِ دلی کی داخلیت سادگی، پرکاری، گہرائی و گیرائی سوز و گداز درد اور تڑپ بھی موجود ہے اور دبستانِ لکھنوکی خارجیت صنعت گری اور رعایت لفظی موجود ہے۔ لطف نے چوں کہ دلی کے بعد کچھ عرصہ لکھنو میں بھی قیام کیا تھا لہذا ان کی شاعری میں رجحانات کی دو رنگی پائی جاتی ہے۔ قیام دلی کے دوران لطف نے میر کا اثر قبول کیا تھا۔ اس لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"دلی میں وہ جب تک رہے میر اور سودا کو وہ اپنا امام سمجھتے رہے غالباً اسی لیے اس دور کی غزلوں میں میر کی سادگی اور سودا کا بانکپن ملتا ہے۔ بحروں کے انتخاب اور زبان و انداز بیان میں بھی میر کے مقلد نظر آتے ہیں۔ بعض اشعار میں جو سہل ممتنع قسم کے ہیں۔ میر سے بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے"۔ (۴۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے کلام سے پانچ اشعار منتخب کیے اور ان کا موازنہ میر کے اشعار

سے کرتے ہوئے موضوع اور انداز بیان میں لطف کی میر سے یکسانیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں ایک شعر کو بہ طور مثال پیش کیا جارہا ہے۔

میر :

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

لطف :

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع سان سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا (۵۰)

اس کے علاوہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے کلام کی چند ایسی لفظیات کا بھی انتخاب کیا ہے جو غالب کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان میں "سادہ و پرکار واشد ، باغ ، سرو ، وغیرہ۔ انھوں نے لکھا کہ جس طرح غالب نئی نئی ترکیبیں شاعری کے ذریعہ ایجاد کرتے تھے اسی طرح لطف نے بھی نئی ترکیبوں میں اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

لطف کے لکھنو پہنچنے کے بعد ان کی شاعری کے مزاج میں آئی تبدیلی کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ جس طرح لکھنوی معاشرت ، عورت ، موسیقی ، شاعری سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی اور اہلِ لکھنو کی شراکتِ طبع کا بھی شاعری اور موسیقی پر خاصا اثر پڑا تھا۔ اب غزل میں عورت محبوب کا تصور واضح طور پر ابھرتا ہے اور شاعری میں اس کے خد و خال اور صفات کو پیش کرنا ہی فن کا کمال سمجھا جانے لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صحت زبان ، روزہ مرہ ، محاوروں کی بندش ، الفاظ کی در و بست و چستی ، نئی ترکیبوں ، تشبیہوں و استعاروں کا استعمال (ایہام کا نئے طریقہ سے استعمال اور شاعری کو صنعت گری اور رعایت لفظی تک محدود کر دینا دبستانِ لکھنو کی یہ تمام خصوصیات جہاں لکھنوی تہذیب اور شعر و شاعری کی آئینہ دار ہیں۔ وہیں یہ روایتی رنگ لطف کی غزلوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ شاعری میں پائی جانے والی خارجیت کی مثال لطف کے ہاں بھی ملتی ہے۔

کر اہلِ وفا کے قتل پر جو دل ربا باندھے

جو کوئی کیا اس وفا دشمن سے پھر عہد وفا باندھے (۵۱)

دبستانِ لکھنو کے شعرا کی ایک عام روش سنگلاخ زمین میں طبع آزمائی کرنا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مثال دیتے ہوئے لکھا کہ لطف نے سنگلاخ زمین میں بھی اچھے شعر نکالے ہیں۔ ایک مژگان آستین، دامانِ آستین جیسے مشکل قوافی و ردیف میں سے ایک شعر بہ طور مثال دیا جا رہا ہے۔

کیا جانے لائی باغ میں کس گل کی بو ہمیں

رشک چمن تھا ورنہ یہ دامانِ آستین

اس کے علاوہ لطف کی شاعری میں موجود رعایت لفظی، سراپا نگاری، تشبیہ و استعارے، تلمیحات وغیرہ کو اشعار کے انتخاب کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے واضح کیا ہے اور لکھا کہ لطف نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں اور دو غزلہ سہ غزلہ کہنے کے دوران اپنی قادر البیانی اور استادانہ حیثیت برقرار رکھی ہے۔

لطف کی غزلوں میں پائے جانے والے تصور عشق کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ لطف کی غزلیں کیفیاتِ حسن و عشق سے معمور ہیں۔ ان کے عشق میں بڑا ہی ضبط و تحمل اور ٹھہراؤ ملتا ہے ان کا عشق مشرق کا روایتی عشق ہونے کے باوجود شکوہ طرازیوں کو پسند نہیں کرتا اس میں والہانہ انداز ہے سپردگی ہے اور ساتھ ہی ایک قسم کا شرم و حجاب بھی ہے۔ وہ زبان پر محبت کا نام بھی لانا پسند نہیں کرتے صرف رمز و اشارے سے کام لینا چاہتے ہیں:

اے اہلِ محبت یہاں بھولے سے بھی ہرگز

لینا نہ خبردار کبھی نامِ محبت (۵۲)

لطف کے نزدیک عشق و حال کا نام نہیں ہے بلکہ ہجر و فراق کی کیفیت کو وہ عشق سمجھتے ہیں۔ عشق کی آگ میں جلتے رہنا نقطہ، معراجِ عشق ہے لطف کے نزدیک عشق زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی اس جذبے سے عاری ہو تو وہ ہر دو عالم سے بے گانہ ہے اور جو دل لذتِ عشق سے آشنا ہے وہ گویا لذت صد عالم سے بہرہ ور

ہو گیا۔ لطف کے کلام میں عشقِ مجازی کے تصور سے عشق حقیقی کا تصور ابھرتا ہے اور اس جگہ وہ مسائل معرفت چھیڑ دیتے ہیں۔ جذبہ عشق میں ڈوبے لطف کے اشعار کے انتخاب سے چند شعر پیش ہیں:

پروانہ سے شب کہتی تھی باسوزِ جگر شمع
لے لے کے مزا جل ذرا اے خامِ محبت
غرورِ حسن وہ آفت حیائے عشق پہ قہر
غضب ہوا وہ اگر یوں ہی محوِ ناز رہا
یہ راہِ عشق ہے ناداں لباس اس کا عریانی ہے
پکڑتا برق کا دامن یہاں خارِ مغیلاں ہے (۵۳)

عشق کے علاوہ تصوف بھی اردو غزل کا اہم موضوع رہا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی لطف کے کلام میں تصوف کے پہلو ڈھونڈ نکالے ہیں۔ لطف کے نظریہ تصوف کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ لطف کا تصوف باقاعدہ فلسفے کی شکل میں نہیں ہے اس لیے اس میں ان رموز و نکات کی تشریح نہیں ملتی جو راہِ سلوک کے منازل سے مخصوص ہیں اور نہ ہی وحدت الشہود اور وحدت الوجود کا کوئی مسلک ملتا ہے۔ بلکہ وہ سیدھے سادھے انداز میں اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جو چشمِ بینا سے نظر نہیں آتی۔ مگر اس کے باوجود ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ لطف کے تصوف میں ڈوبے چند اشعار جو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جمع کیے ہیں کچھ اس طرح ہیں:

دیر و کعبہ شیخ وراہب کو مبارک ہوئے لطف
بندہ ، درگاہ بندہ ہے دلِ آگاہ کا
آہ کیدھر کو چلے جاتے ہو تنہا
ہمرہو ہم بھی مسافر ہیں اسی منزل کے
کتنے مغرور ہو عبادت پر

شیخ صاحب تمھیں خدا سمجھے (۵۴)

عشق و تصوف کے علاوہ غزل میں رمزیت اور محاورے روزمرے اور رعایت لفظی بھی پائی جاتی ہے۔ لطف کی غزلوں میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے شاعری کے ان عناصر کی تلاش بھی کی ہے۔ ایہام کی مثال اس طرح ہے:

اے خضرِ راہِ گم شدگان وقتِ لطف ہے
آگے گئے ہیں یار میں پیچھے ہوں رہ گیا (۵۵)

اس شعر میں پہلے مصرعے میں لطف شاعر کا تخلص بھی ہے اور کرم کرنے کے معنوں میں بھی۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

مبالغہ کی مثال اس طرح ہے

لچکتی ہے کمر اس نازنین کی
کرے گر رشتہ ء جاں سے کمر بند (۵۶)

مرزا علی لطف کے ہاں لکھنوی رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بہ موجب لطف کے کلام میں سوقیانہ پن نہیں ملتا۔ ان کے کلام میں دو ایک اشعار ایسے ہیں جن پر ابتدال کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔ ایک شعر یوں ہے:

اپنا تو بدگمانی میں بس کام ہوگیا
گو اور طرح اس کی ہو چولی مسک گئی (۵۷)

لطف کی شاعری میں خمریات کے مضامین تلاش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں یہ مضامین کم ہیں۔ لیکن جو بھی ہیں وہ طنز کی بھرپور نشتریت رکھتے ہیں مثلاً:

چھلکتا عمر کا ایک دم میں پیمانہ ہے اے ساقی
وفا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو (۵۸)

لطف کی غزل گوئی کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لینے کے بعد لطف کی غزل گوئی پر عمومی تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"اگر لطف کے اکثر کلام کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حرف و معنی کے ربط کا شعور و احساس بھی رکھتے تھے۔ اس ربط کو ظاہر کرنے میں لطف نے بڑے سلیقے اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں ندرت نہ سہی لیکن زبان کی صفائی اور الفاظ کی بندش میں ایک خاص دل کشی اور جاذبیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے معنی کے اظہار میں الفاظ کی رعایت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور بعض جگہ انتہائی سہل ترکیبیں وضع کی ہیں۔ لطف کی زبان پر جہاں دلی کی چھاپ نظر آتی ہے وہیں اس میں لکھنوی رنگ بھی جا بجا جھلکتا ہے۔ ان کا وہ کلام جو میر کے رنگ میں ہے زبانِ دلی کی نمائندگی کرتا ہے۔۔۔ بہ حیثیتِ مجموعی لطف کا تغزل بہ یک وقت دو دبستانوں کا نمائندہ ہے اور اس میں وہ ساری خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں جو دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنو کے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں۔ اگر لطف کی غزل کو دو تہذیبوں کا سنگم قرار دیا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا"۔ (۵۹)

مرزا علی لطف کی غزل گوئی پر مبسوط جائزے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کی غزلوں کا ایک اچھا خاصا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ تاکہ اشعار کے مطالعہ سے لطف کی غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ حاصل کیا جا سکے۔ مرزا علی لطف کے کلام کے تعارف اور جائزے کے دوران پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے غیر جانب داری سے ایک اچھے محقق کے علاوہ ایک اچھے مبصر اور نقاد کے فرائض انجام دیے اور لطف کے کلام کی تشریح میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ اس جائزے میں ان کا تحقیقی مزاج لطف کے دیوان کے نسخے کی تفصیلات بتانے میں دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ان کا تنقیدی مزاج لطف کے کلام کے میر سے تقابل کے دوران اور محاسن و مصائب کی کھوج کے دوران دکھائی دیتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کو بہ حیثیت ایک اچھے غزل گو شاعر پیش کرنے کے بعد

انھیں بہ حیثیت قصیدہ نگار پیش کیا ہے اور لکھا کہ مرزا علی لطف قیام حیدرآباد کے دوران نواب ارسطو جاہ اور میر عالم کے درباروں سے وابستگی کے سبب قصیدہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ لطف نے کل پانچ قصائد لکھے ہیں۔ چار قصائد میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے وزیر اعظم کی مدح میں اور ایک قصیدہ میر عالم کی مدح میں ہے لطف کے یہ قصائد گلشنِ ہند کے قلمی نسخوں اور مخطوطہ دیوان لطف میں پائے گئے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے قصیدے میں پائے جانے والے مختلف لوازم جیسے تشبیب، گریز، مدح، گھوڑے اور ممد تلوار کی تعریف، مدعا، دعا وغیرہ کا جائزہ ان قصائد میں پیش کردہ موضوعات کے ساتھ کیا ہے۔ عمومی انداز میں قصائد کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے قصیدوں کا غالب یا ذوق کے قصائد سے تقابل کیا گیا ہے۔ صرف تعارفی انداز میں ان کے پانچ قصائد کا جائزہ لیا گیا ہے۔

لطف کی مثنوی نگاری کے عنوان سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ مرزا علی لطف نے اپنے قیام لکھنو کے زمانے میں ایک مثنوی "مثنوی نیرنگِ عشق" لکھی اس مثنوی کا ذکر سب سے پہلے ان کے ہم عصر شاعر قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا (۱۷۷۵ء) میں کیا۔ پروفیسر ثمینہ شوکت نے اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔شمالی ہند کی اولین مختصر مثنوی میں سے ہے۔" (۶۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ مثنوی "نیرنگ عشق" کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ہے۔ اس کے علاوہ کئی نسخے ہندستان، پاکستان، برطانیہ، جرمنی اور فرانس کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ مثنوی کے قصے کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ اس میں ایک ایسے نوجوان کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو صبح و شام عشق کے سبب آہیں بھرتا رہتا تھا۔ جب کوئی حسنِ ناز نین نظر آتی تو اس کی عشق کی کیفیت مزید بڑھ جاتی اور اس کی آہیں تیز ہو جاتیں اس کی یہ کیفیت دیکھ کر لوگوں کا چین و سکون برباد ہو جاتا چناں چہ اسے شہر بدر کر دیا جاتا۔ نوجوان ایک باغ میں قیام کرتا ہے۔ جہاں ایک درویش کا کنواں ہے لوگ وہاں پانی پینے آتے ہیں ایک دفعہ ایک شہزادی وہاں پانی پینے آتی ہے نوجوان اسے دیکھتے ہی پھر عشق میں تڑپ اٹھتا ہے۔ شہزادی کے قافلے کے پیچھے جاتا ہے۔لیکن شہزادی اس کی طرف دھیان نہیں دیتی۔ حکم

کے مطابق سپاہی نوجوان کو شہر میں داخل ہونے نہیں دیتے۔ یہ درخت پر چڑھ کر جاتی ہوئی شہزادی کو دیکھتا رہتا ہے اور خواب و خیال میں درخت سے گر کر مر جاتا ہے۔ درویش اس کی تدفین کرتا ہے۔ محل پہنچنے کے بعد شہزادی کو نوجوان کا خیال آتا ہے اور وہ نوجوان کے لیے بے قرار ہو کر محل سے باہر نکل آتی ہے۔ نوجوان کو ڈھونڈتی ہوئی باغ کے کنویں تک آتی ہے، درویش نوجوان کا انجام سنا کر اسے قبر تک لے آتا ہے، جب شہزادی اپنے عاشق کے لیے رونے لگتی ہے اور وہیں گر کر دم توڑ دیتی ہے اچانک مزار شق ہو جاتی ہے۔ نوجوان اور شہزادی ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور مزار برابر ہو جاتی ہے۔ شہزادی کے ماں باپ قبر کھلوا کر دونوں کے عشق حقیقی کا نظارہ کرتے ہیں اور مرنے کے بعد عاشق و معشوق کے وصال کو خراج پیش کرتے ہوئے انھیں ویسا ہی ایک قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔ اس طرح "نیرنگ عشق" میں لطف نے ایک عشقیہ داستان بیان کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے قصہ کے ماخذ کے بارے میں مختلف نقادوں کی آراء کو پیش کرتے ہوئے لکھا کہ یہ پنجابی یا فارسی روایت سے ماخوذ ہے اور اسی قصے کی بنیاد پر قائم نے اپنی مثنوی "جذبِ الفت" لکھی تھی۔ لطف نے قائم کی مثنوی یا قصے سے کس حد تک اضافہ کیا اس کے بارے میں محققین کی آرا، کو پیش کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ:

> "لطف اور قائم کی مثنویوں کے قصوں میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قائم کی مثنوی لطف کی نظر سے گزر چکی تھی۔۔۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ انھوں نے قائم کی مثنوی سے استفادہ کیا ہو"۔ (۶۱)

لطف اور قائم کی مثنویوں میں مماثلت تلاش کرنے کے لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مثنوی کے مختلف واقعات کا تقابلی موازنہ کیا ہے جیسے لطف قائم

جو مسافر شہر سے جاتا کہیں　　　مسافر جو کوئی ادس راہ آتا
کوئی ساعت استراحت کیجیے　　　کیا ان نے ہوا کھانے کا آہنگ (۶۲)

مثنوی کے فنی لوازم کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمے، تشبیہات اور رعایت لفظی وغیرہ کی تفصیلات

لطف کی مثنوی سے منتخب کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس مثنوی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

اپنے تحقیقی مقالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" کے آخر میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کی رباعیات کا جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ ان کے دست یاب کلام میں چھ اردو رباعیاں ملتی ہیں۔ دیوانِ لطف میں پانچ رباعیاں ہیں لطف کی تمام رباعیات ایجاز و اختصار کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔۔۔ لطف نے اپنی رباعی کے تین مصرعوں کو پس منظر قرار دیتے ہوئے چوتھے مصرعے میں اصل تصویر پیش کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر رباعی کا چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہے لطف کی ایک رباعی اس طرح ہے:

جو کوئی کہ آفت نہانی مانگے　　　اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے

دکھلادے اسے تو اپنی شمشیر نگاہ　　　جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے (۶۳)

لطف کی رباعی گوئی کے علاوہ ان کی تاریخ گوئی اور ان کے فارسی کلام پر بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مختصراً جائزہ لیا ہے اور کتابیات کے باب کے ساتھ ۳۴۶ صفحات پر مشتمل ان کی اس تحقیقی کاوش کا اختتام عمل میں آتا ہے۔ کتابیات کے ضمن میں انھوں نے قدیم و جدید تقریباً ۸۰ کتابوں، رسائل، اخبارات اور مخطوطات سے استفادہ کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے اس تحقیقی کاوش کے دوران پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے گہرے اور وسیع تر مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس تحقیقی کاوش کی اشاعت پر بہت سے نقادوں اور ماہرین اردو ادب نے اس کتاب پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اور انھیں مبارک باد دی ہے۔ ان میں پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر عتیق احمد صدیقی شامل ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف پر مشاہیر ادب کی یہ آراء ان کی تحقیقی و سوانحی کتاب محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے اور نظیر شناسی مرتبہ بہ اشتراک ڈاکٹر محمد علی اثر میں شامل ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تحقیق کے لیے مرزا علی لطف حیات اور کارنامے کا جو موضوع منتخب کیا وہ تحقیق کے طالبِ علموں کے لیے اندھیرے میں امید کی کرن سے کچھ زیادہ نہیں تھا چناں چہ اس موضوع پر مواد کی تلاش میں پیش آنے والی دشواریوں کا اندازہ کرتے ہوئے مرزا ظفرالحسن لکھتے ہیں:

"آپ نے ایک ایسی شخصیت پر مقالہ لکھا اور کتابی صورت میں شائع کیا جس کے نام سے نئی نسل تو خیر کیا واقف ہوگی، ہماری پشت کے لوگ بھی جنھیں تحقیق کا چسکہ نہیں یا اس نوع کے اسلاف کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کرتے لطف کے نام تک سے ناآشنا ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ موضوع کا انتخاب کیا ہوگا اور مواد کی تلاش میں بھی آپ کو مشکل پیش آئی ہوگی آپ نے نہ ہمت ہاری ہوگی اور نہ مایوس ہوئے ہوں گے... میں اس کتاب کو ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں"۔ (۶۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس تحقیقی کاوش پر بہ یک وقت نظر ڈالیں تو اس سے ہمیں مرزا علی لطف کی حیات، ان کی تذکرہ نگاری اور ان کی شاعری کے بارے میں سیر حاصل معلومات مل جاتی ہیں۔ ایک ایسے زمانے کے شاعر وادیب کے حالات جمع کرنا جب کہ اس وقت طباعت نہ ہونے کی وجہ سے اخبارات ورسائل شائع نہیں ہوتے تھے اور انفرادی معلومات کی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا اور اس وقت کے مخطوطوں کی آج کے زمانے میں کرم خوردہ کیفیت کے پیشِ نظر لطف کی حیات کی کڑیاں ملاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اصابت رائے کے ساتھ معلومات کو اکٹھا کیا ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی کتاب تحقیق کا فن میں ایک اچھے محقق میں جن اوصاف کو بیان کیا ہے کہ ایک محقق کو حق تو ہونا چاہیے۔ وہ بے تعصبی اور غیر جانب داری سے تحقیق کا کام کرے اس میں ہٹ دھرمی نہ ہو۔ کسی دنیوی فائدے کی تلاش نہ کرے اعتدال پسندی کے ساتھ ڈٹ کر محنت کرنے والا ہو، نامعلوم کو معلوم کرنے کی کرید ہو اور ادب کے بارے میں وسیع تر معلومات ہوں۔ ان صفات کو اگر کسوٹی مانا جائے تو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ میں بہ حیثیت محقق یہ تمام خوبیاں کم یا زیادہ ضرور پائی جاتی ہیں۔ لطف کے حالات کی

چھان بین اور بہت سے موجود معلومات میں صحیح معلومات اخذ کرنے میں انھوں نے غیر جانب داری کے ساتھ تحقیقی نقطہ ٔ نظر سے معلومات کو پیش کیا ہے۔ ایک محقق کو ایک اچھا نقاد بھی ہونا چاہیے تاکہ وہ تحقیقی مواد کو تنقیدی نقطہ ٔ نظر سے پیش کرسکے۔ لطف کے تذکرہ گلشن ہند کا تقابل دوسرے تذکروں سے کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تقابلی تنقید سے کام لیا ہے۔ اسی طرح لطف کی مثنوی کا قائم کی مثنوی سے تقابل کرتے ہوئے بھی انھوں نے تقابلی تنقید کو برتا ہے۔ اس کے علاوہ لطف کی غزل گوئی میں عشق، تصوف، داخلیت اور خارجیت، رعایت لفظی کی تلاش میں انھوں نے محقق کے ساتھ ایک غیر جانب دار نقاد کا رول ادا کیا ہے۔ ایک تحقیقی مقالے کی زبان اگر سادہ اور رواں ہو تو قاری کے لیے مطالعے میں آسانی اور دل چسپی کا باعث بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں لطف کے اسلوب نگارش کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اکبر صاحب شستہ اور رواں زبان لکھتے ہیں۔ اندازِ بیان محتاط اور وقیع ہے۔ جس میں علمی شان جھلکتی ہے"۔ (۶۵)

"مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا اسلوب سادگی کے ساتھ پرکاری لیے ہوئے ہے بعض جگہ حوالوں کی کثرت تحریر کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ لیکن تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور دست یاب معلومات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ منجملہ ان تمام امور کے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ تحقیقی کارنامہ اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور اردو میں تذکرہ نگاری کے ضمن میں جب بھی اردو تنقید کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیا جائے گا۔ "گلشنِ ہند" کے تذکرے کے ساتھ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اس تحقیقی کارنامے کو بھی ضرور یاد کیا جائے گا۔ اس کتاب کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک نامور محقق کے طور پر ابھر کر آئے ہیں۔

○●○

حوالے :

۱ ڈاکٹر سید عبداللہ مضمون "تحقیق و تنقید" مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق مرتب ڈاکٹر عبدالستار دلوی

(بمبئی ۱۹۸۴ء)، ص: ۱۱۷

۲ قاضی عبدالودود مضمون "اصول تحقیق" مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق ص: ۷۷

۳ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" ص: ۷

۴ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اردو تنقید اصول و نظریات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۱ء، ص: ۳۲۲

۵ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اردو تنقید اصول و نظریات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۱ء، ص: ۳۲۲

۶ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ اردو میں تنقید ص: ۱۲۵

۷ ڈاکٹر شارب ردولوی "جدید اردو تنقید اصول و نظریات" ص: ۳۲۴، ۳۲۵

۸ ڈاکٹر شارب ردولوی "جدید اردو تنقید اصول و نظریات" ص: ۳۲۹

۹ ڈاکٹر غلام عمر خاں "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، گردپوش

۱۰ پروفیسر گوپی چند نارنگ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" از ۱۹۷۹ء حیدر آباد

۱۱ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" از مرزا اکبر علی بیگ ص۱۷:

۱۲ پروفیسر مغنی تبسم "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" از پروفیسر اکبر علی بیگ ص: ۲۔۳۔۴

۱۳ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۹۰ء ص: ۳۵۴

۱۴ ٹی ایس ایلیٹ۔ ایلیٹ کے مضامین۔ مترجم جمیل جالبی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی، طبع چہارم ۱۹۷۸ء، ص: ۱۸۵

۱۵ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" ص: ۳۵۴

۱۶ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" ص: ۲۵۵

۱۷ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ص: ۱

۱۸ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۵

۱۹ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" ص: ۳۶۲۔۳۶۳

۲۰ پروفیسر ثمینہ شوکت۔ حیات لطف۔ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۱۲

۲۱ پروفیسر گیان چند جین تحقیق کا فن ص: ۳۶۸، ۳۶۹

۲۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۱۴

۲۳ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۱۹

۲۴ مرزا علی لطف۔ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۲۳۔۲۴

۲۵ پروفیسر سید محمد بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۲۸

۲۶ پروفیسر مرزا اکبر علی لطف "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۳۵۔۳۶

۲۷ مرزا علی لطف۔ گلشنِ ہند ص: ۳۔۵ بہ حوالہ مرزا علی لطف حیات اور کارنامے ص: ۳۰

۲۸ مرزا علی لطف" بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۳۲

۲۹ مرزا علی لطف بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۳۷

۳۰ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۲۵۶ تا ۸۱

۳۱ پروفیسر گیان چند جین تحقیق کا فن ص: ۳۷۰

۳۲ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۸۴

۳۳ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۸۴۔۸۵

۳۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۸۴

۳۵ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۸۷ تا ۹۰

۳۶ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۹۰ تا ۹۵

۳۷ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" ص: ۳۷۳۔۳۷۶

۳۸ پروفیسر گیان چند جین "تحقیق کا فن" ص: ۳۷۹

۳۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۱۰۱

۴۰ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۱۱۲

۴۱ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۱۲۱

۴۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۱۳۱ ۔ ۱۳۲

۴۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۰۲ ۔ ۲۰۳ ۔ ۲۰۴

۴۴ مولوی عبدالحق بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۰۶

۴۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۰۹،۲۱۰

۴۶ مرزا علی لطف بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۱۰ ۔ ۲۱۱

۴۷ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۲۰

۴۸ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۲۰

۴۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۲۱

۵۰ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۲۲

۵۱ مرزا علی لطف بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۲۶

۵۲ مرزا علی لطف بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۸

۵۳ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۸،۲۳۹

۵۴ بہ حوالہ "" مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۰ ۔ ۲۳۱

۵۵ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۶

۵۶ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۷

۵۷ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۷۷

۵۸ بہ حوالہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۹

۵۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " ص: ۲۳۲ ۔ ۲۳۹

۶۰ پروفیسر ثمینہ شوکت بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۲۸۴

۶۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۲۹۹

۶۲ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۳۰۳

۶۳ مرزا علی لطف بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۳۳۰

۶۴ مرزا ظفر الحسن بہ حوالہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے"
از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ص: ۲۵۲

۶۵ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص: ۲۴۹۔ ۲۵۰

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

بہ حیثیت مدون و مرتب

● دیوانِ لطف :

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " کے عنوان سے لطف کی حیات، ان کے تذکرے " گلشنِ ہند " اور ان کے دیوان کی کھوج کے ذریعہ تحقیقی کام کرنے کے علاوہ تدوین متن کا بھی کام کیا ہے اور " دیوانِ لطف " کے نام سے کتب خانہ جامعہ، عثمانیہ حیدرآباد سے حاصل کردہ لطف کے دیوان کے نسخے کے متن کی تدوین کا کام کیا ہے۔ اردو کے جتنے بھی نامور محققین گزرے ہیں انھوں نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تدوین متن کا بھی کام کیا ہے۔ ان میں محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، مولانا عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، مسعود حسین خاں، جمیل جالبی وغیرہ نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تدوین کا بھی کام کیا ہے۔ جس سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ تدوین کا کام تحقیق کا ہی ایک شعبہ ہے۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف پر اپنے تحقیقی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے تدوین متن کے اصولوں کی روشنی میں لطف کے دیوان کو مدون کر کے شائع کیا ہے اس کے علاوہ انھوں نے " دیوانِ حفیظ " کے عنوان سے حفیظ کا دیوان ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ کتب خانہ و ادارہ تحقیق مخطوطاتِ مشرقی آندھرا پردیش کے زیرِ اہتمام شائع کرایا۔ " یدِ بیضا " کے عنوان سے برق موسوی کا کلام بھی مرتب کیا اور نثر میں ان کی مرتبہ کتاب " نظیر شناسی " ہے جو انھوں نے اپنے ساتھی ڈاکٹر محمد علی اثر کے اشتراک سے ترتیب دی۔ نظیر شناسی میں مختلف مکاتبِ فکر کے شاعروں ادیبوں اور نقادوں کے نظر کی حیات اور شاعری پر کل ۲۲ مضامین ہیں۔ جنھیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈاکٹر محمد علی اثر کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرایا۔ اس طرح تدوین و ترتیب کے کام میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے قدیم و جدید شاعروں کے کلام کی تدوین کا کام کیا ہے۔

اس سے قبل کے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا بہ حیثیت مدون جائزہ لیا جائے تدوین متن کی تعریف اور اس کے اصولوں پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ تدوین متن دراصل صحیح متن کی بازیافت ہے یعنی نظم ہو یا نثر کسی متن کے حق میں جتنی شہادتیں ملتی ہیں ان کی مدد سے دست یاب متن کو اس شکل میں پیش کرنا جیسا کہ خود مصنف نے اسے تخلیق کیا تھا اور متن وہ تحریر ہے جو کسی شاعر یا ادیب نے لکھی یا کہی ہو اور اسے کوئی محقق ترتیب دینا چاہتا ہے۔ تدوین کو انگریزی میں (Compilation) اور مدوّن کو (compiler) کہا جاتا ہے۔

اردو میں تدوین متن کا کام عموماً قدیم دور کے منظوم کلام، کسی شاعر کا دیوان یا کلیات، مرثیوں یا مثنویوں کی بازیافت اور نثر میں قدیم داستانوں کی بازیافت کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ عموماً تدوین متن کا کام مخطوطوں کو لے کر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ قدیم دور میں شعرا کے کلام کے ایک سے زیادہ مخطوطے تحریر کیے جاتے تھے اور کلام کو ضبطِ تحریر میں لانے کے دوران کتابت کی غلطیاں ہو جاتی تھیں اور اگر مخطوطے کرم خوردہ ہو گئے تو ایک سے زیادہ مخطوطوں کا تقابلی مطالعہ کر کے شاعر یا مصنف سے قریب تر متن تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترتیب متن کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس کے لیے مدون میں کئی خوبیاں اور اوصاف ہونی چاہئیں۔ اس ضمن میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> "تدوین کے کام کرنے والے میں کئی اوصاف کا ہونا ضروری ہے عموماً پرانے متون ہی کی تدوین کی جاتی ہے اس لیے اس کام کو وہی ہاتھ میں لے جسے قدیم ادب اور قدیم علوم سے دل چسپی ہو، نیز جس نے قدیم مخطوطات اور مطبوعات کا کافی مطالعہ کیا ہو، چوں کہ پرانے ادیبوں سے متعلق حالات فارسی تذکروں اور تاریخوں سے ملتے ہیں، اس لیے مدون کو فارسی زبان کی معلومات ضروری ہے"۔ (۱)

کسی متن کی تدوین کے لیے سب سے اہم مرحلہ اس متن کے جملہ نسخوں کا حصول ہوتا ہے اس کے بعد ہی کسی ایک نسخہ کو بنیاد بنا کر دوسرے نسخوں کے اختلافات پیش کرتے ہوئے ایک حقیقی متن ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ تدوین متن کے دیگر اصولوں کی تفصیلات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تدوین متن کے کام کے جائزے

کے دوران پیش کی جائیں گی۔

تدوین متن کی تعریف، مدون کی صفات اور تدوین متن کے بنیادی اصولوں کے بیان کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی بہ حیثیت مدون پہلی کاوش "دیوانِ لطف" کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ "دیوانِ لطف" کی اشاعت ۱۹۸۳ء میں ادارہ شعر و حکمت کے زیرِ اہتمام ہوئی۔ کتاب کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے شفیق استاد ڈاکٹر مغنی تبسم کے نام معنون کیا ہے اور یہ اعتراف کیا کہ ان کی رہنمائی سے انھوں نے علمی و ادبی زندگی کی منزلیں طے کی ہیں، کتاب کے آغاز پر دیوانِ لطف (قلمی) کے ایک صفحہ کا عکس دیا گیا ہے۔ جس میں لطف کے کلام کے ۱۱ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں کتاب کا تعارف پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے استاد ڈاکٹر غلام عمر خاں نے لکھا اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اس کام کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"دیوانِ لطف" کی ترتیب و تدوین ڈاکٹر اکبر صاحب کے تحقیقی کام کا گویا ایک تسلسل ہے لطف کا کلام جو اپنی کیفیت اور کمیت کے قطع نظر تاریخ زبان کے نقطہ نظر سے اشاعت کا مستحق تھا ابھی تک مخطوطات میں محفوظ تھا ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے متعدد مخطوطوں سے ان کے چیدہ چیدہ کلام کو یکجا کیا ہے اور مختلف متون کے باہمی مقابلے کے بعد تدوین متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں "دیوانِ لطف" کی ترتیب و تدوین کی ہے"۔ (۲)

تدوین متن کے کسی بھی کام کا اہم حصہ اس کا مقدمہ ہوتا ہے کیوں کہ اس میں زیرِ بحث متن کے تدوین کے سلسلے میں مصنف اور حاصل شدہ متن کے بارے میں تمام ضروری معلومات درج ہوتی ہیں، جیسے مختلف نسخوں کی فہرست، ان کی مخفف علامت، ان کے برآمد ہونے کا مقام، ان کا زمانہ، ان کا رسم الخط یا کتابت، ایک ایک مخطوطے کا مکمل تعارف، کاتبوں اور ترقیموں وغیرہ کی تفصیل، دوسرے ماخذ جیسے لغات، قواعد وغیرہ کی تفصیل، گم شدہ مخطوطات کے بارے میں ممکنہ معلومات، متن کے مطبوعہ ایڈیشن کی تفصیلات، مصنف کے بارے میں معلومات وغیرہ مقدمے میں ہوتی ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین نے مقدمے میں حسب ذیل امور کی موجودگی ضروری قرار دی ہے وہ لکھتے ہیں:

" میری رائے میں اس (مقدمے) میں ذیل کے مطالب ہونے چاہئیں۔

۱ مصنف متن کی مختصر لیکن مستند سوانح حیات، اس کی جملہ تصانیف کی فہرست۔

۲ موضوع متن کا تعارف، اگر وہ نثری یا منظوم داستاں ہے تو اس کا ماخذ دینا چاہیے۔

۳ متن پر مختصر تنقید جو بعض متون میں ضروری ہے لیکن بیش تر میں غیر ضروری ۔۔۔

۴ اگر متن قدیم ہے تو لسانی جائزہ۔

۵ جن قلمی نسخوں سے متن تیار کیا گیا ہے ان سب کا مختصر تعارف ۔۔۔

۶ تدوین میں اپنایا گیا طریقہ جس میں بالخصوص یہ بتایا جائے کہ مختلف نسخوں کو کس طرح سمو کر تنقیدی متن تیار کیا گیا۔

۷ اگر متن قدیم ہے تو دو صفحات کا فوٹو یہ پہلے اور آخری صفحہ کا ہو تو بہتر ہے "۔ (۳)

مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے گا کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے دیوانِ لطف کے تدوین کے بعد مقدمہ میں کس امور سے پردہ اٹھایا ہے۔ تدوین متن کے کام میں مقدمہ سب سے آخر میں لکھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اسے کتاب کے آغاز میں دیا جاتا ہے چوں کہ یہ تدوین کے کام کی تکمیل کے بعد لکھا جاتا ہے۔ دیوانِ لطف کے مقدمہ کے آغاز میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کا تعارف کرایا ہے اور ان کے تذکرہ گلشنِ ہند کے حوالے سے ان کا تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ لطف نے فارسی تذکرہ " گلزار ابراہیم " میں بعد ترجمہ و اضافہ اردو میں تذکرہ " گلشنِ ہند " لکھا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اسے لطف کی تصنیف قرار دیتے ہیں لطف نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں یہ تذکرہ لکھا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوسکا تھا۔ اس تذکرہ کی اشاعت کی داستان بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے رودِ موسیٰ میں اس تذکرے کے نسخے کے بہہ کر آنے اور اس کے مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولتِ آصفیہ کے ہاتھ لگنے کا واقعہ بیان کیا۔ اس واقعہ کا تذکرہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت محقق میں کیا جاچکا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ لطف کے تذکرہ کا نسخہ شبلی کے حوالے ہوا جنھوں نے بعد تصحیح و

تحشیہ انجمن ترقی اردو سے شائع کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ شائع نہیں ہوسکا بعد میں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ عبداللہ خاں نے اسے رفاہِ عام پریس لاہور سے ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے اس تذکرے کو بعد اضافہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مقدمے کے ساتھ شائع کرایا۔ اس میں "گلزارِ ابراہیم" کے وہ حصے بھی شامل کر دیے گئے جن کا ترجمہ لطف نے نہیں کیا تھا۔ لطف کے تذکرے میں ۶۹ شعرا کے حالات ملتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ لطف" کے مقدمے میں آگے لطف کے مختصر حالات زندگی بیان کیے ہیں جو گزشتہ باب میں ذکر ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ لطف تخلص کے دیگر شعرا کی تفصیلات اور لطف کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنوی نگاری اور لطف کی رباعیوں کے بارے میں جائزہ لیا ہے۔ یہ تمام مواد ان کے تحقیقی مقالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" سے اخذ کردہ ہے لہٰذا تکرار کے سبب اس کا جائزہ نہیں لیا جارہا ہے۔

"دیوانِ لطف" کی تدوین کے محرکات کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"راقم نے مرزا علی لطف حیات اور کارنامے کے موضوع پر اپنا پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ لطف عام طور پر اپنے تذکرہ "گلشنِ ہند" کے لیے مشہور ہیں۔ اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں میں نے محسوس کیا کہ ان کا کلام بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ میر اور سودا کے معاصر کی حیثیت سے لطف کا کلام لسانی اور ادبی اعتبارات سے محققین کے لیے نئی راہیں کھولتا ہے۔

یہی احساس دیوانِ لطف کی تدوین و ترتیب پر مائل کرنے کا باعث ہوا"۔ (۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ چھان بین پر انھیں عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں "دیوانِ لطف" کا ایک مخطوطہ دست یاب ہوا اور اس مخطوطہ سے یہ انکشاف ہوا کہ لطف نے "تذکرہ گلشنِ ہند" میں اپنے حالات کے تذکرہ کے ساتھ اپنا تقریباً کلام بھی درج کر دیا۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تذکرہ گلشنِ ہند کے دو نسخوں سالار جنگ میوزیم اور جرمنی سے حاصل کردہ نسخوں کا دیوان لطف کے مخطوطہ سے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے "دیوانِ لطف" کی تدوین کی۔ جامعہ عثمانیہ کے نسخہ کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ یہ تذکرہ گلشنِ

ہند کے دونوں نسخوں سے قدیم ہے اور اس میں املا کی غلطیاں کم ہیں۔ لہٰذا لطف کے دیوان کی ترتیب میں اسے بنیادی نسخہ قرار دیا گیا۔ تاہم ترتیب متن میں تینوں نسخوں کو مدنظر رکھ کر مصنف کی زبان اور اسلوب سے میل کھاتے متن کو قبول کیا گیا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مقدمہ میں آگے لطف کے دیوان کی تدوین میں استعمال ہونے والے تینوں نسخوں کی درجہ بندی کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ پروفیسر گیان چند جین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ایک سے زیادہ نسخے موجود ہوں تو ان میں اولیت اور استناد طے کیا جائے۔ زیادہ نسخے ہوں تو ان کی گروہ بندی کر کے شجرہ بنائیے ان میں مخطوطات کے ساتھ مطبوعات بھی شامل کیے جاسکتے ہیں"۔ (۵)

نسخوں کی درجہ بندی کے بارے میں مختلف ماہرین فن کی آرا، پیش کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین نے لکھا کہ بہترین نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ دوسرا وہ نسخہ وقیع ہے جو مصنف نے پڑھا یا سنا اور اس نے اپنے قلم سے اس کی تصدیق کی ہو۔ تیسرا وہ نسخہ جو مصنف کے نسخے سے منقول ہو۔ پھر مصنف کے عہد میں نقل کیا گیا نسخہ اور اسی طرح بعد کے زمانے کے نسخے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے دیوانِ لطف کی تدوین کے لیے جن تین نسخوں سے استفادہ کیا ان کی مندرجہ ذیل انداز میں درجہ بندی کی۔

ا نسخہ جامعہ، عثمانیہ، حیدرآباد۔

ب نسخہ اسٹاٹ سی ببلیوتھک، جرمنی۔

ج نسخہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔

نسخہ جامعہ، عثمانیہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ جامعہ، عثمانیہ کی ملکیت ہے کتب خانہ کی فہرست کے مطابق اس کا داخلہ نشان ۸۸۵ / ۱۲ ہے۔ مخطوطہ کا سائز ۱/۲ × ۱۰ ۱/۲ ۵ ہے۔ صفحات کی کل تعداد ۴۸ ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۸ تا ۱۹ سطور ہیں۔ خط نستعلیق شکستہ اور کاغذ دیسی ہے۔ بعض مقامات پر مخطوط کرم خوردہ اور آب زدہ ہوگیا ہے۔ پہلے صفحہ کے اوپر "دیوان منتخب مرزا علی خاں علیہ الرحمان"

اور اس کے بعد "دیوانِ لطف از مرزا علی لطف" لکھا ہوا ہے۔ نسخہ ۳، غزلوں ۵۰ قصیدوں اور ۵ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ غزلوں کے اشعار کی تعداد ۱،۴ ہے قصیدوں کے اشعار کی تعداد ۲۰۲ ہے اور رباعیوں کے اشعار کی تعداد ۲۰ ہے اس طرح دیوان میں کل ۶۳، اشعار ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مخطوطہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں مخطوطہ مخزونہ جامعہ عثمانیہ کے پہلے صفحہ پر "فاضل بیگ ولد صفدر بیگ" کی مہر ۱۲۵۰ھ کی تاریخ کے ساتھ ثبت ہے اکثر مقامات پر تخلص (لطف) بالکل غائب ہے۔ شاید کسی نے اسے مٹانے کی کوشش کی ہوگی۔ ابتدائیہ اور ترقیمہ بھی نہیں ہے جس سے کاتب کا نام سنہ کتابت اور مقام کا پتہ چل سکے۔ صرف مہر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ کو یہ فاضل بیگ کی ملکیت بنا۔

مخطوطہ کے آغاز سے پہلے "رب یسر"، "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور "وتمم بالخیر" لکھا ہے۔ مخطوطہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

زیب لوح عرش بیچ مصرع ہے بسم اللہ کا	واہ رے پرُ سادہ و پرُ کار مصرع آہ کا

لے زمین سے آسمان تک عشق کو پایا محیط	ہے کتانِ دل چاک تو داغِ جگر سے ماہ کا

نسخہ کا آخری شعر یہ ہے

گلشنِ اقبال تیرا نت رہے با آب و رنگ

دہر کا شاداب و خرم جب تلک گلزار رہے (۶)

نسخہ کے آخر میں بھی "فاضل بیگ ولد صفدر بیگ" ۱۲۵۰ھ کی مہر ہے

(ب) پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ دیوانِ لطف پر مشتمل تذکرہ گلشنِ ہند کے نسخہ اسٹاٹ سی بیلیو تھک جرمنی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نسخہ میں جامعہ عثمانیہ کے "منتخب دیوانِ لطف" سے دو اشعار زیادہ ہیں۔ گلشن ہند اسٹاٹ سی بیلیو تھک جرمنی (۴۵۰) صفحات پر مشتمل ہے اور بہت ہی عمدہ خط نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ اسپرنگر کی ملکیت تھا۔ جسے "ٹیوبن گن لائبریری" سے جرمنی منتقل کیا گیا تھا۔ اس مخطوطہ میں لطف کا ذکر صفحہ ۲۰۹ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ نمبر ۳۵۹ پر اختتام کو پہنچتا ہے۔ جس میں مثنوی

لطف بھی شامل ہے۔ ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۱۵ ہے تقطیع ۱۰ x ۶ ۱/۲ ۔ جامعہ ، عثمانیہ کے نسخہ کی طرح جرمنی کے نسخے کا بھی آغاز ان ہی اشعار سے ہوتا ہے۔ بعد میں مثنوی شروع ہوتی ہے جو ان اشعار پر ختم ہوتی ہے:

لطف بس بے ادب اتنا نہ ہو
منھ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو
لائق انسان نہیں یہ خال و قیل
ہو جو مداح علی تو جبریل

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نسخہ جرمنی میں شامل غزلوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " اس نسخہ میں اشعار بغیر کسی امتیاز کے لکھے گئے ہیں۔ جب کہ جامعہ ، عثمانیہ کے نسخہ میں ہر غزل کی ابتدا میں " ولہ " کی سرخی درج ہے۔ بعض قصائد پر عنوانات بھی درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً دیوان کے آخری قصیدہ پر یہ عنوان درج ہے۔

" در تہنیت بسم اللہ کیواں جاہ بہادر " (۷)

کتابت کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نسخہ کا کاتب کم سواد معلوم ہوتا ہے۔ اکثر مقامات پر اس نے اشعار غلط نقل کیے ہیں۔

(ج) نسخہ ، سالار جنگ حیدرآباد کی تفصیلات بتاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ " دیوان کا یہ نسخہ " تذکرہ گلشنِ ہند کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد پر مبنی ہے اس کا سائز (۹ x ۶) ہے۔ صفحات کی تعداد (۸۲۶) ہے ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۱۲ تا ۱۴ ہے۔ کاغذ دیسی تاریخ تصنیف ۱۲۱۵ھ ہے۔ اس نسخہ میں دیوان لطف صفحہ ۱۶۲ تا ۱۹۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ دیوان کا آغاز و اختتام سابقہ نسخوں کے اشعار کے مطابق ہے اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غزل ختم ہونے کے بعد کوئی نشان نہیں لگایا گیا اور نہ ولہ کی علامت ہے۔ ابتدا میں غزلیں ہیں اس کے بعد قصائد اور رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔ ۳۰ ، غزلیں ۴۰ قصائد اور ۵ رباعیاں شامل ہیں صرف ایک قصیدہ پر عنوان " امیر اعظم ارسطو جاہ بہادر " درج کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ جرمنی اور جامعہ ، عثمانیہ کے مقابلہ میں

بہت زیادہ آب زدہ اور کرم خوردہ ہوگیا ہے۔ کاتب بھی بہت کم سواد ہے۔ اکثر مقامات پر اس نے املا غلط لکھا اور جہاں کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آسکا اسے چھوڑ دیا ہے مثنوی کے اشعار پر نسخہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

"دیوانِ لطف" کی تدوین میں استفادہ کیے گئے تینوں نسخوں کی کیفیت بیان کرنے کے بعد مقدمہ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تدوین کے دوران املا کی درستگی کے لیے اختیار کردہ اصولوں کو بیان کیا ہے تدوین متن کے دوران املا کے اصول بیان کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"جن مقامات پر مخطوطے کا املا موجودہ تلفظ سے کوئی فرق ظاہر نہیں کرتا بلکہ محض فرسودگی املا ہے وہاں جدید املا اختیار کیا جائے مثلاً اوس، فرسنک، ساتہی کو بالترتیب اس فرسنگ ساتھی لکھا جائے۔

جن مقامات پر فرسودہ املا کسی فرسودہ تلفظ کی ترجمانی کرتا ہے اور جسے بدلنے میں مصنف کا پیش کردہ تلفظ بدل جائے گا وہاں مخطوطے کا اصل املا برقرار رکھا جائے مثلاً کوں، سوں، کبھو، جد، تد، تلپھنا کو جدید کر کے کو، سے، جب، تب، تڑپنا، ہرگز نہ لکھا جائے۔" (۸)

اسی طرح مشہور محقق رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"مخطوطے میں واقعی املا کے پیچھے منشائے مصنف کی تلاش کیجیے۔ اگرچہ اس نے کی، کو یائے مجہول سے "کے" لکھا ہے تو بھی اس کا منشا کی لکھنے کا تھا۔ اس لیے آج ہم اسے "کی" ہی لکھیں گے۔ اگر اس نے "گھر" کو "گہر" لکھا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کا منشا "گھر" لکھنے کا تھا۔ ہم وہی لکھیں گے"۔ (۹)

پروفیسر گیان چند جین اور رشید حسن خاں کے تدوین متن کے دوران املا لکھنے کے بیان کردہ اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تدوین کا نام دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قدیم رسم الخط کے املا کو موجودہ رسم الخط میں بدلنے میں درکار اصولی تبدیلیاں کی ہیں اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

(ا) "ک اور گ پر ایک ہی مرکز پایا گیا جیسے کل (گل) درکاہ (درگاہ) جاکا (جاگا،

جگہ) کریباں (گریباں) وغیرہ۔ اس قسم کے تمام الفاظ کی صورت میں ہم نے ک اور گ کا مروجہ استعمال کیا ہے۔

(۲) یائے معروف اور یائے مجہول میں بالکل امتیاز نہیں ہر جگہ ایک کے بجائے دوسری ملتی ہے جیسے دیکھی (دیکھے) سی (سے) کی (کے) وغیرہ راقم نے یائے معروف اور یائے مجہول کو مروجہ املا کے مطابق درست کر دیا ہے"۔ (۱۰)

اسی طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ انھوں نے دیوان لطف کی تدوین کے دوران انھوں نے ہائے مخلوط کو ہائے ہوز (تہا۔ تھا) نون مقنوط کو غیر مقنوط (نہین۔ نہیں) دو آزاد لفظوں کو جو ملا کر لکھے گئے تھے ان کو الگ الگ لکھا۔

ملے ہوئے املا کو علاحدہ (آنکھونسی۔ آنکھوں سے) اور اوس وغیرہ پیش کی حرکت کے لیے استعمال کے گے۔ و۔ کو نکال کر اس کر دیا ہے۔

قلمی کتابوں اور نسخوں میں املا کی غلطیوں سے پیدا ہونے والی دشواریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اور دیوانِ لطف کی تدوین کے مراحل کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"قلمی کتابوں میں املا کی مندرجہ بالا خصوصیات تدوین متن کے دوران بڑی الجھنیں پیدا کرتی ہیں اور پڑھنے میں کافی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ عہد حاضر کے قاری کے لیے قدیم متن کو قابلِ فہم بنا کر پیش کرنے کے لیے املا کی یہ تصحیح ضروری تھی۔ لیکن بعض الفاظ جن کی قدیم شکل شاعر نے شعر میں باندھی ہے، ان میں کوئی تبدیلی کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ دیوانِ لطف کے تینوں نسخوں میں اکثر اوراق کرم خوردہ یا آب زدہ ہوگئے ہیں۔ جس کی وجہ سے حروف برابر پڑھے نہیں جاتے اور اس پر کتابت کی بے شمار غلطیاں تدوین متن کے لیے ایک چیستان بن جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف نسخوں کی مدد سے متعدد اشعار کی شاعر کے اسلوب بیان اور مزاج کے مطابق تشکیل جدید کی گئی ہے ایسے اشعار جن کی دوبارہ تشکیل کی گئی ہے فٹ نوٹ

میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے"۔ (۱۱)

"دیوانِ لطف" کی تدوین کے مختلف امور میں جن علماء نے تعاون کیا پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مقدمہ کے آخر میں شکریہ ادا کیا۔ ان میں پروفیسر غلام عمر خاں، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر مغنی تبسم، سکینہ بیگم برق موسوی، ڈاکٹر محمد علی اثر وغیرہ شامل ہیں۔

تدوین متن کے مراحل میں نسخوں کی زمرہ بندی اور بنیادی نسخہ بنا لینے کے بعد تمام نسخوں کے موازنہ کے ذریعہ املا درست کرتے ہوئے متن تدوین کیا جاتا ہے اور متن ترتیب دینے کا عمل کے دوران جہاں جہاں نسخوں میں اختلافات آتے جائیں ان اختلافات کو حاشیے میں بیان کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ قاری کو تشفی بخش متن پڑھنے کے لیے مل سکے اور اختلافات کے بارے میں قاری کی صحیح طور پر رہنمائی ہو۔ اختلافات نسخ کے بارے میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> "تدوین میں اختلافاتِ نسخ دینے کا مقصد یہی ہے کہ تمام نسخوں کے اندراجات ملخص ہو کر یک جا ہو جائیں۔ تاکہ ہر قاری تنقیدی متن کے کسی بھی حصے کے بارے میں فیصلہ کر سکے کہ مدون نے جو انتخاب کیا وہی بہترین تھا یا اس کی جگہ کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔۔" (۱۲)

پروفیسر گیان چند جین نے تدوین متن میں اختلافات نسخ دینے کے معاملے میں مختلف ماہرین کی آراء پیش کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے تدوین متن میں اختلافات نسخ کی بھرمار ہوتی تھی اور اصل متن کہیں چھپ جاتا تھا۔ اس لیے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اہم اختلافات دیے جائیں، کتابت کی غلطیوں اور غیر اہم نسخوں کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اختلافات نسخ عموماً متن پر تبصرہ کرنے والے محققین دیکھتے ہیں عام قاری کو اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ اختلافات نسخ دینے کے طریقے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اختلافات صفحے کے نیچے ہی دیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ اختلافات پیش کرنے کے مختلف علامات طے کر لینی چاہیں ان علامات کی تفصیلات پہلے بتا دینی چاہئیں تاکہ قاری کو آسانی سے اس کا مخفف یا اصل سمجھ میں آجائے۔ اختلافات نسخ کے مندرجہ بالا اصولوں کے پیشِ نظر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ جن تین نسخوں سے استفادہ کیا تھا ان کی طرف اشارہ

کرنے کے لیے انھوں نے ا،ب،ج کی علامت استعمال کی ہے۔ ہر صفحہ کے نیچے فٹ نوٹ میں اختلافات درج کیے ہیں۔ غیر ضروری اختلافات جیسے کاتب کے سہو یا املا کی غلطیوں کے اختلافات نہیں بتائے صرف ایسے اختلافات بتائے ہیں جو مختلف نسخوں میں جدا جدا ہیں ہر صفحہ پر زیادہ سے زیادہ دو یا تین اختلافات دیے ہیں۔ مثلاً ص،۰۵ پر غزل کا مطلع یہ لکھا:

کشور دل تو سدا کا نہیں ویرانہ تھا
یہ خرابہ بھی کسی وقت پری خانہ تھا

طبقات الشعرا" از قدرت اللہ شوق مرتبہ نثار احمد فاروقی" میں اس طرح ہے:

کشور دل تو سدا کا نہ ویرانہ تھا
یہ خرابہ بھی اک عالم میں پری خانہ تھا (۱۳)

ترتیب شدہ متن کے پہلے مصرعہ میں نہیں کی جگہ اختلاف والے مصرعہ میں "نہ" ہے اور دوسرے مصرعہ میں "کسی وقت کی جگہ اک عالم میں" ہے قیاسی تصحیح کرتے ہوئے انھوں نے متن کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض جگہ بنیادی نسخہ میں الفاظ یا مصرعہ مٹ گیا ہے تو اسے دوسرے نسخوں سے دیکھ کر لکھنے کی تفصیلات ملتی ہیں مثلاً ص،۱۰۶ پر یہ شعر دیا گیا:

نہیں ہے موجِ خیزِ غم سے خوف (اب کشتی، دل کو)
بڑا بھاری وسیلہ ہے کرم تیرے لنگر کا (۱۴)

اور فٹ نوٹ میں لکھا کہ "خوف" کے بعد الفاظ مٹ گئے ہیں مخطوطہ جرمنی میں یہ شعر موجود ہے اس طرح لطف کی رباعیاں پیش کرتے ہوئے پانچویں رباعی کے بارے میں لکھا کہ:

"یہ رباعی" دیوانِ لطف" (قلمی) کتب خانہ جامعہ، عثمانیہ "گلشنِ ہند" مخطوطہ سالار جنگ اور "گلشنِ ہند" مخطوطہ جرمنی میں موجود ہے۔ جب کہ بعض مطبوعوں، نسخوں اور تذکروں میں بھی اس کو شامل کیا گیا ہے مثلاً "عمدہ، منتخبہ، مجموعہ نغز۔ خوش معرکہ، زیبا اور تذکرہ ہندی میں یہ رباعی ملتی ہے ص،۱۳۰ پر پیش

کردہ رباعی یہ ہے۔

جو کوئی آفت نہانی مانگے اور ملک عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلا دے تو اسے اپنی شمشیر نگاہ جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے (۱۵)

تدوین متن کے ضمن میں اختلافات نسخ بیان کرنے کے علاوہ بعض جزئیات کی نشان دہی بھی ضروری ہوتی ہے۔ ان میں اول حواشی کے ذریعہ بعض امور کو تفصیلی طور پر بیان کرتے ہوئے قاری کی تسکین کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ حواشی عموماً کتاب کے آخر میں دیے جاتے ہیں۔ مثلاً متن میں کسی شخصیت یا مقام یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو تو اس پر حواشی نمبر ڈال کر آخر میں اس کی تفصیلات بتانا ضروری ہوتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تدوین کردہ کتاب میں حواشی نہیں دیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیوانِ لطف میں ایسے کوئی الفاظ ہی نہیں جن کی تشریح ضروری ہو۔ بلکہ قدیم دور کے متون میں بے شمار الفاظ ایسے مل جاتے ہیں جن کی تشریح کے علاوہ تفصیل بھی درکار ہوتی ہے۔ اس ضمن میں حواشی کا نہ دیا جانا "دیوانِ لطف" کی تدوین میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے ج۔ اس سے دیوانِ لطف کو آسانی سے سمجھنے میں قاری کو دشواری پیش آسکتی ہے۔

حواشی کے علاوہ متن کو آسانی سے سمجھانے کا دوسرا طریقہ تخریج ہے یہ فن تحقیق کی اصطلاح میں وہ عمل ہے جس کے ذریعہ کسی ادیب یا شاعر کے کلام میں دوسرے کلام یعنی آیات قرانی، احادیث نبوی، معروف اقوال، ضرب الامثال، دوسرے شعرا کے اشعار وغیرہ کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس کتاب میں تخریج کا عمل بھی نہیں ملتا۔

اختلافاتِ نسخ کا تیسرا جز متن میں کوئی مصرع غیر موزوں ہو تو اس کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی قیاسی تصیح کرنا، اس کے لیے بحر اور وزن معلوم کر کے مصرعہ کو موزوں کرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ لطف" کی تدوین کے دوران بعض مقامات پر قیاسی تصیحیح بھی کی ہے۔ ص۔۴۰، پر ایک مصرعہ اس طرح ہے:

ہے یہ بھی نئی چھیڑ شبِ وصل میں سو بار

نیچے فٹ نوٹ میں "مجموعہ نغز" ص ۱۴۸، پر موجود مصرعہ دیا جو اس طرح ہے

یہ بھی ہے نئی چھیڑ کہ اٹھ وصل میں سو بار" (۱۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ضرورت پڑنے پر قیاسی تصحیح کے ذریعہ اشعار موزوں کیے ہیں۔

قیاسی تصحیح کے علاوہ دوران تدوین دیگر غلطیوں کی تصحیح بھی اختلاف نسخ کے تحت آتی ہے۔ ان میں شعرا کے حالات کی دیگر تذکروں میں غلط بیانی کی نشان دہی اور ان کی تصحیح، متن میں شامل کسی نظم یا غزل یا نثری تخلیق کی شانِ نزول بیان کرنا نیز سنہ تصنیف کی نشان دہی، متن کی فنی اغلاط کی طرف اشارہ۔ ان تمام امور کو حواشی میں بیان کرنا چاہیے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی کتاب میں حواشی کے تحت مندرجہ بالا امور کا جائزہ نہیں لیا البتہ ضروری تفصیلات فٹ نوٹ میں درج کی ہیں اور فرہنگ میں الفاظ کے معنوں کے تحت ضروری تشریحات بھی کی ہیں۔

قدیم متون کی تدوین میں اہم کام فرہنگ کا ہوتا ہے۔ فرہنگ کے ذریعہ مشکل الفاظ کے معنوں کے ذریعہ متن کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے فرہنگ میں مشکل الفاظ کے معنی، اصطلاحات کی تشریح، غریب یا غیر معمولی استعمال کے الفاظ کے معنی، اجنبی محاورے اور کہاوتوں کی تشریح، عربی فقرے، آیات جملوں وغیرہ کی تشریح دینی ہوتی ہے تدوین متن میں فرہنگ کی تیاری کے اصول بیان کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں کہ:

> "تمام مشکل اور غریب الفاظ کو شامل کیا جائے۔۔۔ ایسے الفاظ کو ہرگز شامل نہ کیا جائے جن کے معنی ایک خاصا پڑھا لکھا انسان جانتا ہو۔۔۔ لفظوں کا صرف وہی تلفظ دیا جائے جو متن میں استعمال ہوا ہے۔۔۔ فرہنگ میں لفظ کے وہی معنی دیے جائے جو متن میں مراد ہیں دوسرے مفاہیم درج نہ کیے جائیں"۔ (۱۷)

"دیوانِ لطف" کی تدوین کے بعد کتاب کے آخر میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فرہنگ بھی دی ہے۔ لطف کی زبان آج سے تقریباً دو سو سال پرانی ہے اور بہت سے الفاظ آج متروک ہو چکے ہیں۔ لہذا پروفیسر

مرزا اکبر علی بیگ نے فرہنگ کے ذریعہ لطف کے کلام کو آسانی سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے فرہنگ میں ۱۴۹ الفاظ کے معنی دیے ہیں۔ ان میں بعض الفاظ کے معنی تشریحی نوعیت کے ہیں جیسے:

ابوذر = ابو ذر غفاری ایک صحابی کا نام

کتان = ایک قسم کا باریک کپڑا جس کی نسبت مشہور ہے کہ چاندنی رات میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

زال = بوڑھا۔ رستم کا باپ

قنبر = حضرت علی کے غلام کا نام

کنجشک = ایک مشہور پرندے کا نام (۱۸)

پروفیسر گیان چند جین نے فرہنگ کی تیاری کے جو اصول بیان کیے ہیں انھیں مد نظر رکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تیار کردہ فرہنگ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے صرف ۱۴۹ الفاظ کے معنی دیے ہیں۔ جب کہ لطف کے دیوان میں مزید ایسے کئی مشکل اور غریب الفاظ موجود میں جس کے معنی قاری کے لیے تشنہ طلب ہیں لیکن شاعری کے باذوق قارئین فرہنگ میں دیے گئے الفاظ اور اپنی ذاتی استعداد سے بھی لطف کے کلام کو سمجھ سکتے ہیں کیوں کہ لطف، سودا و میر کے ہم عصر رہ چکے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا آسان الفاظ والے اشعار بھی ملتے ہیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فرہنگ میں حرف مشکل الفاظ کے معنی ہی دیے ہیں صرف چند ایک الفاظ آسان لگتے ہیں جیسے مو = بال، نبیڑنا = پورا کرنا، ختم کرنا، گبرو = نوجوان، کھڑکا = آہٹ وغیرہ۔ اسی طرح انھوں نے لفظوں کا دیہی تلفظ دیا ہے جو متن میں استعمال ہوا ہے۔

فرہنگ کے اختتام کے ساتھ ہی "دیوانِ لطف" کا اختتام عمل میں آتا ہے۔ کتاب میں ضمیمہ یا تعلقیات نہیں ملتے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ضروری معلومات کو متن کے ساتھ ہی یا پھر فرہنگ میں پیش کر دیا ہے۔ اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے "دیوانِ لطف" کے کام کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا یہ کام بڑی حد تک تدوین متن کے اصولوں پر کھرا اترتا ہے اور انھوں نے قدیم نسخوں کی مدد سے "دیوانِ لطف" کو معہ فرہنگ کے ترتیب دیتے ہوئے محفوظ کر دیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ کاوش فورٹ ولیم کالج کے

عہد کے ایک شاعر کے کلام اور اس دور کی شاعری کے مزاج کو سمجھنے میں ممدد و معاون ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تدوین متن کے اس کام پر اپنی عالمانہ رائے ظاہر کی ہے۔ ان کی اس رائے کے ساتھ "دیوانِ لطف" پر اس تبصرہ کا اختتام کیا جاتا ہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں لکھتے ہیں:

"لطف کی زبان پر میر اور سودا کی زبان کے مقابلے میں قدامت کی چھاپ نمایاں ہے ۔۔۔ لطف کی زبان کے اس پہلو نے تدوین متن کے سلسلے میں مرتب کے کام کو دشوار بنا دیا ہے۔ قدیم متن کی تدوین کے دوران جب تک کسی شعر میں کسی پے چیدہ اور الجھے ہوئے لفظ کی صوتی شکل اور اس کے معنی پوری طرح متعین نہ ہو جائیں، شعر قابلِ فہم نہیں بنتا۔ متنی نقاد کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قدیم متن کو عہد حاضر کے قاری کے لیے قابلِ قراءت اور قابلِ فہم بنا کر پیش کر دے۔۔۔ کلام لطف کے مرتب کو بھی لطف کی زبان میں قدیم عنصر کی موجودگی کے سبب ایسے مقامات سے گزرنا پڑا ہے اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی تحقیقی ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ ڈاکٹر اکبر صاحب نے تگ و دو کر کے ایسے (مشکل) الفاظ کو قدیم زبان کے ماہرین کی مدد سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود جو الفاظ حل نہیں ہوسکے انھوں نے دیانت داری کے ساتھ ان کی نشان دہی کر دی ہے علمی مسائل میں تحقیق و تفحص کی یہ لگن قابلِ قدر ہے"۔ (۱۹)

○

- **دیوانِ حفیظ :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ لطف" کی تدوین کے علاوہ "دیوانِ حفیظ" کی بھی تدوین کی ہے۔ " یدِ بیضا " کے نام سے برق موسوی کا کلام مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ انھوں نے حفیظ کا دیوان کتب خانہ، ادارہ، تحقیق مخطوطات مشرقی آندھرا پردیش حیدر آباد۔ Andhra Pradesh Government Oriental Manuscripts Library and Research Institute HYD کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۳ء میں شائع

کرایا۔ کتاب کے سرورق پر " دیوانِ حفیظ " لکھا ہے۔ اس کے نیچے مدیر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اور مدیر اعلیٰ این۔ آر۔ وی پرساد ڈائرکٹر لکھا ہے۔ درمیان میں حکومت آندھرا پردیش کی مہر ہے۔ کتاب کی فہرست میں پیش لفظ (انگریزی) مسٹر این آر وی پرشاد، تعارف (انگریزی) پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، مقدمہ (اردو) اور اس کے آگے ردیف وار دیوانِ حفیظ کی تفصیلات ہیں لیکن آگے کتاب کے آغاز یا اختتام پر مسٹر پرشاد اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے انگریزی میں لکھے پیش لفظ یا تعارف شامل نہیں ہیں۔ بلکہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے لکھے ہوئے مقدمہ سے ہی " دیوانِ حفیظ " کا آغاز ہوتا ہے۔ حفیظ کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ " ان کا پورا نام شیخ محمد حفیظ اور حفیظ تخلص تھا۔ انیسویں صدی کے باکمال شاعر تھے۔ ان کے تفصیلی حالات دست یاب نہیں۔ ان کے کلام کی اندرونی اور داخلی شہادتوں سے ان کی حیات کے کچھ اشارے ملتے ہیں "۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ اس دور کے تذکرہ نگاروں نے حفیظ کو نظر انداز کیا۔ تذکرہ گلزار آصفیہ میں حفیظ کے مختصر حالات دیے گئے ہیں۔

شیخ حفیظ کے آباد و اجداد شمالی ہند کے رہنے والے تھے ان کی تاریخ پیدائش ابتدائی تعلیم و تربیت اور ان کے والد کے بارے میں کسی تذکرہ نگار نے معلومات فراہم نہیں کیں۔ حفیظ دلی کے ایک سپاہی پیشہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری سے دل چسپی تھی۔ دلی کے حالات سے متاثر ہو کر ترک وطن کر کے اورنگ آباد پہنچے۔ اورنگ آباد کے صوبہ دار مہی پت رام نے حفیظ کو خصوصی مصاحبین میں شامل کرلیا۔ بعد میں چندو لال شاداں کی سرپرستی اور قدر دانی کا تذکرہ سن کر ۱۸۰۵ء میں مہی پت رام کی معزولی کے بعد حیدر آباد پہنچے۔ حفیظ نے شاداں کے دربار میں باریابی حاصل ہونے پر ایک قصیدہ کہا۔ شاداں نے ان کے کلام کو پسند کیا اور قدر افزائی کے طور پر درباری شعرا میں شامل کرلیا اور ماہانہ ایک ہزار روپے تنخواہ مقرر کی اور بعد میں ملک الشعرا کے اعزاز سے نوازا۔ حفیظ نے متعدد اشعار میں شاداں کی تعریف کی ہے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

حق رکھے شاداں جن دولت سے حفیظ
عیش کرتے ہیں ہزاروں اپنی جاگیروں کے بیچ

مقدر ہو تو شاداں موتیوں میں لاد دیتے ہیں
دوشالہ چیز کیا ہے، مال کیا کم خواب کا جوڑا (۲۱)

چندولال شاداں حفیظ کے بڑے مداح تھے اور ان سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے تھے۔ اپنی شعری صلاحیتوں کی وجہ سے حفیظ مہاراجہ کے مزاج میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے حفیظ کی سفارش کی بدولت بیش تر لوگوں نے مہاراجہ سے فیض پایا۔ چندولال شاداں کے توسط سے حفیظ کو والیِ دکن سکندر جاہ کے دربار میں بھی رسائی ہوئی۔ حفیظ کے اساتذہ کے بارے میں متضاد باتیں ملتی ہیں کوئی انھیں شیر محمد خاں ایمان کا شاگرد بتاتا ہے جب کہ حفیظ نے ایک غزل میں ناسخ سے استفادہ سے ذکر کیا ہے۔ حفیظ کی شہرت کے زمانے میں شاہ نصیر دہلوی بھی حیدرآباد آئے تھے۔ دونوں دو مختلف دبستانوں کے نمائندے اور قادر الکلام شعرا ہونے کے سبب ان میں ادبی چشمکیں اور معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس کے برخلاف وہ مرزا علی لطف کی سخن شناسی کے قائل تھے اور ان سے مشورہ سخن بھی کیا کرتے تھے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ حفیظ کے مذہبی عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔ جہاں موقع ملا حفیظ نے اپنے شیعہ عقائد کو پیش کرنے کی گنجائش نکال لی ہے۔ حفیظ نے اپنے ہم عصر شمالی ہند کے شعرا میر اور سودا سے تاثر لیا۔ ان کے کلام میں میر کی سی جادو بیانی، سوز و گداز، سادگی، بیان اور تاثر کی فراوانی ملتی ہے۔ حفیظ نے میر کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں حفیظ نے اپنا آخری زمانہ حیدرآباد میں گزارا تھا۔ لیکن دلی میں لوگ انھیں یاد کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں حفیظ کو "شیخ دکن" کہا ہے
پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ حفیظ کے سنہ وفات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ""تذکرہ شعرائے دکن" مرتبہ عبدالجبار ملکاپوری میں حفیظ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے حفیظ کا سنہ وفات ۱۲۴۶ھ م ۱۸۳۰ء بتایا ہے اور یہ بھی لکھا کہ حفیظ حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے لیکن مدفن کے مقام کی کوئی صراحت نہیں۔ ڈاکٹر زور نے قیاس کیا ہے کہ وہ دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے"۔ (۲۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حفیظ تخلص کے چند دیگر شعرا کی بھی "دیوانِ لطف" کے مقدمے میں نشان دہی کی اور جن شعرا کے نام ان کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ دیا۔ ان میں حفیظ محمد حفیظ دہلوی:

میں تو بدنام ہوا عشق میں اللہ کے
وہ بھی بدنام ہو جس نے مجھے بدنام کیا

حفیظ جونپوری

جان ہی جائے تو جائے دردِ دل
بس یہی ہے اک دوائے دردِ دل

حفیظ محمد حفیظ

جوں ہی آیا مجھ پہ وہ خنجر دو دھارا کھینچ کر
آہ کا نیزہ اسے میں نے بھی مارا کھینچ کر

حفیظ جالندھری

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

حفیظ بنارسی

میرے مے کدے میں بھی آ کبھی میرا مے کدہ وہ مقام ہے
جہاں امتیاز نہیں کوئی جہاں شاد کامی عام ہے (۲۳)

حفیظ تخلص کے دیگر شعرا کے تعارف کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حفیظ کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ ان کے دست یاب دواوین میں صرف غزلیں ہی پائی گئی ہیں۔ دوسری اصناف سخن یا فارسی کلام دست یاب نہیں ہیں۔ ان کی چار رباعیاں دست یاب ہوئیں۔ حفیظ کے بارے میں پروفیسر ثمینہ شوکت کے خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ:

"ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنی کتاب مہاراجہ چندو لال شاداں اور حیدر آباد کا سیاسی اور سماجی پس منظر میں لکھتی ہیں حفیظ چندو لال شاداں کے دربار کے ملک الشعرا تھے اور ان شاعروں میں تھے جو اس زمانے میں شمال سے حیدر آباد آئے تھے۔ بڑے تغزل گفتار شاعر تھے۔ ان کی غزل اساتذہ کے ٹکر کی ہے۔ وہ پرنویس تھے چناں چہ تین دیوان چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن ان کا کلام جیسی چاہیے ویسی شہرت نہ پاسکا"۔ (۲۴)

تاہم پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈاکٹر لئیق صلاح کے حوالے سے لکھا کہ دیوانِ حفیظ کے چھ نسخے ہیں اور پاکستان میں مزید دو نسخوں کی موجودگی کی اطلاع دی ہے۔ ہندستان کے چھ نسخوں کی فہرست اس طرح ہے:

ا	دیوانِ حفیظ	مخزونہ اورینٹل مین اسکرپٹ لائبریری حیدر آباد
ب	دیوانِ حفیظ	مخزونہ اورینٹل مین اسکرپٹ لائبریری حیدر آباد
ج	دیوانِ حفیظ	مخزونہ اورینٹل مین اسکرپٹ لائبریری حیدر آباد
د	دیوانِ حفیظ	مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد
ہ	دیوانِ حفیظ	مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد
و	دیوانِ حفیظ	مخزونہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدر آباد

پاکستان میں موجود نسخے

ر	دیوانِ حفیظ۔ اول	کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کراچی پاکستان
ح	دیوانِ حفیظ۔ دوم	کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان (۲۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے دیوانِ حفیظ کے مقدمے میں نسخوں کی تفصیلات بتانے کے بعد دست یاب نسخوں کی کیفیت بیان کی ہے۔ نسخہ الف کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں الف۔ دیوانِ حفیظ مخزونہ اورینٹل مین اسکرپٹ لائبریری حیدر آباد، داخلہ نمبر ۶۱، دواوین ۱۸۸، سائز ۱۲ / ۸، صفحات ۱۲۸، سطر ۱۵۔ خط نستعلیق مصنف شیخ محمد حفیظ، حفیظ تاریخ تصنیف قبل سنہ ۱۲۲۰ھ اس کے بعد حفیظ کے مختصر احوال بیان کیے گئے ہیں۔

آغاز : یہہ آسمان حباب ہے دریائے ذات کا
خورشید ایک ذرہ ہے اس کی وفات کا

اختتام : ضبط کہاں حفیظ ناک میں دم آگیا
زیست کی تدبیر یہاں کچھ تو کیا چاہیے

ترقیمہ : تمام شد دیوان اول شیخ محمد حفیظ برائے مہاراجہ بالا پرشاد بہادر۔ اسی طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حفیظ کے باقی دواوین کے نسخوں کی کیفیات بیان کی ہیں۔ جس سے نسخوں میں پائے جانے والے فرق کا اظہار ہوتا ہے۔ مختلف دواوین کے جائزے کے بعد دیوانِ حفیظ کی تدوین کی ضرورت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"حفیظ کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق عظیم شاعر تھے یہ اور بات ہے کہ زمانے نے ان کی قدر ہی نہیں کی ہم لوگ روایتاً مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے زندگی میں کسی شاعر یا ادیب کی قدر نہیں کی کم سے کم اب مرنے کے بعد حفیظ کے کلام کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیے تاکہ ادب میں ان کا مقام متعین کیا جاسکے"۔ (۲۶)

تدوین متن کے مقدمے میں شاعر یا ادیب کے حالاتِ زندگی کا بیان، اس کے دیوان کے نسخوں کی تفصیلات کے بعد اگلا مرحلہ شاعر کے کلام کا جائزہ ہوتا ہے۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ حفیظ" کے مقدمے میں حفیظ کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ان کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ چناں چہ حفیظ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ حفیظ فارسی اور عربی میں دست رس رکھتے تھے۔ انھوں نے بعض اشعار میں ہندی الفاظ بھی مہارت سے استعمال کیے ہیں۔

کیا کام یقین سے حفیظ اہلِ کرم کو
ہر قوم میں شہرہ ہے مہارا کے پن کا (۲۷)

حفیظ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں شعر و سخن کی اہمیت کی باتیں بھی ملتی ہیں۔

نہ ہوں دو چار شعر عاشقانہ جس میں پڑھنے کو
غزل دیوان سے وہ ہم نظر انداز کرتے ہیں (۲۸)

دبستانِ لکھنو کے زیرِ اثر سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کا رواج شمالی ہند کے شعرا کے ساتھ حیدر آباد میں بھی عام ہونے لگا تھا۔ حفیظ کے علاوہ مہاراجہ چندو لال شاداں نے شاہ نصیر کی بھی سرپرستی کی تھی اور ان کی مشکل پسندی کو حل کرنے میں مہاراجہ کو مزہ آتا تھا۔ ایسے ماحول میں رہ کر بھی حفیظ نے اپنے دہلوی رنگ کو برقرار رکھا اور سادگی و سلاست کا دامن نہیں چھوڑا۔ چھوٹی اور رواں بحروں میں حفیظ کی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ساقی میرے ہی دل کی طرف تو نگاہ کر — لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا
بیٹھا تھا خضر آ کے مرے پاس ایک دن — گھبرا کے اپنی زیست سے بیزار ہو گیا (۲۹)

میر، انیس اور غالب نے شاعری میں اپنی بڑائی کے جو دعوے کیے تھے اسی طرح کی تعلی حفیظ کے ہاں بھی ملتی ہیں:

میر:

سارے عالم پہ ہوں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

انیس:

سبک ہو چلی تھی ترا زوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

غالب :

گنجینۂ معانی کا طلسم اس کو سمجھے   جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

حفیظ :

مسلسل شعر ہیں قابلِ تحسین حفیظ اپنے   سراسر طبع اس کی دیکھیے موتی پروتی ہے (۳۰)

پروفیسر اکبر علی بیگ، حفیظ کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اظہارِ بیاں کی سادگی سلاست، روانی اور تاثر کی فراوانی ہے وہ اپنے مشاہدات، محسوسات اور جذبات کا اظہار سیدھی، سادی زبان میں کرتے ہیں۔

گرفتار بتاں ہے دل ہمارا
عزیزو اب کہاں ہے دل ہمارا
ہجر کے مرحلوں کو طے کر ڈال
پھر قدم منزل وصال میں ہے (۳۱)

حفیظ کے کلام میں اخلاق و حکمت، فلسفہ و تصوف، انسانیت دوستی، وسیع النظری، یک جہتی اور بھائی چارگی کی تلقین ملتی ہے۔

کثرت ہی تو نمونہ، وحدت ہے صاف صاف
انسان آئینہ ہے خدا کی دلیل کا

حفیظ نے اپنے مربی و محسن مہاراجہ چندو لال شاداں کی تعریف میں بھی کافی شعر کہے ہیں۔ چند رباعیاں بھی اس ضمن میں ملتی ہیں:

اے مہاراج میری چند سے سو چند بنام
ہند سے تابع دکن وصف تیرا روم سے شام
تہنیت سال گرہ کی ہو مبارک ہر سال
بالا پرشاد کے سر پر تیرا سایہ ہو مدام (۳۲)

یہ رباعی چندو لال شاداں کے فرزند بالا پرشاد کی سال گرہ پر کہی گئی تھی۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ حفیظ کی غزلوں کے علاوہ ان کے کلام میں چار رباعیاں ملتی ہیں۔ حفیظ کے کلام کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ حفیظ" کی تدوین کے مراحل بیان کیے اور لکھا کہ نسخہ "ب" دیگر نسخوں کے مقابلہ میں قدیم ہے اور اس میں غلطیاں بھی کم ہیں۔ لہٰذا اسے اساسی نسخہ بنایا گیا۔ لیکن تمام نسخوں سے مقابلہ کرتے ہوئے کلام مرتب کیا گیا۔ دیوانِ حفیظ کی تدوین کے دوران املا کے استعمال کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "ک اور گ کو ایک مرکز لگایا گیا تھا مثلاً درکاہ (درگاہ)، چناں چہ تدوین کے بعد ک اور گ کو موجودہ خط کے اعتبار سے الگ الگ کیا گیا۔ یائے معروف اور یائے مجہول کو مروجہ املا کے مطابق درست کیا گیا۔ غیر منقوط نون کی جگہ نوں لکھا گیا۔ ٹ، ڈ، ڑ، کو پہلے چار نقطوں کے ساتھ ٹ، ڈ، ڑ، لکھا جاتا تھا۔ اس طرح کے الفاظ کو مروجہ طریقہ کے مطابق درست کیا گیا۔ آزاد لفظ جو ملا کر لکھے گئے تھے انھیں الگ الگ لکھا گیا جیسے ہوشمیں کو ہوش میں لکھا گیا پیش کی حرکت ظاہر کرنے کے لیے اکثر واؤ کا استعمال کیا گیا تھا مثلاً اُوس، کو اس اسے جدید املا کے تحت توڑ مروڑ کر لکھے گئے املا کو درست کیا گیا۔

قدیم متون کو پڑھنے کے سلسلے میں آنے والی دشواریوں کا تذکرہ جس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ لطف" کے مقدمے میں کیا تھا ہو بہو انھی الفاظ میں تدوین متن کے مسائل بیان کیے اور "دیوانِ لطف" میں تدوین کے طریقہ کار کو "دیوانِ حفیظ" میں من و عن نقل کیا گیا۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لطف اور حفیظ کا زمانہ تقریباً ایک تھا۔ دونوں شمالی ہند کے شعرا حیدرآباد آکر بس گئے تھے۔ لہٰذا دونوں کی زبان میں یکسانیت کے پیشِ نظر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو دونوں شعرا کے متون کی تدوین کے دوران یکساں قسم کے رسم الخط کے سبب یکساں مسائل در پیش آئے۔ مقدمہ کے آخر میں انھوں نے "دیوانِ حفیظ" کی اشاعت میں تعاون کرنے والوں مسٹر این آر وی پرساد ڈائرکٹر اورینٹل مین اسکرپٹ آندھرا پردیش حیدرآباد، پروفیسر مغنی تبسم اور کرامت علی خاں ریسرچ آفیسر کا شکریہ ادا کیا ہے۔ "دیوانِ حفیظ" کے مقدمے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "حفیظ" کی غزلوں کی تعداد اور کل اشعار کی تعداد نہیں بتائی۔ جب کہ "دیوانِ لطف" میں

غزلوں کی تعداد، اشعار کی تعداد، رباعیوں اور قصائد کی تفصیلات بتائی تھیں۔ دیوانِ حفیظ میں البتہ انھوں نے حفیظ کی غزلیں ردیف وار پیش کی ہیں۔ ردیف الف سے لے کر ردیف "ی" تک جملہ ۱۸۹ صفحات پر غزلیں اور متفرق اشعار دیے گئے ہیں ۱۳ پر ردیف ا کی ایک غزل دی گئی ہے اور فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ دیا گیا ہے۔ حفیظ کی غزل کے اشعار یوں ہے:

نیرنگ ہے انداز تیری یار نگاہ کا　　　بندہ ہے ہر ایک کا فرد دین دار نگاہ کا

یوسف کا وہاں کون خریدار نگاہ کا　　　جس جا پہ تیرا کرم ہے بازار نگاہ کا

اک خلق خدا جاں بلب آئے یہ نہ دیکھا　　　تل پہ بت کافر تیرا انکار نگاہ کا

گلگشت ہے اور دید ہے نرگس کے وہاں تو　　　ملتا ہے یہاں خاک میں بیمار نگاہ کا

جیوں عکس نکل جائے ہے آئینہ سے اوپر　　　یوں تیر ہوا دل سے میرے یار نگاہ کا

سکتہ سا مسیحا کو رہا دیر تلک آہ　　　دیکھا جو سکتا تیرا بیمار نگاہ کا

پیکاں سی کھٹکتی ہے حفیظ آہ جگر میں

کیا درد کریں آپ سے اظہارِ نگاہ کا (۳۳)

اس غزل کے مقطع کے اختلاف نسخ بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ "نسخہ ا میں" پیکاں سی کھٹکتی ہے حفیظ اپنے جگر میں لکھا ہے:

"دیوانِ حفیظ" کے اس مدونہ نسخہ میں بیش تر صفحات پر ایک تا دو غزلیں دی گئی ہیں۔ لیکن فٹ نوٹ میں صرف ایک شعر یا ایک لفظ کے بارے میں وضاحتی نوٹ ملتا ہے۔ پورے دیوان میں قیاسی تصحیح بہت کم ہے۔ اختلافاتِ نسخ میں اکثر جگہ کسی شعر کے کسی نسخے میں نہ ہونے کا ذکر ہے۔ آخری پچاس ساٹھ صفحات میں فٹ نوٹ نہیں ہے۔ یعنی اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ حفیظ کے دیوان کا یہ حصہ اس حالت میں ملا کہ اس میں کسی قسم کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بعض جگہ فٹ نوٹ میں "نسخہ ا" میں بیش تر غزلوں کی عدم موجودگی کی

اطلاع دی گئی ہے۔ مثلاً ص ۹۰، پر ردیف "ے" کی دو غزلیں ہیں اور فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ نسخہ "ا" میں یہ غزلیں موجود نہیں۔ ردیف "ے" کی غزلوں کے ساتھ یہ "دیوانِ حفیظ" کا اختتام عمل میں آتا ہے۔ "دیوانِ لطف" میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کتاب کے آغاز میں لطف کے کلام کے مخطوطہ کے صفحہ کا عکس بھی دیا تھا۔ لیکن "دیوانِ حفیظ" کے آغاز میں کسی نسخے کے کسی صفحہ کا عکس نہیں دیا گیا اور نہ ہی کتاب کے آخر میں فرہنگ دی گئی ہے۔ حفیظ، لطف کے معاصر شاعر تھے اور ایک ہی زمانے کے شعرا کے کلام میں اتنا فرق نہیں ہوسکتا کہ لطف کے کلام کو سمجھنے کے لیے فرہنگ کی ضرورت محسوس ہو جب کہ حفیظ کے کلام کو سمجھنے کے لیے فرہنگ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ حفیظ کے کلام میں بھی جا بجا ایسے الفاظ ملتے ہیں جو موجودہ دور میں متروک ہیں اور انھیں سمجھنے کے لیے وضاحتی نوٹ اور فرہنگ کی ضرورت ہے۔ چناں چہ "دیوانِ حفیظ" کی تدوین کا کام "دیوانِ لطف" کی تدوین کے مقابلے میں بہت سی کمیوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے باوجود حفیظ کے کلام کو یکجا کر کے اسے محفوظ کر دینا یہ بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جائے گا۔

○

- **"ید بیضا" از برق موسوی۔ ترتیب و مقدمہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ:**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ لطف" اور "دیوانِ حفیظ" کی تدوین کے علاوہ برق موسوی کے کلام کو "ید بیضا" کے عنوان سے مبسوط مقدمہ لکھ کر ترتیب دیا ہے۔ یہ برق موسوی کا غیر مطبوعہ کلام تھا۔ برق موسوی مرتب کے منجھلے ماموں تھے اور اس عنوان سے ایک خاکہ بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکوں کی کتاب "خوش نفساں" میں لکھا ہے۔ برق موسوی کا یہ کلام "ید بیضا" کے عنوان سے ۱۱/ستمبر ۱۹۹۵ء کو دکن پرنٹرس اعظم پورہ حیدر آباد سے ادارہ شعر و حکمت کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ کتاب کے

آغاز میں برق موسوی کی سیاہ و سفید تصویر ہے۔ فہرست مشمولات میں پیش لفظ از پروفیسر غلام عمر خاں، تاثرات از پروفیسر مغنی تبسم صاحب، برق موسوی ایک تاثر از قمر ساحری صاحب اور مقدمہ از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بعد چار عنوانات جذب و تپش، انقلاب و ارتقاء، مسکراتے آنسو اور گنگناتی آہیں کے تحت برق موسوی کا کلام دیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب برق موسوی کے بھانجے اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے چچا زاد بھائی جناب عامر موسوی مرحوم کے نام کیا گیا ہے۔ نیچے ان کا آخری شعر دیا گیا ہے جو اس طرح ہے:

رحمت ہے گویا درد کی شدت بھی یا خدا

بے اختیار لب پہ تیرا نام آگیا

اگلے صفحے پر عامر موسوی کی سیاہ و سفید تصویر دی گئی ہے۔

"ید بیضا" کا پیش لفظ پروفیسر غلام عمر خاں نے لکھا۔ جس میں انھوں نے برق موسوی کا تعارف کراتے ہوئے انھیں اردو اور فارسی کا قادر الکلام شاعر قرار دیا۔ ان کی لفظیات کو اصغر، فانی اور یگانہ کی لفظیات سے ملتی جلتی قرار دے کر ان کی نظموں کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> "برق کی متعدد نظمیں جو انھوں نے ہندستان اور عالمی سیاست کے دیکھتے ہوئے مسائل پر کہی تھیں ان موضوعات پر اردو شاعری کی منتخب نظموں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ طاقت ور قوموں کی استعماریت، سرمایہ پرستی، انسانیت کے مظلوم اور پسماندہ طبقات کے مسائل کو جب وہ اپنا موضوع بناتے ہیں تو ترقی پسند شاعروں کے متعدد اماموں کی بے جان شاعری کے مقابلے میں ان کے اشعار فکر کی صداقت اور جذبے کی حرارت سے معمور نظر آتے ہیں۔ "دولت پرستی"، "انقلاب"، "نیا زمانہ"، "بنگال کا قحط"، "فلسطین اور گاندھی" ان کی پُراثر نظموں میں شامل ہیں"۔ (۴۴)

پروفیسر غلام عمر خاں کے پیش لفظ کے بعد تاثرات کے عنوان سے پروفیسر مغنی تبسم کے تاثرات ملتے ہیں۔ اس میں انھوں نے برق موسوی کے مختصر تعارف کے بعد "ید بیضا" پر طائرانہ نظر ڈالی ہے اور لکھا کہ کتاب

کے چار حصے چار ادوار کی شاعری پیش کرتے ہیں پہلا حصہ "جذب و یقیں" کی نظمیں اہلِ بیت اطہار سے متعلق ہے۔ اس میں مناقب سلام اور قصائد بھی ہیں۔ دوسرے حصہ میں "انقلاب اور ارتقاء" کے عنوان سے سیاسی اور اخلاقی نظمیں دی گئی ہیں تیسرا حصہ "مسکراتے آنسو" میں عشقیہ نظمیں ہیں اور چوتھے حصہ "گنگناتی آہوں" میں غزلیں موجود ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم برق موسوی کے کلام سے چند اشعار منتخب کیے اور انھیں تشبیہ نگاری میں ندرت رکھنے والے اشعار قرار دیا۔ چند اشعار اس طرح ہیں:

مجھ کو خیر خواہی کی آس کیا کسی سے ہو
خیر سے نہیں میں بھی اپنے خیر خواہوں میں

ایسی ہی گر کم التفاتی ہے
جان لیجیے کہ جان جاتی ہے

نہ جانے اور میرے دل کی آرزو کیا ہے
میں تجھ سے مل کے بھی ایک لمحہ چین پا نہ سکا

مسکراتی ہوئی اجل آئی
شکر ہے اٹھ گیا نقاب ان کا (۳۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مرتبہ اس کام کی اہمیت اور ستائش کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اپنے ماموں کے غیر مطبوعہ کلام کو مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ حضرت برق موسوی کی شاعری کے تمام مجموعے اب کم یاب بلکہ نایاب ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کا کلیات نہ سہی کم از کم ان کے کلام کا ایک جامع انتخاب مرتب کر کے شائع کیا جائے یقین ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اس اہم کام کی طرف توجہ بھی دیں گے"۔ (۳۶)

برق موسوی کے کلام پر پروفیسر مغنی تبسم کے تاثرات کے بعد قمر ساحری کے تاثرات ملتے ہیں جو برق

موسوی کے دیرینہ رفیق رہ چکے ہیں۔ قمر ساحری نے برق موسوی سے اپنی رفاقت کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنے دوست کی شاعری کی تفصیلات بیان کیں اور لکھا کہ ترقی پسند تحریک کے شباب کے زمانے میں بھی برق موسوی نے اعتدال کو اپنا کر شاعری کی تھی۔ زمانے کی ناقدری کے بارے میں برق موسوی کے خیال کو پیش کرتے ہوئے قمر ساحری لکھتے ہیں:

"برق موسوی طبعاً خاموش، کم آمیز اور وضع دار قسم کے شاعر تھے۔ ان کے درج ذیل شعر میں:

یہ وقت تھا فصل کاٹنے کا
میں ہوں کہ ابھی بیج بو رہا ہوں

معاشرہ کی ناقدری کا شکوہ ہی نہیں بلکہ ایسے تمام شاعروں کی حسرت و حرماں نصیبی کی آخری آواز بھی شامل ہے جو اپنی محنتِ مسلسل کے باوجود اپنے بوئے ہوئے تخم ہائے سخن کی فصلوں کو نہیں کاٹ سکے اور آخر کار اپنی کشتِ سخن کو موسموں کی دھوپ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر سایہ گاہِ آخرت کی طرف روانہ ہوگئے"۔ (۳۰)

قمر ساحری کے تاثرات کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مقدمہ کا آغاز ہوتا ہے۔ میر کاظم علی برق موسوی کے آباد و اجداد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ یہ ان کے بزرگانِ سلف شرفاء و امراء کے زمرہ سے تھے اور ان کے جدِ اعلیٰ سید ہاشم موسوی شاہ جہاں کے عہد میں خراساں (ایران) سے شاہ جہاں آباد دہلی آئے تھے۔

میر کاظم علی کے آباد و اجداد کی تفصیلات بتانے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خود میر کاظم علی برق موسوی کے احوال بیان کیے اور لکھا کہ ۵ ؍ مارچ ۱۹۲۰ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر نادر علی رعد مرحوم سابق ریاست حیدر آباد میں گزیٹیڈ طبیب تھے۔ کاظم علی کے علاوہ ان کی اولاد میں چار صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں تھیں۔ رعد بھی ایک صاحب دیوان شاعر تھے جنھیں نظم طباطبائی سے تلمذ رہا تھا۔

برق موسوی کم عمری ہی میں ماں کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ بعد میں وہ اپنی سوتیلی ماں سعید النساء کے

زیرِ پرورش رہے۔ ان کے والد صاحب پیشہ کی مصروفیات کی وجہ سے بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دے سکے۔ اس لیے برق کی کوئی سندی تعلیم نہیں ہو سکی حالاں کہ ان کے دوسرے بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی تھی۔ لیکن برق نے وسیع مطالعہ سے اعلیٰ قابلیت واستعداد حاصل کرلی تھی اور پندرہ سال کی عمر سے شاعری کرنے لگے تھے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ برق شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں رہے اور نہ ہی ان کی شاعری اکتسابی تھی۔ انھوں نے جوش ملیح آبادی کا بہ طور خاص مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے کلام میں جوش کے اثرات کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ برق کے نانا انھیں طبیب بنانا چاہتے تھے لہذا ان کا داخلہ نظامیہ کالج میں کرا دیا تھا لیکن برق کالج کے جلسوں، کانفرنسوں اور سمیناروں میں بہ حیثیت شاعر مشہور ہوتے گئے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے زمانہ ،طالبِ علمی کا کلام کا نمونہ پیش کیا۔ پڑھنے میں ان کی عدم دل چسپی دیکھ کر ان کے والد نے پہلے انھیں ملازمت میں مصروف کر دیا اور پھر بعد میں ان کی شادی کرا دی۔ ان کی شادی کے رقعہ کی نقل مقدمہ میں شامل کی گئی۔ شادی کے موقع پر برق کے والد نے بیٹے کے لیے سہرا پڑھا۔ برق کے حالات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے خاکہ مشمولہ "خوش نفساں" میں بیان کیے تھے۔ لہذا "ید بیضا" میں شامل ان کے حالاتِ زندگی سے قطع نظر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی جانب سے ان کے کلام کے جائزے کی تفصیلات پیش کرنا مناسب رہے گا۔ اس تعلق سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ برق موسوی فارسی زبان پر نہ صرف قدرتِ کاملہ رکھتے تھے بلکہ اس زبان سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ ایران وہندستان کے جریدوں میں ان کا فارسی کلام شائع ہوتا تھا۔ حکومت ایران کی دعوت پر وہ ایران بھی گئے تھے "بزم سعدی" نے جس کے وہ نائب صدر تھے ان کی فارسی کتاب" یادگار ولا "شائع کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ برق موسوی کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ وہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ انھیں علم عروض پر خاصہ عبور حاصل تھا۔ شعر پڑھتے ہی اس کے اسقام کو گرفت میں لے لیتے تھے۔ فن کی کسوٹی پر برق موسوی یگانہ چنگیزی، فیض، فراق، مخدوم، وحید اختر، عدم جیسے شاعروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ برق موسوی کی ملازمت کے احوال بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی تخلیقات کی تفصیلات پیش کی ہیں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

عقل و جنون (اردو مجموعہ کلام اشاعت ۱۹۴۰ء) ، کنول (رومانی نظموں کا مجموعہ اشاعت ۱۹۴۳ء) ، گلبانگ (اردو غزلوں کا مجموعہ) ، فرداب و فرناب (اردو رباعیوں کا مجموعہ اشاعت ۱۹۶۶ء) نغمہ و الہام (فارسی نظموں کا پہلا مجموعہ اشاعت ۱۹۶۹ء) ، ارزندہ و زندہ (فارسی نظموں کا دوسرا مجموعہ اشاعت ۱۹۷۵ء) ، دین یار جنگ (نواب دین یار جنگ کی سوانح) ، یادگارِ ولا (نواب عزیز جنگ ولا کی سوانح) ۔

غیر مطبوعہ مجموعے۔ • شاہکار و ابتکار (اردو) • نغز و مغز (فارسی)

• یدِ بیضا (اردو) • لوح و قلم (فارسی خطوط)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ برق موسوی کا انتقال ۹ / جنوری ۱۹۷۹ء کو ہوا۔ ان کی شخصیت اور سیرت بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ برق موسوی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظم گوئی کے بارے میں انھوں نے ان خیالات کا اظہار کیا:

"نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی طرح برق کے یہاں بھی حقائقِ زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں "یدِ بیضا" میں شامل درج ذیل نظمیں اہمیت رکھتی ہیں۔ ہم لوگ، شہرت، عبادت، بڑھے چلو، مغرور امیر، گندم بوئیں جو کاٹیں، اردو میں نظم نگاری کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے ہوتا ہے۔ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد حالی کا شمار اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے آزاد اور حالی کے بعد اسماعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال، جوش اور دوسرے شعرا نے اردو نظم کے دامن کو وسعت دی۔ برق موسوی نے بھی مذکورہ بالا شعرا کی ڈگر پر چل کر سیدھے سادے اسلوب میں بڑی حکیمانہ باتیں بیان کی ہیں"۔ (۳۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ برق موسوی نے فی البدیہہ نظمیں کہی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف اہم شخصیات کے بارے میں نظمیں کہی ہیں۔ ان میں محمد علی جناح مصطفیٰ کمال اتاترک، پریم چند، اقبال وغیرہ۔ اقبال کے بارے میں برق کی نظم کے اشعار اس طرح ہیں:

ضربِ کلیم، سرِ خودی، رمزِ بے خودی   تیری نشانیوں سے ہے دنیا بھری ہوئی
پیامِ مشرق، بانگِ درا علم اقتصاد   تا حشر ہم کو تیری دلاتے رہیں گے یاد
جاوید نامہ، فلسفہ، مسلم و عجم   اور بالِ جبرئیل کو دیکھیں گے جب کہ ہم
لیں گے دعائے خیر سے اقبال تیرا نام
تیری نشانیوں کا کریں گے ہم احترام (۳۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے برق کی نظم نگاری کا جائزہ لینے کے بعد ان کی رباعیات کا جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ ان کے رباعیات کا مجموعہ "فرداب و فرتاب" کی تمام رباعیات ایجاز و اختصار کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ برق نے اپنی رباعی کے تین مصرعوں کو پس منظر قرار دیتے ہوئے چوتھے مصرعہ میں اصل تصویر پیش کی ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بہ طور انتخاب برق کی ایک رباعی مقدمہ میں پیش کی ہے۔ جس سے برق کی رباعی گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

احساس کے دریا میں سدا بہتا ہوں   اپنے ہوں کہ غیر سب کا دکھ سہتا ہوں
منبر پر پہنچ کے کہنے والے ہیں بہت
میں دار پر چڑھ کے حرفِ حق کہتا ہوں (۴۰)

برق موسوی نے قطعات بھی لکھے تھے اور تاریخیں بھی نکالی تھیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے برق نے جو تاریخیں نکالیں ان کی چند مثالیں پیش کی ہیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ برق موسوی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ وہ ایک اچھے خطاط بھی تھے اور ید بیضا کی خطاطی اور کتابت انھوں نے اپنے قلم سے ہی کی تھی۔

"ید بیضا" کی موضوعاتی تقسیم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ پہلے حصہ "جذب و یقین" میں تین سلام اور ۱۳ نظمیں ہیں۔ دوسرے حصہ "انقلاب و ارتقاء" میں ۲۲ نظمیں ہیں۔ تیسرے حصہ میں ۱۳ نظمیں اور حصہ کا نام "مسکراتے آنسو" رکھا گیا ہے اور چوتھے حصہ "گنگناتی آہیں" میں ۶۳

غزلیں ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے برق موسوی کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کرتے ہوئے ان کے کلام پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

"برق موسوی کی غزل کا لب و لہجہ درد و غم اور سوز میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے، چھوٹی بحروں اور سہل ممتنع میں برق موسوی کا کلام ان کو صف اول کے شعرا میں لا کھڑا کیا ہے۔ ۔ ۔ برق موسوی کی عشقیہ شاعری کے نمایاں عنصر عیش و نشاط اور مسرت و انبساط کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں رنج و الم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ برق موسوی کے اس رنج و غم کا محرک غمِ جاناں ہے اسی حزن میں وہ ایسے شعر کہہ جاتے ہیں جو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں"۔ (۴۱)

برق موسوی کے کلام سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے منتخبہ اشعار اس طرح ہیں:

نہ سنو برق کے گیتوں میں دھرا ہی کیا ہے | گنگناتی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
بھر دی ہے غزل میں دل کی دھڑکن میں نے | تنقید بھی، تعمیر بھی، پیغام بھی ہے
کبھی ہم نے یہ بیج اگتے نہ دیکھے | کوئی بھول کر تخمِ ارماں نہ بوئے
دوست کی تجلی ہے کعبہ ہی میں کیوں محدود | بتکدہ بھی داخل ہے اس کی جلوہ گاہوں میں
کوئی اس دیر آشنا سے کہے | زندگی کی بہار جاتی ہے
غرور مانع اظہار ہو تو ہو لیکن | ضرور دل میں تمھاری مری محبت ہے
وہ بھی ہیں اپنی آن پر قائم | اپنی بھی وضع داریاں نہ گئیں
ذکر کیا برق موسوی پن کا | پاپ بھی ہے ہم سے گت کا ہو نہ سکا
ساری پابندیاں ہیں سچ کے لیے | جھوٹ پر کوئی احتساب نہیں
یہ گماں تک نہ تھا کہ وہ مجھ کو | اس قدر جلد بھول جائیں گے
ہم کہاں برق موسوی ایسے | جو زمانے کو یاد آئیں گے (۴۲)

"ید بیضا" کے مقدمہ کے آخر میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کتاب کی اشاعت میں تعاون

کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ "ید بیضا" کی ترتیب و اشاعت کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بیسویں صدی کے حیدرآباد کے ایک صاحبِ طرز شاعر کے کلام کو عوام تک پہنچانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ حیدرآباد کے علاوہ ہندستان میں ایسے بے شمار شعرا کا کلام گوشہ، گم نامی میں پڑا ہوا ہے۔ اگر اردو کے محققین اور مرتبین پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شعرا کے دواوین مرتب کریں تو اس سے اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوسکتا ہے۔ "ید بیضا" کی اشاعت سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے شاعر کے کلام کو مرتب کیا جس کا کلام سہلِ ممتنع کے علاوہ دبستانِ دہلی کی خصوصیات کا حامل ہے۔ "ید بیضا" شعری مجموعہ میں شامل برق موسوی کی یہ غزل ان خیالات کی تصدیق کرسکتی ہے۔

کبھی جی کھول کر میں رو نہ سکا　　اپنے دل کا غبار دھو نہ سکا

عمر فکر معاش ہی میں کٹی　　بیج حسنِ عمل کے بو نہ سکا

کیا ہوا، ہم سے اور کیا نہ ہوا　　سچ تو یہ ہے کہ کچھ بھی ہو نہ سکا

دل و جاں، دین و آبرو کیا ہے!　　کیا وہ پائے گا خود جو کھو نہ سکا

تم نے چاہا تھا جو، وہ ہو کے رہا　　ہم نے چاہا تھا جو وہ ہو نہ سکا

ذکر کیا برق موسوی پن کا

پاپ بھی ہم سے گت کا ہو نہ سکا (۴۳)

برق موسوی چوں کہ دورِ حاضر کے شاعر ہیں اور ان کا کلام موجودہ دور کے شعرا کے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں ایسے کوئی مشکل یا متروک الفاظ نہیں ہیں جن کی وضاحت کے لیے فرہنگ کی ضرورت ہے۔ اس لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "ید بیضا" میں فرہنگ نہیں دی۔ ویسے قدیم متون کی تشریح اور وضاحت کے لیے فرہنگ دینے کا رواج پایا جاتا ہے۔ "ید بیضا" کی ترتیب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے برق موسوی کی ترتیب کو برقرار رکھا۔ اگر وہ چاہتے تو غزلوں کو ردیف وار تقسیم کرسکتے تھے۔ جیسا کہ انھوں

نے حفیظ دہلوی کے کلام میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ " ید بیضا " سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ برق موسوی نے اس مجموعہ میں شامل مختلف اصناف سخن کے تعلق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کس دور کا ہے جس سے شاعر کے ذہن کے تدریجی ارتقا اور اس کے اسلوب میں آنے والی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے باوجود " ید بیضا " اردو شعر و ادب کے ذخیرہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور اس مجموعہ کے ذریعہ برق موسوی کی بازیافت ہوتی ہے۔ جس کا سہرا پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے سر جاتا ہے۔

○

● **نظیر شناسی ۔ مرتبہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ اشتراک ڈاکٹر محمد علی اثر :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے شاعری میں " دیوانِ لطف " ، " دیوانِ حفیظ " اور " برق موسوی " کا کلام " ید بیضا " کی تدوین و ترتیب کا کام کیا ہے شاعری کی طرح نثر میں بھی انھوں نے " نظیر شناسی " کے عنوان سے اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کی حیات اور ان کے فن پر مختلف ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کے مضامین پر مشتمل کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ یہ کتاب دراصل انھوں نے اپنے رفیق ڈاکٹر محمد علی اثر کے تعاون سے ترتیب دی ہے۔ یہ کتاب گزشتہ پانچ دہوں میں نظیر کی شخصیت اور فن پر مختلف مکاتبِ فکر کی جانب سے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کو قدیم رسائل کی چھان بین کر کے یکجا کیا گیا ہے۔ " نظیر شناسی " کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں " ادارہ شعر و حکمت " کے اہتمام سے عمل میں آئی۔ اس کتاب میں جملہ ۲۳ مضامین ہیں۔ ان کے عنوان اور مضمون نگار کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) نظیر میری نظر میں (نیاز فتح پوری)۔ (۲) نظیر اور عوام (پروفیسر آلِ احمد سرور)۔ (۳) نظیر کی غزلیں (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)۔ (۴) ادبیاتِ اردو میں نظیر اکبر آبادی کا فنی ولسانی درجہ (سیماب اکبر آبادی)۔ (۵) نظیر اکبر آبادی اور ان کے نقاد (ڈاکٹر ابو محمد سحر)۔ (۶) میاں نظیر (ڈاکٹر شمیم حنفی)۔ (۷) نظیر اکبر آبادی اور ان کی زبان (فیض الرحمٰن اعظمی)۔ (۸) نظیر اکبر آبادی قومی یک جہتی کا علم بردار (راحت سلطانہ)۔ (۹) نظیر اکبر آبادی اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز (مجنوں گورکھپوری)۔ (۱۰) نظیر کی نظم نگاری (ڈاکٹر

ابواللیث صدیقی)۔ (۱۱) نظیر اکبر آبادی اپنے عہد کی پیداوار (ڈاکٹر ابو محمد سحر)۔ (۱۲) نظیر اکبر آبادی کی رباعیاں (ڈاکٹر سلام سندیلوی)۔ (۱۳) نظیر اکبر آبادی پر ایک عمومی تبصرہ (پروفیسر اختر اورینوی)۔ (۱۴) نظیر اکبر آبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقاء (پروفیسر احتشام حسین)۔ (۱۵) نظیر اکبر آبادی کی مثنویاں (پروفیسر گیان چند جین)۔ (۱۶) نظیر اکبر آبادی کی کائنات (جناب شمس الرحمٰن فاروقی)۔ (۱۷) تہذیبی دیدباز نظیر (پروفیسر گوپی چند نارنگ)۔ (۱۸) درخشاں ستارہ۔ نظیر (پروفیسر کلیم الدین احمد)۔ (۱۹) شاہ تراب چشتی۔ نظیر اکبر آبادی کا پیش رو (پروفیسر عبدالستار دلوی)۔ (۲۰) نظیر کی عظمت (ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر) (۲۱) اردو میں منظر نگاری کی روایت اور نظیر اکبر آبادی (ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ)۔ (۲۲) نظیر کی مختصر حالاتِ زندگی (ڈاکٹر محمد علی اثر)۔ (۲۳) کتابیاتِ نظیر اکبر آبادی (عارف مجاہد)۔

ان مضامین میں ابو محمد سحر کے دو اور ابواللیث صدیقی کے دو مضامین ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ کتاب اپنے استاد پروفیسر یوسف سرمست کے نام معنون کی ہے۔ سرورق کے اندرونی جانب دونوں صفحوں پر پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر عبدالستار دلوی کا تبصرہ ہے۔ کتاب میں "تعارف" کے عنوان سے پروفیسر غلام عمر خاں، پیش لفظ کے عنوان سے "پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور "عرض مرتبین" کے عنوان سے دونوں مرتبین ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر محمد علی اثر کے تاثرات شامل ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں نظیر ایک ایسے شاعر ہیں جن کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ عوامی شاعر تھے۔ لیکن ان کے حالاتِ زندگی اور ان کا کلام اچھی طرح محفوظ نہیں رہ سکا۔ نظیر کو اپنے زمانے میں جو مقبولیت تھی وہ بعد کے زمانے میں انھیں اس لیے حاصل نہیں ہو سکی کہ نظیر کے کلام کی تفصیلات آگے کے زمانے کے لیے محفوظ نہ رہ سکیں۔ اردو تحقیق میں نظیر پر بہت کم کام ہوا ہے۔ نظیر پر تحقیق کی گنجائش دیکھتے ہوئے "نظیر شناسی" کی اہمیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"نظیر اکبر آبادی کی حیات اور شاعری کے بارے میں مستقل نوعیت کا تحقیقی اور تنقیدی کام بہت کم ہوا ہے۔ "زندگانیِ بے نظیر" بڑی حد تک تخیلی سوانح ہے۔ مخمور اکبر

آبادی کی تصنیف نظیر شناسی کے سلسلے میں تعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظیر کی شاعری پر ناقدین نے وقتاً فوقتاً جو مضامین تحریر کیے ہیں۔ وہ رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے چند ایک مضامین اکٹھا کر کے اور چند نئے مضامین لکھوا کر ایک کتاب نظیر نامہ ترتیب دی تھی۔ یہ مضامین نظیر کی شاعری کا مکمل احاطہ نہیں کرتے اس کے علاوہ چند اہم ناقدین کے مضامین اس کتاب میں شامل نہیں جو نظیر کی تحسین اور قدر شناسی میں معاون ہوسکتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر محمد علی اثر نے نظیر کی شاعری پر تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ "نظیر شناسی" کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ جو ان کی تلاش و جستجو اور حسن انتخاب کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب میں مشمولہ مضامین نظیر کے فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نظیر کی شاعری سے دل چسپی رکھنے والے قارئین بالخصوص اردو ادب کے طالبِ علموں کے لیے یہ ایک مفید تالیف ہے"۔ (۴۴)

"نظیر شناسی" کے ڈسٹ کور پر ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے تاثرات ہیں۔ جس میں انھوں نے ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر محمد علی اثر کے تحقیقی کاموں کی ستائش کرتے ہوئے "نظیر شناسی" کی اشاعت پر اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے "تعارف" میں نظیر کا تعارف کرانے کے بعد نظیر پر ہوئے تحقیقاتی کاموں کا جائزہ لیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے عوامی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"نظیر کو عوامی شاعر کہا گیا ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ وہ خود بھی عوامی زندگی کے ہنگاموں، عوام کی ہنسی، قہقہوں، ان کے سکھ دکھ، ان کے کھیل تماشوں اور تفریحات میں برابر کے شریک تھے جذبہ۔ حیات اپنی سادہ حقیقتوں کے ساتھ جس طرح عوامی زندگی میں رقص کناں ہوتا ہے اس کی حقیقی اور تصنع سے عاری تصویر نظیر کے کلام میں ملتی ہے عوامی زندگی کی ایسی بھرپور عکاسی جب کہ ایسی کوئی روایت بھی موجود

نہ تھی نظیر کی فن کاری کا اعجاز ہے"۔ (۴۵)

نظیر شناسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام عمر خاں آگے لکھتے ہیں:

"اکبر اور اثر گہرے دوست ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انھوں نے تحقیق و تصنیف کے میدان میں بھی اپنی رفاقت و اشتراک کا ایک اہم نقش چھوڑا ہے۔ گزشتہ پانچ دہوں میں نظیر کی شخصیت اور فن پر جو اہم مضامین لکھے گئے ہیں انھیں قدیم رسالوں وغیرہ کی چھان بین کر کے یکجا کر دیا گیا ہے مضامین کے انتخاب میں مختلف مکاتب فکر کے ناقدوں کی نمائندگی کا التزام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مختلف اصناف سخن میں نظیر نے اپنے فن کے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کے تنقیدی جائزے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں آخر میں نظیر پر تحریر کردہ سارے مضامین وغیرہ کی ایک بسیط کتابیات بھی شامل ہے۔ مضامین کے جامع انتخاب کی وجہ سے اس کتاب کی حیثیت ایک ایسی دستاویز ہو گئی ہے جس کی مدد سے نظیر کی شخصیت اور فن کا ہمہ جہتی جائزہ ممکن ہے"۔ (۴۶)

"نظیر شناسی" کا پیش لفظ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا اور نظیر کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالی کے اگر نظیر بھی عربی فارسی باقاعدہ پڑھ لیتے اور زمانے کے مزاج کے مطابق شاعری کرتے تو ان کی شاعری بھی بھاری بھرکم، بوجھل اور روایتی ہو جاتی اور یہ کہ ان کا کم پڑھا لکھا ہونا ان کے حق میں اچھا ہی ہوا نظیر کی شاعری میں موضوعات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو رنگا رنگی ملتی ہے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

"اپنی آنکھ سے دیکھتے ہوئے اور اپنے قلب سے محسوس کرتے ہوئے نظیر نے جس سرشاری کے ساتھ اور جس طرح محظوظ ہوتے ہوئے زیست کی اور زیست کرنے کا سلیقہ دیا آیا وہ کسی فکر اور فلسفہ سے کم ہے؟ نظیر کے ہاں زندگی اپنے تمام رنگ رس کے ساتھ ملتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ نظیر کی شخصیت اور شاعری دونوں کو ان کے عہد کی زندگی اور زبان سے جدا کر کے

دیکھا ہی نہیں جاسکتا، دیکھنا بھی نہیں چاہیے "۔ (۴۷)

"عرضِ مرتبین" کے عنوان سے "نظیر شناسی" کے مرتبین پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ و ڈاکٹر محمد علی اثر نے کتاب میں شامل مواد کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پیش نظر مجموعے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ نظیر پر لکھنے والے سارے اہم ناقدوں کی تحریریں شامل ہوں۔ اس امر کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر قسم کے نقطہ ٔ نظر رکھنے والے نقادوں کی نمائندگی ہو۔ اردو کے مختلف اصناف سخن میں نظیر نے جو تخلیقی کام انجام دیا ہے اس کے تنقیدی جائزے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں "۔ (۴۸)

"نظیر شناسی" میں شامل مضامین کے تنوع سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کی حیثیت ایک آفاقی شاعر کی سی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے نظیر کے دست یاب حالاتِ زندگی جمع کرتے ہوئے اپنے مضمون کے ذریعہ نظیر کی حیات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ایک زمانے تک نظیر گوشہ گم نامی میں رہے تھے۔ جب محققین نے ان کی جانب توجہ کی اور ان کے حالاتِ زندگی اور کلام کی کھوج ہوئی تو رفتہ رفتہ نظیر کی عظمت سامنے آئی۔ نظیر شناسی کا ایک اور اہم مضمون عارف مجاہد کا "کتابیات نظیر" ہے۔ جس میں ان تمام کتابوں، رسائل اور اخبارات و جرائد کا احاطہ کیا گیا ہے جن میں نظیر کے تعلق سے مواد دست یاب ہوسکتا ہے۔ نظیر کے بارے میں یہ کتابیات نظیر یا ان کے دور پر کام کرنے والے محققین کے لیے کافی سود مند ثابت ہوسکتی ہیں۔ نظیر کی شاعری قومی یک جہتی کی علم بردار ہے۔ نظیر نے ہندستان کی رنگا رنگی کی طرح اپنے کلام میں تمام تہذیبوں کے رنگوں کو سمولیا ہے۔ ان کی شاعری کے اس پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے راحت سلطانہ لکھتی ہیں:

"نظیر ہندستانیت کے بہت بڑے پرستار ہیں۔ ان کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ . . نظیر اردو کے بہت بڑے عوامی شاعر ہیں۔ مساوات، یک جہتی اور انسان دوستی ان کا سب سے اہم موضوع ہے۔ وہ انسان کو بہترین مظہرِ الوہیت سمجھتے ہیں معمولی انسان اور غریب شہری بھی چاہے وہ کسی بھی

مذہب کا ماننے والا ہو ان کے نزدیک اہمیت کا حامل ہے اس کی وہ بادشاہوں سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان قلوب کی پُر اسرار صناعی اور تقدیروں کی ناقابلِ قیاس ظلمت و نور کے مظہر صرف عالی شان محل اور ایوان ہی نہیں بلکہ ان کا مظہر ہر جھونپڑے میں جہاں انسان بستا ہے ہوسکتا ہے"۔ (۴۹)

"نظیر شناسی" جیسی کتاب مرتب کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے انفرادی تحقیق کے علاوہ اجتماعی تحقیق میں بھی کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔ مرزا علی لطف کے بعد نظیر پر تحقیقی کام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو قدیم دور کے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کی بازیافت میں دل چسپی ہے اور اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے محقق کی طرح پختہ ارادوں کے مالک ہیں۔ قدیم دور کے ادب سے میں تحقیق کے دوران جا بجا رکاوٹیں آتی رہتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو پار کرنے کے لیے حوصلہ اور اولوالعزمی کی ضرورت پیش آتی ہے اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ پختہ ارادوں اور بلند حوصلوں کے مالک ہیں۔

"نظیر شناسی" کے ساتھ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیق و تدوین و ترتیب کے کام کا سفر رک نہیں گیا بلکہ وہ آج بھی تحقیق میں انہماک سے لگے ہوئے ہیں اور بڑھتی ہوئی عمر اور مصروفیات کو پس و پیش رکھ کر ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں وہ تذکرہ گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف کی ترتیب میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ "مکاتیب عزیز" کے عنوان سے عزیز مرزا کے خطوط کو مرتب کر کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تدوین و ترتیب کے کاموں کا عمومی جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ مرزا علی لطف کے دیوان کی تدوین کا کام ان کا شاہکار ہے۔ دیوانِ لطف کے قدیم کرم خوردہ اور آب زدہ نسخوں کے مطالعہ سے جس طرح انھوں نے لطف کا دیوان ترتیب دیا ہے اور اس کی تفہیم کے لیے فرہنگ بھی تیار کی ہے اس طرح ان کا یہ کام کسی کارنامے سے کم نہیں۔ دیوانِ لطف کے علاوہ دیوانِ حفیظ، ید بیضا اور نظیر شناسی کی تدوین و ترتیب بھی اپنی جگہ اہم ہے اور ان کتابوں سے اردو ادب کے ذخیرہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ تدوین و ترتیب میں شاعری کی

تینوں کتابوں کے مقدمے لکھ کر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جہاں لطف، حفیظ اور برق موسوی کے حالات کو محفوظ کر دیا ہے وہیں ان کے کلام پر عالمانہ تبصرہ کرتے ہوئے ایک اچھے نقاد اور تبصرہ نگار ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے مقدمے تاثراتی تنقید کی اچھی مثال کہے جاسکتے ہیں۔

○●○

حوالے :

۱ پروفیسر گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ ص: ۴۳۱ پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰، مقام اشاعت لکھنو

۲ ڈاکٹر غلام عمر خاں۔ دیوانِ لطف۔ از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۱۹۸۳، حیدرآباد، ص: ۷

۳ پروفیسر گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ ص: ۵۰۷

۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۴۳

۵ پروفیسر گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ ص: ۴۴۷

۶ حوالہ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۴۴ تا ۴۶

۷ حوالہ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۴۷

۸ پروفیسر گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ ص: ۴۷۰

۹ رشید حسن خاں۔ تدوین متن کے مسائل۔ مشمولہ دلی تحقیق مسائل اور تجزیہ۔ علی گڑھ ۱۹۷۸، ص: ۳۵

۱۰ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۴۹

۱۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۵۰

۱۲ پروفیسر گیان چند جین۔ تحقیق کا فن۔ ص: ۴۸۳

۱۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۵۷

۱۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۱۰۶

۱۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ دیوانِ لطف۔ ص: ۱۳۷

۱۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "دیوانِ لطف " ص: ۴،

۱۷ پروفیسر گیان چند جین " تحقیق کا فن " ص: ۴۹۹

۱۸ بہ حوالہ "دیوانِ لطف " ص: ۱۴۴ تا ۱۴۶

۱۹ ڈاکٹر غلام عمر خاں " بہ حوالہ "دیوانِ لطف " ص: ۹،۸، ۱۰

۲۱ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " مرتبہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ص ۴۰۔ کتب خانہ ،ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی، آندھرا پردیش ۱۹۹۴۔

۲۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "دیوانِ حفیظ " ص: ۱۵

۲۳ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸

۲۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ،مشمولہ پروفیسر ثمینہ شوکت بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۱۹۔ ۲۰

۲۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "دیوانِ لطف " ص: ۲۰، ۲۱

۲۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "دیوانِ حفیظ " ص: ۲۹

۲۷ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۳۰

۲۸ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۳۱

۲۹ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۳۳

۳۰ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۳۴

۳۱ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۳۵

۳۲ بہ حوالہ "دیوانِ حفیظ " ص: ۳۷

۳۳ کلامِ حفیظ "دیوانِ حفیظ " ص: ۱۳

۳۴ پروفیسر غلام عمر خاں مشمولہ " یدِ بیضا " مرتبہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، حیدر آباد ۱۹۹۵، ص: ۱۵

۳۵ بہ حوالہ ید بیضا ص: ۱۹۔ ۲۰

۳۶ پروفیسر مغنی تبسم بہ حوالہ "یدِ بیضا" ص:۲۰

۳۷ قمر ساحری بہ حوالہ "ید بیضا" ص:۲۵

۳۸ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "یدِ بیضا" ص:۵۷-۵۸

۳۹ برق موسوی بہ حوالہ "یدِ بیضا" ص:۶۱

۴۰ برق موسوی "یدِ بیضا" ص:۹۳

۴۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "یدِ بیضا" ص:۹۷-۹۸

۴۲ برق موسوی بہ حوالہ "یدِ بیضا" ص:۹۸

۴۳ برق موسوی بہ حوالہ "یدِ بیضا" ص:۲۰۸

۴۴ پروفیسر مغنی تبسم "نظیر شناسی" ڈسٹ کور، اول ۱۹۸۸ء، حیدر آباد

۴۵ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "نظیر شناسی" ص:۷

۴۶ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "نظیر شناسی" ص:۸-۹

۴۷ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید "نظیر شناسی" ص:۱۱

۴۸ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "نظیر شناسی" ص:۱۵

۴۹ راحت سلطانہ بہ حوالہ "نظیر شناسی" ص:۹۶-۹۸

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
بہ حیثیت خاکہ نگار

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مشہور محقق، نقاد، ادیب کے علاوہ ایک اچھے خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ " خوش نفساں " زیور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ " نفوس گرامی " زیرِ طبع ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل خاکہ نگاری کی تعریف، مضمون انشائیہ اور خاکہ میں پائے جانے والے فرق اور خاکہ نگاری کی جزئیات کا جائزہ ضروری ہو جاتا ہے۔

اردو کی نثری اصناف میں ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ کی طرح خاکہ بھی ادب کی ایک جداگانہ اور منفرد صنف ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری و مضمون نگاری کے ابتدائی نقوش داستانوں، تذکروں اور دیگر تصانیف میں مل جاتے ہیں۔ لیکن خاکہ نگاری مستقل صنف ادب کی حیثیت سے اردو میں انگریزی ادب کے اثر سے رائج ہوئی۔ خاکہ کے لیے انگریزی اصطلاح (Sketch) رائج ہے۔ یہ اصطلاح فن مصوری میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ اگر ایک مصور کسی شخص کی ہو بہو مکمل تصویر بنا دے تو اسے Portrait کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے کسی شخصیت کے خط و خال کی جھلک دکھانے کی کوشش کرے تو اسے اسکیچ کہتے ہیں۔ مصور کے بنائے ہوئے اسکیچ میں کسی شخصیت کے ظاہری خط و خال جھلکتے ہیں۔ لیکن ایک خاکہ نگار جب لفظوں کے ذریعہ کسی شخصیت کی صورت گری کرتا ہے تب اس خاکہ کے ذریعے شخصیت کی ظاہری و باطنی

تصویر قاری کے ذہن میں اجاگر ہو جاتی ہے اس طرح کسی مصور کے بنائے اسکیچ کے مقابلے میں ایک خاکہ نگار کے پیش کردہ اسکیچ یا خاکہ کی تصویر زیادہ واضح ہوتی ہے۔

صابرہ سعید نے اپنی کتاب "اردو ادب میں خاکہ نگاری" میں خاکہ نگاری کی تعریف کے سلسلے میں مختلف نقادوں اور ماہرین ادب کی آراء پیش کی ہے۔

> نثار احمد فاروقی کے بہ موجب "خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے"۔ آمنہ صدیقی لکھتی ہیں کہ "سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں، ان ہی میں سے ایک شخصی خاکہ ہے"۔ یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے۔ جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے"۔ محمد حسین لکھتے ہیں کہ "نوکِ قلم کی تصویر کشی خاکہ نگاری ہے"۔ شمیم احمد کرہانی لکھتے ہیں کہ "خاکہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے جس میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح بہ راہِ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نے نہ صرف قلمی چہرہ دیکھا ہے بلکہ خود شخصیت کو دیکھا بھالا سمجھا بوجھا ہو۔" (۱)

مختلف نقادوں اور ماہرین ادب کی آراء کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خاکہ نگاری کی یہ عمومی تعریف کی جا سکتی ہے کہ "خاکہ نگاری لفظوں کے ذریعہ کسی شخصیت کی ایسی تصویر کشی ہے جس سے اس کا ظاہر اور باطن قاری کے سامنے پیش ہو جائے اور مذکورہ شخصیت کا خاطر خواہ تعارف ہو جائے۔ خاکہ نگاری سے ملتی جلتی اصناف سوانح عمری، انشائیہ اور مضمون نگاری وغیرہ ہیں۔ سوانح عمری میں کسی شخصیت کے حالاتِ زندگی جزئیات کے ساتھ پیش ہوتے ہیں۔ جب کہ خاکہ نگاری کسی فرد کی زندگی اور کردار کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ سوانح عمری یا سوانح نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں افراد کی زندگی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ اس میں شخصیت اور اس کے کارناموں کو واضح طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اردو میں حالی نے پہلی مرتبہ اپنی سوانحی تخلیقات حیات سعدی (۱۸۸۲ء)، یادگارِ غالب (۱۸۹۷ء) اور حیاتِ جاوید (۱۹۰۱ء) کے ذریعہ سوانح نگاری کی

جامع اور مکمل تصویریں پیش کی ہیں۔ ان سوانح عمریوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی سوانح میں ہونی چاہئیں۔ اس لیے حالی کی تحریر کردہ ان سوانح عمریوں کو اردو ادب کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ حالی کے بعد اردو نثر میں سوانح نگاروں کا ایک کارواں دکھائی دیتا ہے۔ شبلی نے تاریخی اور ادبی پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر سوانح نگاری کی۔ بعد میں نسبتاً مختصر سوانح عمریاں لکھی جانے لگیں۔ جو سوانح خاکے کہلائیں۔ فرحت اللہ بیگ نے "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی"، قاضی عبدالغفار نے "حکیم اجمل خاں"، رشید احمد صدیقی نے "ڈاکٹر انصاری"، عابد حسین نے "راس مسعود"، شیخ محمد اکرام نے "غالب" اور عبدالرزاق کانپوری نے "یادِ ایام" کے نام سے سوانحی خاکے مختلف لوگوں کے پیش کیے۔

خاکہ نگاری کا فن بھی سوانح نگاری سے ملتا جلتا ہے، سوانح نگاری میں شخصیت کے حالاتِ زندگی کے بیان پر زور دیا جاتا ہے اور اس بیان میں سوانح نگار کے اپنے جذبات اور احساسات کم ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف خاکہ نگاری میں مضمون نگار اپنی منتخب شخصیت کے حالات بیان کرنے میں اپنے جذبات و احساسات کو استعمال کرتے ہوئے مذکورہ شخصیت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خاکہ نگاری میں سوانح نگاری کے برخلاف ادبیت جھلکتی ہے۔ سوانح نگاری میں تحقیقی نقطہ نظر پایا جاتا ہے اور اس میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جب کہ خاکہ نگاری میں زیرِ بحث شخصیت خاکہ نگار کی مرہونِ منت ہوتی ہے خاکہ نگار اگر چاہے تو اس کے کردار کے مثبت پہلو تلاش کر کے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے یا اس کے کردار کے منفی پہلوؤں کو بے نقاب کر کے اس کے نام کو داغ دار کر دے۔ لیکن اردو ادب کی تاریخ میں خاکہ نگاروں کی اکثریت نے اپنے خاکوں کے ذریعہ پیش کی جانے والی شخصیتوں کا تعارف اس انداز میں کرایا کہ بیش تر شخصیتیں خاکوں کے بدولت ہی دوامی شہرت اختیار کر لیں۔

سوانح نگاری اور خاکہ نگاری سے ملی جلی ایک صنف انشائیہ نگاری بھی ہے۔ جس کے لیے اردو میں انشا، اور مضمون کی اور انگریزی میں (Essay) کی اصطلاحیں رائج ہیں۔ خاکہ میں صرف شخصیت موضوع بحث ہوتی ہے جب کہ انشائیہ میں کائنات کی ہر چیز موضوع بحث ہو سکتی ہے۔ اس میں موضوع کے بیان کے ساتھ

جذبات نگاری کو بھی خاص دخل ہوتا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر انشائیہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

"انشائیہ ایک ہلکا پھلکا پُرلطف اور شگفتہ مضمون ہوتا ہے۔ جس میں انشائیہ نگار کی شخصیت اپنا جلوہ دکھائی دیتی ہے۔۔۔ انشائیہ ایک طرح سے ادب لطیف اور رومانی طرزِ نگارش کا پروردہ ہوتا ہے۔ (۲)

انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر صابرہ سعید یوں رقم طراز ہیں:

"انشائیہ ایک مختصر صنف ادب ہے۔ اس کی ضخامت کا تعین تو نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اسے اتنا طویل نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی کتاب یا کتابچہ بن جائے اور اس کے مطالعے کے لیے کافی وقت درکار ہو۔ علمی اور سائنسی مقالوں کی طرح اس میں خیالات کو میکانیکی انداز میں ترتیب نہ دیا جائے اور نہ انھیں منطقی طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے برخلاف اس کا انداز بیان شگفتہ بے تکلف اور غیر رسمی ہونا چاہیے"۔ (۳)

انشائیہ کی مختلف تعریفوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ ایک ہلکی پھلکی تحریر ہوتی ہے جس میں معلومات جذبات واحساسات کے ساتھ دل چسپ اسلوب بیان کے ذریعہ اس انداز میں پیش کی جاتی ہیں کہ قاری موضوع کی عمومیت کے باوجود انشائیہ نگار کے اندازِ بیان کی ندرت کے سبب تحریر کو پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس طرح سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری اپنی ہیئت میں یکساں ہوتے ہوئے بھی اپنے لوازمات کے سبب جداگانہ خصوصیات رکھتے ہیں۔

خاکے عموماً شخصیتوں کے بارے میں لکھے جاتے ہیں لیکن ان میں بھی طرح طرح کی اقسام پائی جاتی ہیں۔ خاکوں کی اقسام کے بارے میں صابرہ سعید لکھتی ہیں:

"خاکہ نگاری کے محرکات، مقاصد، ہیئت، مواد، پیرایہ بیان اور ادبی تکمیل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شخصی خاکوں کو درج ذیل اقسام کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔ تعارفی، سرسری،

تاثراتی، مدحیہ اور توصیفی بیانیہ اور سنجیدہ، کرداری، سوانحی معلوماتی، اجتماعی ذاتی یا خود نوشت اور انٹرویو۔" (۴)

خاکہ نگاری کی ان قسموں سے قطع نظر یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ خاکہ نگاری کا فن کن بنیادی اصولوں کا متقاضی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خاکہ کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے، اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح خاکہ میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔" (۵)

خلیق انجم کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کامیاب خاکہ نگار کو اپنے فن کا ماہر ہونا چاہیے۔ خاکہ نگار کے سامنے ایک شخصیت ہوتی ہے اور وہ لفظی بازیگری سے ایک شخصیت کو حیات نو بخشتا ہے۔ خاکہ نگار کو حقیقت بیانی کے ساتھ شخصیت کا اصلی رنگ و روپ اور ماحول پیش کرنا پڑتا ہے۔ خاکہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جذبات اور جوش کو اعتدال میں رکھے اور غیر جانب داری کے ساتھ شخصیت سے متعلق تمام مواد کو اس طرح ترتیب دے کہ شخصیت کی حقیقی تصویر سامنے آئے۔ واقعات کو صحت کے ساتھ اس طرح ترتیب دے کہ ماضی حال ہو جائے۔ اس کے لیے خاکہ نگار میں جدت اور مشاہدے کی قوت ہونی چاہیے، ایک اچھے خاکے کے لیے درکار ضروری باتوں کے بارے میں صابرہ سعید لکھتی ہیں:

"خاکے میں اختصار و تنظیم کے ساتھ ایک طرح کی سرعت اور تیز رفتاری بھی ضروری ہوتی ہے۔ ہم یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ خاکہ ان فنی لوازم کا متقاضی ہے۔ سچائی، صحیح مرقع کشی، عمدہ تربیت، دیانت داری، اظہار کی جراءت شعوری فراست تچے تلے الفاظ میں شخصیت کے ظاہری اور اندرونی حدود اربعہ کا بیان، وحدت تاثر، معروضی انداز، شخصیت کی باز تخلیق وغیرہ، چوں کہ خاکہ تخلیقی انداز کی شعوری کوشش ہے۔ اس لیے کوشش یہ کی جائے کہ انتخاب، ترتیب اور شعوری کوشش سے تشکیل پانے والا مرقع بے جان واقعات اور

تفصیلات کا مجموعہ نہ بننے پائے بلکہ ایک ایسی زندہ اور متحرک تصویر کا ادب میں اضافہ کرے جو حقیقت کو بھی شرما دے۔" (۹)

خاکہ نگاری کے فن پر اس مختصر جائزے کے بعد اب یہ دیکھا جائے گا کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی خاکہ نگاری میں کون کونسے فنی لوازم برتے ہیں۔

اردو میں مضمون نگاری کے ارتقاء کے ساتھ جنوبی ہند میں بھی نثر نگار شہرت پانے لگے تھے۔ دکن کے علاقے میں بیسویں صدی میں جن نثر نگاروں نے اپنی تحریروں سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی ان میں ایک نام جامعہ عثمانیہ کے استاد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا بھی ہے۔ دراصل دکن کا علاقہ صدیوں سے زندہ تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ آج سے چھ سات صدی قبل صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ نے مذہبِ اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے اس علاقے کو اپنا جائے قیام بنایا۔ صوفیائے کرام بڑے نباض تھے۔ انھوں نے لوگوں کے دل جیتنے کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے ہم دردانہ برتاؤ سے لوگوں میں مل جل کر رہنے کا ایسا سبق پڑھایا کہ وقت گزرنے کے ساتھ دکن کا علاقہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا علم بردار بن گیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد فرخندہ بنیاد شہر کی بنیاد ڈالی اور خدا کے حضور اپنی مناجات میں یہ دعا کی کہ:

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

شاید وہ گھڑی قبولیت دعا کی ہوئی کہ خدا نے محمد قلی قطب شاہ کے بسائے شہر کو ایسا آباد کیا کہ اس شہر کی شہرت سارے عالم میں پھیل گئی اور آصف جاہی دور کے آتے آتے اس شہر سے وابستہ کئی ہستیوں نے نہ صرف اس شہر میں بلکہ اپنی گوناگوں صفات سے ساری دنیا میں نام کمایا۔ حیدرآبادی تہذیب و تمدن نے ایسی کئی ہونہار اور نابغہ روزگار شخصیات کو جنم دیا جنھوں نے اپنی شخصیت اور کارناموں سے نہ صرف اپنے عہد اور ماحول کو متاثر بلکہ ان کے کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسی گراں قدر شخصیات کے احوال اور کارنامے لوگوں کے سامنے لائے جائیں تاکہ لوگ ان کے حالات کی

روشنی میں اپنی زندگی کی منزلیں آسانی سے طے کر سکیں۔ چناں چہ حیدر آباد ہی کے ایک مایہ ناز سپوت جناب عابد علی خاں (مرحوم) ایڈیٹر سیاست نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے خواہش کی کہ وہ مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی حیدر آبادی شخصیات کے بارے میں تعارفی مضامین لکھیں۔ چناں چہ اپنے بزرگ کی خواہش پر پروفیسر اکبر علی بیگ نے حیدر آباد کی منتخبہ نامور شخصیات پر سوانحی خاکے لکھنے شروع کیے۔ ان کے یہ خاکے ابتدا میں روزنامہ " سیاست " کی زینت بنتے رہے اور بعد میں " خوش نفساں " (حیدر آباد کی چند ادبی اور سماجی شخصیتوں کا تعارف) کے عنوان سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہوئے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ " خوش نفساں " پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کو " ادارہ شعر و حکمت " ریڈ ہلز حیدر آباد نے دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار حیدر آباد سے شائع کروایا اور کتاب کی قیمت ۱۵ (پندرہ) روپے رکھی گئی۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی کتاب " خوش نفساں " کو اپنی ماں اصغری بیگم صاحبہ کے نام معنون کیا اور اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ماں کی دعاؤں اور ان کی شفقت کے سائے میں پل بڑھ کر ہی انھوں نے اپنی زندگی کی منزلیں کامیابی سے طے کی ہوں۔ " خوش نفساں " خاکوں کے مجموعے میں صفحات کی کل تعداد (۱۲۸) ہے۔ جس میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی حیدر آباد کی کل بارہ شخصیات پر خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ ان شخصیتوں کے نام سید ہاشم علی اختر صاحب، سید علی اکبر صاحب، محمد عزیز مرزا مرحوم، نواب سعید جنگ بہادر، ڈاکٹر موہن لال نگم صاحب، حضرت باقر امانت خانی صاحب، حضرت سعید شہیدی صاحب، محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، ڈاکٹر سید مہدی علی صاحب مرحوم، میر جعفر علی صاحب مرحوم، حضرت برق موسوی صاحب مرحوم اور ڈاکٹر نور احمد شیخ صاحب شامل ہیں۔ ان بارہ شخصیات میں صرف ایک خاتون محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے بارے میں ہی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ حیدر آباد کی علمی ادبی و تہذیبی زندگی میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں نسبتاً کم آگے تھیں۔ کتاب " خوش نفساں " کے آغاز ہی میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خاکوں میں پیش کردہ شخصیات کی سیاہ و سفید تصاویر بھی

جمع کر دی ہیں تاکہ قاری تصویر اور ان کے بارے میں پڑھے گئے خیالات میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے اس شخصیت کی دیرپا یادیں اپنی ذہنوں میں محفوظ رکھ سکیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی کاوش "خوش نفساں" کا آغاز "حرفِ آغاز" سے ہوتا ہے۔ جسے پدم شری جناب عابد علی خاں (مرحوم) سابق مدیر روزنامہ سیاست نے تحریر کیا۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو لکھی گئی اپنی اس تحریر میں انھوں نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی کتاب "خوش نفساں" کی وجہ تصنیف اپنی اس خواہش کو بتایا کہ حیدرآباد کی علمی ادبی اور سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کے بارے میں تعارفی سوانحی مضامین لکھے جائیں۔ انھوں نے یہ مضامین روزنامہ سیاست میں شائع کروائے اور بعد میں اخبار میں شائع شدہ اس قیمتی مواد کو کتابی شکل دینے پر زور دیا۔ یہ بات مشہور ہے کہ اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے اور گزرے ہوئے کل کے اخبار کو کوئی پوچھ کر بھی نہیں دیکھتا لیکن اخبارات میں شائع شدہ قیمتی مواد آنے والی نسلوں تک بہ طورِ امانت پہنچانے کے لیے اسے کتابی شکل میں محفوظ کرانا ضروری ہوتا ہے، چناں چہ اسی بات کو اہمیت دیتے ہوئے جناب عابد علی خاں لکھتے ہیں:

> "اردو اکیڈیمیوں کے قیام کی تجویز سے میرا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ گجرال کمیٹی نے ایسی اکیڈیمیوں کے قیام کا مشورہ دیا تھا کہ ہر ریاست میں نادر مطبوعات و مخطوطات کو شائع کیا جائے، ادب و تاریخ کا تحفظ کیا جائے، اکیڈیمی کا ایک کام اکبر علی بیگ صاحب نے انجام دیا ہے۔ جس کے لیے وہ مستحق مبارک باد ہیں۔" (۷)

اہم شخصیات کے حالاتِ زندگی پر مبنی مضامین کی اخبارات میں اشاعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اخبارات کی اہمیت دوگنی ہو جاتی ہے۔ عموماً اخبارات خبروں کی ترسیل کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ لیکن اخبارات نے جب سے موضوعاتی ایڈیشن نکالنے شروع کیے اور ان میں کارآمد اور مفید معلوماتی مضامین کی اشاعت عمل میں آنے لگی اس وقت سے اخبارات کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اب تو عالم یہ ہے کہ لوگ روزآنہ یکساں قسم کی خبریں پڑھتے پڑھتے اکتاہٹ محسوس کرنے لگے ہیں اور صرف اپنے پسندیدہ ایڈیشن کے لیے اخبار کا انتظار کرتے دیکھے جا رہے ہیں۔ چناں چہ ان ایڈیشنوں میں شائع ہونے والے مضامین دستاویز کی حیثیت اختیار کر

گئے ہیں اور باذوق لوگ ان ایڈیشنوں کی فائل بنا کر رکھنے لگے ہیں تاکہ وقت ضرورت ان مضامین سے استفادہ حاصل کیا جاسکے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے شائع شدہ خاکے بھی اس بناء پر اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے ذریعہ حیدرآباد کی اہم شخصیتوں کی تاریخ اور حیدرآبادی تہذیب ان مضامین میں سمو دی گئی ہے۔ اپنے اخبار میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مضامین کی اشاعت کے بعد اخبار کی بڑھنے والی اہمیت کی جانب توجہ دلاتے ہوئے جناب عابد علی خاں لکھتے ہیں:

"سیاست میں مطبوعہ یہ مضامین حیدرآباد کی تاریخ ہیں اور اس نظریہ کی نفی ہیں کہ اخبارات کی زندگی ایک روزہ ہوتی ہے۔" (۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی خاکہ نگاری کے ذریعہ "خوش نفساں" میں حیدرآباد کے کئی انمول رتنوں کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے اور کتاب میں پیش کردہ شخصیتوں کے کارنامے یقیناً آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ اسلاف کے کارناموں سے نئی نسل کو آگاہ کرنا اور پرانی قدروں کی باگ ڈور نئی پیڑھی کے ہاتھ میں دینا ایک اہم اور ضروری کام ہے اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نئی نسل کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے نہ صرف واقف کرادیا بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں کی مثالی شخصیتوں کے حالات پیش کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ان میں اپنی پسندیدہ اور آئیڈیل شخصیت کو ڈھونڈنے کی سہولت فراہم کی ہے۔ چناں چہ اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے جناب عابد علی خاں لکھتے ہیں کہ:

"میں ایسی تصانیف کو نئی اور پرانی نسل کے مابین ایک اتصالی کڑی بھی قرار دیتا ہوں اور اس کام کے لیے بیگ صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔" (۹)

"حرفِ آغاز" کے عنوان سے جناب عابد علی خاں کے خیالات کے بعد کتاب "خوش نفساں" میں تعارف کے عنوان سے ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب سابق پروفیسر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جامعہ عثمانیہ ہی کے اپنے کم عمر رفیق اور استاد اردو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تخلیقی صلاحیتوں کی ستائش کی ہے اور کہا کہ

"اردو کے اہلِ قلم بالعموم ایسی شخصیتوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو راست طور پر اردو زبان و ادب سے وابستہ رہی ہوں ۔ ہمارے معاشرہ میں ایسے افراد کی کبھی کمی نہیں رہی جو ہماری سماجی اور علمی زندگی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر یا قابلِ ذکر خدمات انجام دیتے ہیں ۔ ایسے افراد کے بارے میں بعض اوقات ابتدائی معلومات بھی کسی تحریر میں نہیں ملتیں ۔ در آں کہ ان میں بعض بزرگوں کے کارنامے مستقل تصنیف کا موضوع بھی بن سکتے ہیں ڈاکٹر اکبر علی بیگ نے اپنے انتخاب میں ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کیا ہے ان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے ۔ وہ اس میدان میں اور آگے بڑھیں تو ایسی متعدد ہستیاں ماضی اور حال میں مل جائیں گی ۔ جن کی خدمات کا اعتراف سماج کی خدمت بھی ہوگی اور اردو زبان کی بھی ۔" (۱۰)

ادیبوں کے علاوہ دوسرے شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر قلم اٹھانے کی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس کوشش کو جس انداز سے ڈاکٹر غلام عمر خاں نے سراہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ پیشہ تدریس سے وابستہ ہونے کے باوجود تخلیقی میدان میں انھوں نے تنوع دکھاتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ اردو ادب کے علاوہ وہ دیگر سماجی موضوعات پر بھی اچھی خاصی دست رس رکھتے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ شخصیات پر خاکے لکھ کر انھوں نے اپنے مزاج کی ہمہ رنگی ظاہر کی ہے ۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے مجموعہ " خوش نفساں " پر مبسوط تنقیدی جائزہ اور کتاب کا تعارف اس کا پیش لفظ ہے ۔ جسے اردو کے نامور محقق ، نقاد ، شاعر و ادیب پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے تحریر کیا ہے اور کتاب پر جامع تنقیدی نظر ڈالی ہے اور جانب داری برتے بغیر سلجھے ہوئے انداز میں کتاب پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے واضح انداز میں کتاب کی اہمیت بیان کی ہے ۔ پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں :

" زیرِ نظر کتاب ان سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں بعض ادبی رسائل اور زیادہ تر روزنامہ " سیاست " میں شائع ہوتے رہے ۔ یہ اصل میں صحافتی انداز کی تحریریں ہیں ۔ جن کا مقصد حیدرآباد کی سماجی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم

شخصیتوں کی حیات اور کارناموں سے قارئین کو متعارف کروانا ہے۔ اسی لیے ان میں ادبی خاکوں اور مرقعوں کے برخلاف سوانحی مواد کی پیش کش پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اخلاقی یا نفسیاتی نقطہ نظر سے شخصیت کا تجزیہ کرنا اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو منظر عام پر لانا ان مضامین کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔۔۔ اسی نقطہ نظر سے روزنامہ "سیاست" نے حیدرآباد کے مشاہیر پر تعارفی مضامین لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کے بیش تر مضامین "سیاست" میں اشاعت کے لیے لکھے گئے۔ ان کے اختصار کا سبب اخبار کی تنگ دامانی ہے۔ دو ایک مضامین جو ماہ نامہ "سب رس" میں شائع ہوئے نسبتاً طویل اور بھرپور ہیں۔" (۱۱)

پروفیسر مغنی تبسم نے اس خیال کی جانب توجہ دلائی کہ لوگ عموماً کسی مشہور شخص کے اس دنیا سے گزر جانے کے بعد اس کے احوال لکھتے ہیں جب کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نہ صرف ان شخصیات کے احوال لکھے جو بہ قید حیات ہیں بلکہ ان لوگوں کے بارے میں لکھا جن سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ملنا جلنا بھی رہا ہے۔ چناں چہ ان کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم ان کے کام کے طریقہ کار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے جن مشاہیر کے تعارف نامے لکھے ہیں ان کا ریاست کی تہذیبی زندگی پر گہرا اثر رہا ہے۔ ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ تحقیق و تفتیش، شخصی ملاقاتوں اور انٹرویو کے ذریعہ مصدقہ سوانحی معلومات یک جا کر دی گئی ہیں۔ اس طرح یہ مضامین آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مستند ماخذ بن جائیں گے۔" (۱۲)

پروفیسر مغنی تبسم نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحریر کردہ ان مضامین کی اخلاقی اور سماجی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور کہا کہ:

"ان مضامین کی ایک اخلاقی افادیت بھی ہے۔ بیش تر سوانحی خاکے ایسی شخصیتوں کے ہیں جنھوں نے نامساعد حالات کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن کسی دنیوی مفاد کی خاطر

اپنے اصولوں کو قربان نہیں کیا اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے۔ ان کی زندگی نئی نسل کے لیے قابلِ تقلید مثال بن سکتی ہے۔" (۱۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے مجموعے "خوش نفساں" کے بارے میں جناب عابد علی خاں صاحب، ڈاکٹر غلام عمر خاں اور پروفیسر مغنی تبسم کی گراں قدر آرا، کے بعد اب پروفیسر اکبر علی بیگ کے خاکوں کا تفصیلی جائزہ پیش ہے۔

○

- **پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا جائزہ :**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی کتاب کا پہلا سوانحی خاکہ "سید ہاشم علی اختر صاحب ٹیچر سے وائس چانسلر" تک ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب جامعہ عثمانیہ سے فارغ دہ نابغہ روزگار شخصیت ہیں جن پر حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کو ناز ہے۔ انھوں نے نہ صرف ٹیچر کے عہدے سے آئی اے ایس کے جلیل القدر عہدے تک ترقی پائی بلکہ اپنی بےپناہ سرکاری مصروفیات کے باوجود انھوں نے حیدرآباد کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لیے اپنا وقت دیا اور فروغ اردو میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ نئی نسل کے لیے ان کے کارنامے ضرور مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔ میر تقی میر نے ایسی ہی شخصیات کے بارے میں کہا تھا :

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ہاشم علی اختر کے سوانحی خاکے میں ان کے آباد و اجداد، ان کی پیدائش، بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت، ملازمت آئی اے ایس کی سرگرمیاں، مختلف محکموں میں ان کی خدمات، ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے ان کی خدمات اور ان کے گھریلو احوال کے بارے میں مبسوط انداز میں معلومات بہم پہنچائی ہیں، اس کے علاوہ خاکے میں جامعہ عثمانیہ کی دل چسپ یادیں، ہاشم علی اختر کے دوست احباب کے واقعات اور دیگر دل چسپ باتیں بھی قاری کو اس خاکے میں ملتی ہیں۔

خاکے کے آغاز میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہاشم علی اختر کی بے پناہ قابلیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہاشم علی اختر صاحب غیر معمولی ذہانت رکھنے والی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے، جس پر بجا طور پر نابغہ اور جینئس (GENIUS) کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔" (۱۴)

کسی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے اس کے عہد اور اس کی پیدائش سے متعلق معلومات کا ہونا ضروری ہوتا ہے چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ہاشم علی اختر کی پیدائش اور بچپن کے واقعات بڑی تحقیق کے بعد لکھے ہیں اور بتایا کہ ہاشم علی اختر ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد کے محلہ قطبی گوڑہ میں ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام جناب سید حنیف صاحب تھا جو اردو فارسی کے استاد رہنے کے بعد ناظر تعلیمات کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے تھے، ہاشم علی اختر صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی اور نو سال کی عمر میں مدور مڈل اسکول ضلع نلگنڈہ میں چھٹے درجے میں داخلہ لیا تھا اور یہیں سے ہاشم علی اختر کی ذہانت و فطانت کے جوہر کھلنے لگے تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے شاید ہاشم علی اختر سے شخصی ملاقات کے دوران ان کے بچپن کے حالات قلم بند کیے ہوں گے۔ چناں چہ زمانۂ طالبِ علمی میں ہاشم علی اختر کی ذہانت سے متعلق دو ایک واقعات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"ان کے انگریزی کے استاد راما راؤ صاحب تھے انھوں نے طلباء کو پابند کیا تھا کہ وہ ہر روز انگریزی کی کتاب سے ایک صفحہ خوش خط لکھ کر لائیں۔ ہاشم علی صاحب نے ایک صفحہ لکھ کر پیش کیا تو ان کا خط دیکھ کر راما راؤ صاحب نے انھیں ہوم ورک سے مستثنیٰ کر دیا اور کہا کہ اب وہ خوش نویسی میں اپنا وقت ضائع نہ کریں اور یہی وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کریں اس تحریک سے ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا ... جناب فیض محمد صاحب صدر مہتم تعلیمات نے "انسپکشن نوٹ" میں لکھا کہ اس اسکول میں ایک طالبِ علم سید ہاشم علی اختر کے علاوہ کوئی اور کتابیں نہیں پڑھتا۔" (۱۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہاشم علی اختر کے آگے کے تعلیمی سفر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ والد صاحب کا تبادلہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے نظام آباد میں ساتویں تا نویں جماعت اور محبوب نگر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں جامعہ ، عثمانیہ سے سائنس سے انٹر کیا ۱۹۴۲ء میں بی ایس سی اور ۱۹۴۴ء میں حیوانیات سے ایم ایس سی کیا۔ زمانہ ، طالبِ علمی میں ہاشم علی اختر جامعہ ، عثمانیہ کے سی ہاسٹل میں رہتے تھے۔ کیمپس میں قیام کے دوران پیش آنے والے دل چسپ حالات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"ہاسٹل کا خرچ صرف ۱۷روپیہ ماہانہ تھا۔ جس میں سے ۱۵روپے کھانے کے لیے اور بقیہ دو روپیہ میں کمرہ کا کرایہ۔ بجلی کا بل ، دھوبی اور حجام کی خدمات شامل تھیں اور گرم پانی ملا کرتا تھا۔ اقامت خانے (ہاسٹل) کا فرنیچر اور انتظامات بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ ہاسٹل کے مودب (وارڈن) جناب شیو موہن لال صاحب پروفیسر ہندو فلسفہ جامعہ ، عثمانیہ تھے۔ اس زمانے میں لڑکے شرارتیں بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن غنڈہ گردی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی ایک آدھ بے تکا سا لڑکا آ بھی جاتا تھا تو سینیئر لڑکے اس کو درست کر دیتے تھے۔ ڈائننگ ہال اتنا صاف ستھرا اور باسلیقہ تھا کہ اس پر کسی اعلیٰ درجہ کی رسٹورنٹ کا شبہ ہوسکتا تھا۔" (۱۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحریر کردہ اس خاکہ سے آج سے پچاس سال قبل جامعہ ، عثمانیہ کے کیمپس کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کیمپس کے موجودہ حالات سے تقابل کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کیمپسوں کی کیا حالت رہ گئی ہے۔ ہاشم علی اختر کے زمانہ ، طالبِ علمی کے ساتھیوں میں اشفاق حسین صاحب، ڈاکٹر حفیظ قتیل، میر عابد علی خاں صاحب، جناب محبوب حسن جگر جوائنٹ ایڈیٹر روز نامہ سیاست (سابقہ)، منظور مصطفیٰ صاحب، سردار الہام صاحب اور رکن الدین صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ ہاشم علی اختر کو زمانہ طالبِ علمی میں جامعہ ، عثمانیہ میں ڈاکٹر بی۔ کے۔ داس، صدر شعبہ ، حیوانات، ڈاکٹر ستیہ نارائن سنگھ، ڈاکٹر مہدی علی لکچرر زوالوجی، نباتیات اور صدر شعبہ ، پروفیسر سعید الدین، نباتیات کے ریڈر عبدالباری صاحب، ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر منوہر راج سکسینہ، طبعیات کے پروفیسر وحید الرحمن صاحب، ڈاکٹر این رام لال،

سید احمد قادری صاحب شعبہ ۔ کیمیا کے اساتذہ میں ڈاکٹر مظفر الدین صدر شعبہ کے علاوہ محمود احمد خاں صاحب ، شاہ محمد اور خلیل الرحمٰن صاحب سے علمی اکتساب کا موقع ملا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ہاشم علی اختر کے اساتذہ کے نام پیش کر کے ۱۹۴۰ کی دہائی میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ برادری کی یاد اپنے خاکہ میں محفوظ کر دی ۔اس طرح ان کا یہ خاکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہاشم علی اختر کے احوال بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ ایم۔ ایس۔ سی کامیاب کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد میں زوالوجی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ڈھائی سال تک وہ اس خدمت پر فائز رہے ۱۹۴۶ میں حیدر آباد سیول سروسیز کے مسابقتی امتحان میں شرکت کی اور بہ درجہ امتیاز کامیابی حاصل کی۔ جس کی بنا انھیں " سر اکبر حیدری گولڈ میڈل " دیا گیا بعد ازاں انھیں ۱۹۵۴ میں آئی۔ اے۔ ایس کے زمرے میں شامل کر لیا تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے آئی۔ اے۔ ایس کے لیے کی جانے والی تیاریوں اور امتحانات کے مختلف مراحل کا معلوماتی انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان کی پیش کردہ معلومات یقیناً اعلیٰ امتحانات میں شرکت کرنے والے نوجوانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ایچ۔ سی۔ ایس کی تربیت تین سال کی مدت میں ہوتی تھی پہلا سال سیول سرویس ہاؤز میں بسر ہوتا تھا اور ٹریننگ کلاسس صبح چھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک مسلسل ہوتی رہتی تھیں۔ جس میں قانون کے بارہ مضامین بی۔ اے کے معیار کی معاشیات اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے سال چہارم کی کتاب صحت عامہ (HYGIENE) کے علاوہ گھوڑ سواری ، رائفل ریٹنگس اور پیراکی شامل تھے۔ ایک سال بعد ان سب مضامین کا امتحان ہوتا تھا۔ دوسرے سال ریاست حیدر آباد کے ان تمام محکموں کی عملی ٹریننگ ہوتی تھی جن میں سیول سرویس کے عہدہ داروں کو آئندہ زندگی میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اور تمام متعلقہ محکمہ جاتی امتحان کامیاب کرنے ہوتے تھے۔ دو سال کی ٹریننگ کے بعد پروبیشنرز (PROBATIONERS) کا مختلف محکموں کے لیے انتخاب عمل میں آتا تھا۔ جن میں مال ، فینانس ، آڈٹ اینڈ

اکاؤنٹس، پولیس، عدالت اور محکمہ بر شامل تھے۔ اس انتخاب کے بعد پروبیشنرز کو برطانوی ہند کے کسی صوبے میں مزید ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا تھا اور مال اور پولیس کی ٹریننگ آئی۔ ای۔ اے۔ ایس اور آئی۔ پی عہدے داروں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس سال بھی برطانوی ہند کے وہ امتحانات کامیاب کرنے پڑتے تھے جو حکومتِ ہند کے متعلقہ عہدے داروں کے لیے ضروری ہوں۔ تین سال کے بعد ان کا تقرر عمل میں آتا تھا۔" (۱۰)

باشم علی اختر آئی۔ اے۔ ایس کے دوران ان تمام مراحل سے گزرے اور آخر کار ان کا تقرر محکمہ کروڑگیری کے مہتمم کے طور پر عمل میں آیا اور بعد میں آندھرا پردیش کے مختلف اضلاع میں انھوں نے مختلف محکموں میں اپنی خدمات انجام دیں۔ محکمہ آبپاشی کے لیے ان کی خدمات یادگار رہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس خاکہ میں باشم علی اختر کی سرکاری زندگی کے احوال پیش کرنے کے بعد ان کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی پیش کیا۔ آئی۔ اے۔ ایس عہدے دار کی مہارت سے زندگی کا ہر شعبہ مستفید ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ چناں چہ باشم علی اختر نے سماجی شعبہ میں بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ دراصل ذات میں انجمن تھے۔ مصروف ترین اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے بھی انھوں نے ادبی اور سماجی ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہیں کی۔ چناں چہ ڈاکٹر زور کی رحلت پر مسند رراج سکسینہ کی خواہش پر انھوں نے ۲۸ / جون ۱۹۶۵ء کو ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کی اعزازی معتمدی قبول کی اور اپنی گراں قدر آراء اور تجربات سے ادارہ کی بقاء اس کی ترقی و ترویج میں بھرپور کردار ادا کیا۔ باشم علی اختر کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا ۲۵۰ / دسمبر ۱۹۸۲ء کو وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور جس جامعہ سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کیے تھے، اسی جامعہ کے اعلیٰ ترین انتظامی عہدے پر فائز ہوئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کے ماحول میں بھی کافی تبدیلی آئی۔ طلباء تنظیموں کی بڑھتی ہوئی بدنظمی اور یونیورسٹی کے بڑھتے ہوئے انتظامی نظم و نسق کو حسن و خوبی سے چلانا ایک تجربہ شخص کا ہی کارنامہ ہوسکتا ہے۔ چناں چہ باشم علی اختر نے عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے دوران یونیورسٹی کا نظم و نسق بہ حسن و خوبی چلایا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اس خاکہ سے ہمیں ہاشم علی اختر کے خاندانی احوال کا بھی پتہ چلتا ہے۔
ہاشم علی اختر کی شادی ۶/ جون ۱۹۴۸ء کو بیرسٹر اکبر علی خاں کے بڑے بھائی احمد علی خاں صاحب مرحوم انجینئر کی بیٹی افتخار النساء بیگم (عرف وحید) سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں دو لڑکیاں سارہ ہاشم، وسیما ہاشم اور ایک لڑکا صدیق انور ہوئے۔ باپ کی طرح ان کی اولاد نے بھی اعلی تعلیم حاصل کی اور ترقی کے مراحل طے کیے۔

ایک آئی۔ اے۔ ایس عہدے دار کی زندگی ایک جگہ نہیں گزرتی اور نہ ہی اسے چین و سکون و فرصت کے لمحات ملتے ہیں تاکہ وہ گھر کی طرف بھی زیادہ توجہ دے سکے۔ ایسے میں اس کی بیوی سلیقہ مند ہو تو گھر گھر بن سکتا ہے چناں چہ اس معاملہ میں ہاشم علی اختر خوش قسمت ثابت ہوئے۔ ان کی اہلیہ کے ذمہ دارانہ رول کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"آپ کی ازدواجی زندگی مثالی کہی جاسکتی ہے۔ انسان کو کامیاب بنانے اور بامعنی بنانے میں اس کی شریکِ حیات اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب کی سرکاری زندگی کی سخت مصروفیات اور لمبے لمبے دوروں کے باوجود ان کی رفیقہ حیات نہایت خوش دلی کے ساتھ گھر کے سارے مسائل کو خود نمٹاتی رہیں۔ جس کی وجہ سے ہاشم علی صاحب کو یکسوئی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض ادا کرنے کا موقع مل سکا۔ ان کی رفیقہ کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ گھریلو انتظامات میں شاید ہی ہاشم علی صاحب کو دخل دینے کی ضرورت پیش آئی ہو، ہاشم علی صاحب کے اوقات کار صبح ۹ تا ۵ بجے شام اور رات ۹ تا ۱۲ بجے میں، شام کے ۵ بجے سے رات کے ۹ بجے تک آپ اہلِ خاندان کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے۔" (۱۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ہاشم علی اختر کی زندگی کی سرکاری اور گھریلو مصروفیتوں کو پیش کرنے کے بعد ان کی شخصیت پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ہاشم علی اختر کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"ہاشم علی اختر صاحب سادگی پسند، خوش ذوق اور زندہ دل انسان ہیں۔ ان میں افسرانہ

رعونت بالکل نہیں۔ محفلوں میں ان کی وجہ سے زندگی اور رونق آجاتی ہے ان کی گفتگو شائستہ، دل چسپ اور معلومات آفرین ہوتی ہے۔ اپنے لطیفوں اور مزاحیہ فقروں سے ایک زندہ دلی کی کیفیت اور فضا پیدا کردیتے ہیں۔ اشعار کی برجستہ تحریف کرنے میں بھی انھیں کمال تھا۔" (۱۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہاشم علی اختر کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ لوگ انھیں فرمائشی "ادیب" خیال کرتے تھے۔ کیوں کہ انھیں اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ادبی تخلیقات کے لیے وقت نکال سکیں۔ انھوں نے اکثر آل انڈیا ریڈیو یا کسی ادارے کی فرمائش پر مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ آبپاشی کے موضوع پر انھوں نے کتابیں لکھیں، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بتاتے ہیں کہ ہاشم علی اختر نے ملک و بیرون کئی سمیناروں میں حصہ لیا اور مقالے پیش کیے۔ ہاشم علی اختر کا ایک اہم مقالہ "اردو کی بقا، ترویج اور ترقی کے مسائل" ہے۔ جس میں اردو کے مسائل کا جائزہ لیا گیا۔ اسی موضوع پر "سب رس" کے زیر اہتمام ایک سمینار پروفیسر گیان چند جین کی صدارت میں منعقد ہوا۔

اردو کے شان دار ماضی اور دھندلے مستقبل کے بارے میں بھی ہاشم علی اختر نے اپنی آرا، پیش کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اس سلسلے میں ان کے خیالات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حالات کے بدل جانے کی وجہ سے خود ان کے بچوں کی تعلیم انگریزی میڈیم سے ہوئی۔ بچے غالب اور اقبال کو نہیں سمجھ سکتے یہ ایک قسم کی ثقافتی بے مائیگی (کلچرل ڈی شیٹنس) ہے ... موجودہ حالات میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کے کسی بھی مضمون پر انگریزی میں بڑی تعداد میں کتابیں مل جاتی ہیں۔ جب کہ کئی مضامین ایسے ہیں جن پر ہندستان زبان میں کوئی کتاب نہیں ملتی، انگریزی اس وقت بین الاقوامی زبان ہے۔" (۲۰)

ہاشم علی اختر ذریعہ تعلیم کے لیے مقامی سرکاری زبان کے استعمال اور مادری زبان کو زبان دوم کے طور پر پڑھانے کے نظریہ کی وکالت کرتے ہیں اس سلسلے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہاشم علی اختر کے خیالات

پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایسے مقامات پر جہاں انگریزی زبان کی تعلیم کی سہولت حاصل ہے انگریزی میں بھی تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن سرکاری زبان کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے ایسا کرنے سے حکومت اور اس کے ہزاروں کارکنوں سے جس سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ سرکاری زبان سے عدم واقفیت قومی دھارے میں شامل ہونے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔" (۲۱)

ہاشم علی اختر چوں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ لہذا انھیں ہر طرح کے طلباء اور اساتذہ سے بھی سابقہ پڑا۔ چناں چہ انھوں نے موجودہ زمانے میں طلباء میں بڑھتی ہوئی ڈسپلن شکنی اور اساتذہ کے گرتے ہوئے تدریسی معیار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہاشم علی اختر کے اس ضمن میں خیالات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"طلبہ سیاست میں حصہ لینے لگے ہیں۔۔۔ آج جو سیاست ہے اس میں اخلاقی قدریں باقی نہیں رہیں۔ اس کی وجہ سے اس کا طلبہ پر برا اثر رہا ہے۔ آج کل اساتذہ طلبہ میں دل چسپی نہیں لیتے۔ بعض اساتذہ ایسے بھی ہیں جو اپنے مضمون میں کم زور ہیں۔ اسی لیے وہ طلبہ سے ڈرتے ہیں۔۔۔ طلبہ کے چھوٹے چھوٹے گروہوں سے اساتذہ کو ربط رکھنا چاہیے تاکہ باہمی تعلق برقرار رہے۔۔۔ طلباء کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہاسٹلوں، کالجوں اور کھیل کے میدان میں اساتذہ کو خود جاکر شخصی ربط پیدا کرنا چاہیے اس کی وجہ سے کم از کم طلبہ کے ظاہری اخلاق بہترین ہوسکتے ہیں۔" (۲۲)

ہاشم علی اختر کے ان خیالات سے طلباء کے کردار کی درستگی اور اساتذہ کے تعلیمی معیار میں بہتری ممکن ہے۔ ہاشم علی اختر نے چوں کہ زندگی کی اونچ نیچ دیکھی تھی۔ اس لیے انھوں نے تعلیم کے مطابق روزگار نہ ملنے والے نوجوانوں کو احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے انھیں سعی مسلسل کی ترغیب دی ہے۔

خاکہ کے آخر میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ہاشم علی اختر صاحب سے مزید خدمات کی امید رکھی ہے۔

ہاشم علی اختر کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اس تفصیلی خاکے کے جائزے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک تعارفی، تاثراتی مدحیہ اور توصیفی کرداری و معلوماتی خاکہ ہے۔ اس خاکے میں قاری سے ہاشم علی اختر کی شخصیت کا اجمالی تعارف ہو جاتا ہے۔ زندگی کے عملی میدان میں ہاشم علی اختر کی ترقی اور کامیابی سے متاثر ہو کر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی جا بجا تعریف و توصیف کی ہے۔ یہ خاکہ ایک لحاظ سے معلوماتی خاکہ بھی ہے۔ کیوں کہ اس میں تحقیق کرنے والوں کے لیے ہاشم علی اختر کی حیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آئی۔ اے۔ ایس سے متعلق معلومات دل چسپی سے کم نہیں۔ ہاشم علی اختر سے متعلق یہ خاکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے کیوں کہ اس خاکہ میں ۱۹۰۰ء کی دہائی میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاسٹلوں کی حالت اس عہد کے اساتذہ اور اس دور کے طلباء کے بارے میں تاریخی مواد ملتا ہے۔ طلباء اور اساتذہ کی اصطلاح کے بارے میں ہاشم علی اختر کے خیالات ہر زمانے کے طلباء اور اساتذہ کے لیے مشعل راہ ہوں گے چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ہاشم علی اختر کی شخصیت پر تاثراتی و معلوماتی خاکہ لکھ کر ہاشم علی اختر جیسی نابغہ روزگار شخصیت کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" کا دوسرا خاکہ "سید علی اکبر صاحب حیدرآباد کے ممتاز ماہر تعلیم" ہے۔ آزادی سے قبل حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی چندہ یادگار شخصیتوں میں ایک سید علی اکبر صاحب ہیں جو سابق ناظم تعلیمات تھے۔ خدا نے انھیں خاندانی شرافت، دولت و عزت اور نئی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تعلیم کی اصلاح کے لیے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی خدمات کے اعتراف اور نئی نسل کو ان کے کارناموں سے واقف کرانے کے لیے ان پر یہ خاکہ لکھا۔ جس میں سید علی اکبر صاحب کی زندگی اور ان کے علمی کارناموں کے بارے میں بھرپور معلومات ملتی ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سید علی اکبر کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے آباد اجداد ایرانی نژاد تھے اور آغا خاں کی دعوت پر ہندستان آئے تھے۔ سید علی اکبر کے دادا سید علی اکبر آغا خاں

کے ملازم ہوئے۔ سید علی اکبر کے والد سید محمد صاحب "امپریئل سروس ٹروپس" اور "پائیگاہ آسمان جاہی" میں بہ حیثیت کمانڈر خدمات انجام دیں۔ سید محمد صاحب کی دوسری بیوی حاجی بیگم کی دوسری اولاد سید علی اکبر ہیں۔ یہ ۱۶/ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی بعد میں کنڈر گارٹن میں شریک ہوئے۔ مدرسہ عالیہ سے ہی سید علی اکبر نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا، بمبئی کے ولسن کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا، بی۔ اے سال آخر میں یورو پین اسکالر شپ کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۲ء میں انگلستان روانہ ہوئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے معاشیات میں آنرز کی ڈگری حاصل کر کے ۱۹۱۶ء میں حیدر آباد واپس ہوئے اور نظام کالج میں مدد گار پروفیسر تاریخ و معاشیات مقرر ہوئے۔ لیکن انھیں گریڈ دینے کے سلسلے میں ناانصافی ہونے پر ملازمت چھوڑ دی۔ ان کے جگری دوست نواب سعید یار جنگ نے ناظم تعلیمات حیدر آباد سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) سے سید علی اکبر کی سفارش کی جس پر انھوں نے صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے سید علی اکبر کا گلبرگہ پر تقرر کیا۔ چار سال گلبرگہ میں کام کرنے کے بعد وہ حیدر آباد آئے اور تیرہ سال تک صدر مہتمم تعلیمات رہے۔ ۱۹۳۶ء میں وہ نائب ناظم تعلیمات اور ۱۹۴۳ء میں نظام کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، ۱۹۴۵ء میں ناظم تعلیمات کے عہدے پر ترقی ہوئی اور اسی جلیل القدر عہدے سے ۱۹۴۷ء میں سبک دوش ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں حیدر آباد ایونگ کالج کے قیام کے ساتھ ہی سید علی اکبر اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں سبک دوش ہونے کے بعد انوار العلوم کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ کالج کے قیام سے تقریباً پندرہ سال انھوں نے کالج کے فروغ کے لیے کام کیا۔ اس کالج سے سبک دوشی کے بعد وہ کئی اہم اداروں سے وابستہ رہے جس میں ادارہ ادبیاتِ اردو کی صدارت اور "سب رس" کی نگرانی بھی شامل ہے۔

سید علی اکبر کی شادی ۱۱/ جون ۱۹۱۸ء کو میجر محمد علی مرزا مرحوم کی دختر شاہ جہاں بیگم سے ہوئی۔ جن سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تولد ہوئیں۔ سید علی اکبر کی اولادوں نے بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سید علی اکبر نے مختلف سمیناروں میں شرکت کے لیے کئی مرتبہ بیرون ملک دورہ بھی کیا۔ ان کی ان سرگرمیوں کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"۱۹۲۷ء میں سید علی اکبر صاحب نے حیدرآباد اسٹیٹ گورنمنٹ کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے محمد حسین جعفری مرحوم سابق ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد کے ساتھ امپیریل ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ لندن میں شرکت کی اور جامعہ عثمانیہ پر اپنا مقالہ پڑھا وہاں سے وہ جرمنی بھی تشریف لے گئے۔ جرمنی کے تعلیمی حالات کا بہ غور مطالعہ کیا ۱۹۲۱ء میں سید علی اکبر کو دوبارہ یورپ جانے کا موقع ملا۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں مرحوم آصف سابع نے ان کو اپنے بھائی نواب صلابت جاہ بہادر کے ہم راہ سات ماہ کے تعلیمی دورے پر روانہ کیا۔ یورپ کے اس دورہ پر وہ انگلستان کے علاوہ فرانس، جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ بھی تشریف لے گئے"۔ (۲۳)

سید علی اکبر نے چوں کہ زندگی کا بیش تر حصہ تعلیمی اداروں میں گزارا تھا۔ لہٰذا انھیں نظام تعلیم کی خامیوں اور ان کے سدھارنے کی فکر لگی رہی تھی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے تعلیمی نظام کے نقائص اور ان کی اصلاح کے بارے میں کہا:

"پہلا نقص یہ ہے کہ پرائمری تعلیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ابھی ہمارے ملک میں ناخواندگی بہت زیادہ ہے۔ اب تک صرف (۳۰) فی صدی خواندگی ہے۔ اس جانب توجہ کی جانی چاہیے دوسرا نقص یہ ہے کہ نظام تعلیم میں یکسانیت ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے ہمیں چاہیے کہ پری یونیورسٹی کورس شروع کریں۔ صنعت و حرفت کو تعلیم کے ساتھ شامل کیا جائے۔ اس سے غفلت نہ برتی جائے سب طلبہ اہل نہیں ہوتے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سائنس، آرٹس اور کامرس کی تعلیم ایسے طلبہ حاصل کریں جن میں اس کے حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ہائی اسکول کی سطح پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ طالبِ علم آئندہ کس شعبہ میں تعلیم حاصل کرے گا۔" (۲۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکہ میں سید علی اکبر کی زبانی تعلیم کے نقائص اور اس کی اصلاح کے بارے میں جو خیالات پیش کیے ان کی آج کے تعلیمی نظام کو بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ماضی میں تھی۔ اس طرح ان کا خاکہ تعلیمی نظام کی اصلاح میں ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سید علی اکبر کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۳۵ء میں آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کی سلور جوبلی کے موقع پر سید علی اکبر کو اعتراف خدمات کے طور پر "تمغہ آصفی" دیا گیا۔ اس موقع پر سید علی اکبر نے "سررشتہ تعلیمات کی تاریخ انگریزی میں مرتب کی جو Education Under AsifJaha VII کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ ادارہ ادبیاتِ اردو نے بھی ان کی خدمات کے اعتراف میں جلسوں کا اہتمام کیا۔ جس میں معزز حیدرآباد نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سید علی اکبر کی شخصیت کا ایک بھرپور خاکہ پیش کیا ہے۔ ان کا یہ خاکہ بہت حد تک تعارفی خاکہ ہے۔ اس میں بیانیہ انداز میں سید علی اکبر کے حالاتِ بیان کیے گئے ہیں اور ان کے علمی کارنامے بیان کرتے ہوئے انھیں اونچا مقام دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس خاکہ میں سید علی اکبر کی شخصیت ان کے عادات و اطوار ان کی پسند ناپسند درست احباب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ان کی گھریلو زندگی یا ان کی زندگی میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کا تذکرہ نہیں ملتا ہے اور نہ ہی خاکہ پڑھنے سے قاری کے ذہن میں سید علی اکبر کی کوئی مخصوص شبیہہ بنتی ہے۔ اس کے باوجود سید علی اکبر کے علمی کارنامے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ ایک علمی شخصیت کے تعارف کی حیثیت سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ ایک اچھا خاکہ کہا جاسکتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" کا تیسرا خاکہ "مولوی محمد عزیز مرزا" مرحوم ہے۔ آصف جاہی عہد میں ریاست حیدرآباد کی خدمت جن عظیم ہستیوں نے کی ان میں ایک عزیز مرزا تھے۔ وہ ایک اچھے مترجم، سوانح نگار، انشا پرداز، مخلص مصلح قوم مقرر اور قابل عہدے دار تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان پر ایک سوانح عمری "محمد عزیز مرزا" شخصیت حیات اور کارنامے تصنیف کی۔ جو ۱۹۸۰ء میں ادارہ شعر و حکمت کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ ۲۵۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے

عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی، ان کے علمی و ادبی کارناموں اور اس دور کے اہم واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم "خوش نفساں" میں پیش کردہ خاکہ میں تعارفی انداز میں عزیز مرزا کا ذکر کیا ہے۔ عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ عزیز مرزا کے آباد و اجداد چغتائی مغل تھے اور ان کا پدری سلسلہ اٹھارویں پشت میں ظہیر الدین بابر سے ملتا ہے عزیز مرزا کے پردادا مرزا جمیل بیگ خاں نظام الملک آصف جاہ کے ہم راہ حیدر آباد دکن آئے تھے۔ عزیز مرزا کے والد نواب ممتاز الدولہ کے منتظم تھے۔ عزیز مرزا ۱۸۶۵ء کو اس وقت کی ریاست ملک پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ نام مرزا مصطفیٰ بیگ تھا عرفیت عزیز میاں کے مشہور ہونے سے بعد میں عزیز مرزا کہلائے۔ بچپن میں ہی ماں کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ بڑے بہنوئی نے انھیں علی گڑھ مدرسہ میں شریک کروایا اور اعلیٰ تعلیم یہیں سے حاصل کی۔ ۱۸۸۸ء میں بی۔ اے دو مضامین سے آنرز سے کیا۔ ان کی شادی مغلیہ خاندان کے بزرگ دولہا مرزا کی پوتی و مرزا ابراہیم کی بیٹی مشرف جہاں بیگم سے ہوئی۔ نواب وقار الملک کو انگریزی سکھانے کے سلسلے میں سر سید کی سفارش پر حیدر آباد آئے اور تین سو روپیہ ماہ وار پر تقرر ہوا۔ چار سال بعد اول مدد گار ہوم سکریٹریٹ مقرر ہوئے۔ لوگوں نے ان کے خلاف سازش کی اور وہ بیڑ کے کلکٹر بنائے گئے۔ تبادلے سے لوگ ناخوش تھے۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں حضور نظام نے انھیں ہائی کورٹ کا جج بنا کر دوبارہ حیدر آباد بلوالیا۔ ۱۹۰۸ء میں آئی رودِ موسیٰ کے بعد ایک ریلیف کمیٹی بنائی گئی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے حکم سے عزیز مرزا معتمد کمیٹی بنائے گئے اور انھوں نے راحت و امداد کے لیے شان دار کام کیے۔ لیکن لوگ ان کی ترقی سے حسد کرنے لگے تھے۔ چناں چہ ان کے خلاف سازش ہوئی اور وہ حیدر آباد سے نکالے گئے۔ چناں چہ انھوں نے علی گڑھ کا رخ کیا۔ اپنی بیٹی کی موت کی خبر سن کر دل برداشتہ ہوئے اور خرابیِ صحت کے بعد ۲۶ / فروری ۱۹۱۲ء کو انتقال فرمایا۔ عزیز مرزا کے چھ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ عزیز مرزا کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا قد آور آدمی تھے۔ پیشانی بلند، مونچھیں داڑھی سے ملی ہوئی تھیں۔ داڑھی بھرے ہوئے چہرے پر بہت زیب دیتی تھی۔ آنکھیں کسی قدر ابھری ہوئی تھیں کلائیاں چکلی

اور مضبوط تھیں۔ شخصیت انتہائی بارعب تھی جس سے ملتے وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ صرف ۴۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا سر کے بال بھی سفید نہیں ہوئے تھے۔ لباس میں شیروانی اور پتلون حسب رواج پہنتے تھے۔ اس کے ساتھ ترکی ٹوپی ضرور رہتی تھی۔ یہ دفتری لباس تھا، دربار جاتے وقت سر پر دستار ہوتی تھی۔ عزیز مرزا بہت ہی زندہ دل تھے۔ زندگی کا نظام الاوقات مقرر تھا۔ وقت کی بڑی پابندی کرتے تھے زندگی میں سادگی تھی۔ اخلاق دل کش تھے۔ کسی بھی حاجت مند یا مظلوم کی ممکنہ اعانت کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ حافظہ بہت قوی تھا۔ اردو سیدھی سادی اور صاف ستھری بولتے تھے۔ ویسا ہی ان کا دل بھی صاف اور بے ریا تھا، وہ ہر ایک سے کھلے دل سے ملتے تھے لیکن صاف گوئی میں نہ چوکتے تھے۔ وہ بہت ہی نیک اور پرہیز گار انسان تھے، بڑوں کی عزت اور چھوٹوں کے ساتھ مشفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ نماز روزہ کے بڑے پابند تھے، کہیں ہوں اور کسی حالات میں ہوں نماز قضاء نہیں ہوتی تھی۔ مذہب کے بڑے پابند تھے۔ جس کی بنا پر ان کی تمام زندگی ایک آئینے کی طرح صاف وشفاف نظر آتی ہے خودداری اور انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔" (۲۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس خاکہ میں شخصیت نگاری پر بڑی توجہ دی ہے۔ حالاں کہ خاکہ نگار کو انھوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن پھر بھی بڑی تحقیق وجستجو سے خاکہ میں پیش کی جانے والی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ عزیز مرزا کی شخصیت کی پیش کشی کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ ثابت کیا ہے کہ عزیز مرزا ایک مکمل انسان تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے خاکے میں ان کی شخصیت کے تعارف کے بعد ان کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ عزیز مرزا نے گلگشت فرنگ اور دکرم اروشی کے نام سے دو تراجم کیے۔ سیرۃ المحمود کے نام سے ایک سوانح لکھی اور مضامین وانشائیوں کا مجموعہ خیالاتِ عزیز شائع کیا۔ اس کے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور اس کے مقاصد اور پولیٹیکل مقالے کے عنوان سے دو کتاب چھے اور چندر

پورشیں بھی تحریر کیں تصنیف و تالیف کے علاوہ عزیز مرزا نے ادبی و سماجی کاموں میں حصہ لیا اور بہت سے اداروں سے وابستہ رہے۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد رہے۔ مدرسہ نظامیہ کی امداد بڑھانے میں تحریک چلائی اور علوم مشرقیہ کے امتحانات کو پنجاب سے حیدرآباد منتقل کروایا اور طلباء کو سہولت پہنچائی اور علوم مشرقیہ کے لغات کی تیاری میں مدد کی۔ طغیانی رودِ موسیٰ کے وقت ان کی رفاہی خدمات کے اعزاز میں انگریزی حکومت نے انھیں "قیصر ہند" کا تمغہ دیا۔ عزیز مرزا کی شخصیت اور کارناموں کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے زبردست خراج پیش کیا۔ ان کے اقتباس کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکہ میں جگہ دے کر عزیز مرزا کے مقام کے تعین کی کوشش کی ہے۔ عبدالحق لکھتے ہیں:

> "یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ مرحوم (عزیز مرزا) حیدرآباد کی تمام قومی، ملکی اور تمدنی تحریکوں کے روحِ رواں تھے اور اس کا سب سے قوی ثبوت یہ ہے کہ جب سے مرحوم حیدرآباد سے گئے ہیں۔ حیدرآباد جیسا شہر سنسان ہوگیا ہے اور کسی قسم کی تحریک کا نام تک زبان پر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس کے دم کے ساتھ تھا جو خود علمی ذوق اور قومی درد رکھتا تھا اور دوسروں میں اس احساس کی قدر کرتا تھا۔" (۲۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کا خاکہ بھی تعارفی انداز میں لکھا۔ یہ بھی ایک مدحیہ اور توصیفی خاکہ ہے۔ اس میں پیش کردہ شخص کے نمایاں اوصاف اور شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو پیش کیا تھا۔ شخصیت کے محاسن پیش کیے گئے ہیں اور معائب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دنیا کی جتنی بڑی شخصیتیں ہیں ان کے معائب اگر ہوں بھی تو ان کے محاسن میں چھپ جاتی ہیں۔ یہی بات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی اپنے خاکوں کے ذریعہ ایسی شخصیتوں کو پیش کیا جنھوں نے حیدرآبادی زندگی میں بڑا نام کمایا ہے۔ اس لیے ان شخصیتوں کے معائب نہ کے برابر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب کسی مضمون نگار یا خاکہ نگار کو کسی شخصیت سے عقیدت ہوتی ہے تب ہی وہ اس کے بارے میں اظہارِ خیال کا ارادہ کرتا ہے اور جس شخص سے عقیدت ہو وہ ان کے بارے میں کسی

طرح کی نکتہ چینی سے احتراز کرتا ہے چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی اپنے خاکوں میں تعریفی و مدحیہ پہلو کو برتا ہے اور ماضی کی شخصیتوں کے احوال پیش کرتے ہوئے ایک اہم تاریخی دستاویز تیار کی ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" میں شامل چوتھا خاکہ "نواب سعید جنگ بہادر" ہے۔ نواب سعید جنگ بہادر عزیز مرزا کے دوسرے فرزند تھے جن کا خاکہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا ہے۔ نواب سعید جنگ بہادر کا نام گزشتہ حیدرآباد کے مشہور ماہرین قانون میں ہوتا ہے۔ وہ ریاست حیدرآباد کے محنتی اور ایمان دار چیف جسٹس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نواب سعید جنگ بہادر کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا نام سعید مرزا تھا۔ یہ ۱۱/ اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی۔ ممتاز ماہر تعلیم سید علی اکبر (سابق ناظم تعلیمات) ان کے ہم جماعت تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ روانہ ہوئے اور آب و ہوا راس نہ آنے کے سبب تین سال میں دوبارہ حیدرآباد واپس آگئے۔ مدرسہ عالیہ سے میٹرک کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۰۹ء کو انگلستان روانہ ہوئے اور بار (BAR) کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۲ء میں ہندستان واپسی پر ان کا تقرر فرسٹ گریڈ منصف اورنگ آباد ہوا۔ بعد میں انھوں نے بیدر، گلبرگہ، حیدرآباد، یلندو، ناندیڑ، عادل آباد اور نظام آباد میں بھی خدمات انجام دیں۔ ۹/ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو چیف جسٹس مقرر ہوئے اور "نواب سعید جنگ بہادر" کے خطاب سے نوازے گئے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سعید جنگ بہادر کے قیام انگلستان کی دل چسپ یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "انگلستان میں قیام کے زمانے میں مسعود جنگ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (ممتاز قومی لیڈر) ای۔ ایم فوسٹر، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ممتاز قومی لیڈر سید حسین، آصف علی (ارونا آصف علی کے شوہر) تصدق احمد خاں شروانی سے ان کے قریبی مراسم رہے۔ وطن سے دور دیارِ غیر میں سعید جنگ، مسعود جنگ، احمد مرزا اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی جیسے جیالے زندہ دل نوجوانوں نے کلب ۱۹/ جنوری ۱۹۱۱ء میں قائم کیا۔ جس کا نام "لفنگا کلب" رکھا گیا۔

کلب کا نام سن کر لوگ حیران رہ گئے ۔ مسعود جنگ نے یہ نام تجویز کیا۔ ان کا تصور یہ تھا کہ دوسری انجمنیں شان دار نام رکھتی ہیں مگر وہاں ذاتی اغراض کی تکمیل کی جاتی ہے ایسے عامیانہ اور ظریفانہ نام کے باوجود اس کلب نے مفاد عام اردو قومی تعمیر کے کاموں کی انجام دہی میں مخلصانہ خدمت کی۔" (۲۷)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سعید جنگ بہادر کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں ادب سے خاصا لگاؤ تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کی میزبانی کرتے تھے۔ مولانا شبلی، مولانا حالی، عبدالحلیم شرر، مولانا محفوظ علی، ڈاکٹر عبدالحق، فرحت اللہ بیگ وغیرہ کی انھوں نے میزبانی کی۔ طغیانی رودِ موسیٰ کے موقع پر انھوں نے "عزیز والنثیر کور" قائم کر کے متاثرہ لوگوں کی امداد کی اور گلزار حوض کے قریب جائداد کو "مسلم میٹرنیٹی ہاسپٹل" کے لیے وقف کر دیا۔ وہ صوم و صلواۃ کے پابند تھے۔ انھوں نے حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی اور کئی ممالک کا سفر کیا تھا۔ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"سجاد مرزا (مرحوم) جناب غلام یزدانی مرحوم اور مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے ساتھ مل کر انھوں نے اردو مجلس کا قیام عمل میں لایا وہ اردو مجلس کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔۔۔ انھوں نے ۵۰ سے زائد مضامین مختلف موضوعات پر "سیاست" میں لکھے ہیں۔ "سیاست" کے علاوہ ہندو پاک کے ادبی جریدوں میں بھی چھپتے رہے ہیں۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے انھوں نے اپنے والد عزیز مرزا کی تصنیف "وکرم اروسی" کا مقدمہ شائع کروایا ہے۔" (۲۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحریر کردہ خاکہ "نواب سعید جنگ بہادر" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ریاست حیدر آباد کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے اور شعبہ قانون میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں تھیں۔ آنے والے زمانے میں شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والوں کے لیے سعید جنگ بہادر کی شخصیت یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ بھی بیانیہ انداز میں ایک تعارفی خاکہ ہے۔ اس خاکہ میں

شخصیت کے حالاتِ زندگی پیش کیے گئے ہیں مدحیہ اور توصیفی پہلو کم دکھائی دیتا ہے ،خاکہ نگار کی شخصیت کو مزید ابھارنے اور واضح طور پر پیش کرنے کے لیے مزید واقعات کی گنجائش تھی۔ خاکہ کے مطالعہ سے سعید جنگ بہادر کی ایک بہم سی تصویر قاری کے ذہن پر مرتسم ہوتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ بھی تاریخی دستاویز کے طور پر شمار ہوسکتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" میں شامل پانچواں خاکہ "ڈاکٹر موہن لال نگم ،ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم حیدرآباد" ہے۔ موہن لال نگم صاحب کا نام حالیہ عرصہ تک سالار جنگ میوزیم کے ساتھ ان کی خدمات کے ضمن میں اخبارات کی زینت بن کر سب کی زبان زد عام و خاص تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اب تک جن شخصیتوں کے خاکے پیش کیے وہ سب مسلمان تھے۔ لیکن اس مرتبہ انھوں نے ایک غیر مسلم شخصیت کا انتخاب کر کے نہ صرف اپنی جانب سے مذہبی رواداری اور غیر جانب داری کا ثبوت دیا بلکہ یہ بھی ظاہر کیا کہ حیدرآبادی تہذیب کے فروغ میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے بلالحاظ مذہب و ملت حصہ لیا اور خود اردو ادب میں بھی غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے اظہار بیان کے لیے اردو زبان کو استعمال کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ زبان کا تعلق کسی مخصوص مذہب یا طبقہ سے نہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں چند نامور غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے نام گنواتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"اردو ادب کا مورخ یا طالبِ علم رتن ناتھ سرشار ،برج نارائن چکبست ،درگا سہائے سرور ،دیا نرائن نگم ،منشی پریم چند ،فراق گورکھپوری ،راجندر سنگھ بیدی ،اوپیندر ناتھ اشک ،آنند نرائن ملا پروفیسر گیان چند جین ،پروفیسر گوپی چند نارنگ ،پروفیسر حکم چند نیر ،پروفیسر جگناتھ آزاد ،ڈاکٹر عابد شاوری ،ڈاکٹر راج بہادر گوڑ وغیرہ جیسے ممتاز ادیبوں ،شاعروں ،دانشوروں کی بے لوث خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ان تمام دانشوروں کے بتائے ہوئے راستے پر ڈاکٹر موہن لال نگم ،ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم حیدرآباد بھی گامزن ہیں۔" (۲۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ خاکہ کے آغاز میں موہن لال نگم کے آباد و اجداد کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بچپن کے احوال بیان کرتے ہیں کہ موہن لال نگم کا تعلق کائستھ گھرانے سے ہے اور اس طبقہ کی بارہ شاخوں میں سے ایک نگم ہے۔ اتر پردیش کے بندیل کھنڈ علاقے میں موہن لال نگم کے والد شری شیو دیال نگم بڑے زمین دار تھے۔ ان کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑے لڑکے موہن لال نگم ۳/ اگست ۱۹۳۳ء کو باندہ بندیل کھنڈ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، پرائمری مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم باندہ میں ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں درجہ دوم سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور کانپور سے انٹر کامیاب کیا، اسی زمانے میں ان کی شادی حمید پور کے زمین دار شمبھو دیال سنگھ کی صاحب زادی سے ہوئی اور اولاد میں دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔ موہن لال نگم نے الہ آباد یونیورسٹی کالج سے بی۔ اے کیا۔ فراق گورکھپوری کی شاگردی میں شعری ذوق پروان چڑھایا لکھنو یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔ اے کیا اور تین سال تک تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ پھر ملازمت سے استعفیٰ دے کر اسٹیٹ میوزیم لکھنو میں اسسٹنٹ کیوریٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ کامن ویلتھ اسکالرشپ حاصل کرنے کے بعد لندن گئے اور پی ایچ۔ ڈی کے ساتھ میوزیالوجی کا دو سالہ ڈپلوما ایک سال میں مکمل کیا۔ ۱۹۶۳ء میں (F.R.S) فیلو آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے نامزد ہوئے۔ سالار جنگ میوزیم کے حیدر آباد میں قیام کے بعد نگم صاحب کا تقرر ڈپٹی کیپر کی حیثیت سے ہوا اور ترقی کرتے ہوئے ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم بنائے گئے۔ ۱۹۷۶ء میں انھوں نے "نویں اور دسویں صدی عسوی کے ہندستانی کلچر کے موضوع پر مقالہ لکھ کر لکھنو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی میوزیالوجی موضوع پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تصنیف "جیڈ کلکشن ان سالار جنگ میوزیم" پر ۱۹۸۱ء میں انھیں "پریسیڈنٹ ایوارڈ" دیا گیا۔ انتظامی امور کے ساتھ ساتھ علمی دنیا میں بھی نگم صاحب نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ان کی دس کتابیں اور ۴۰ (چالیس) تحقیقی مقالے ہندستان اور بیرون ہند موقر جریدوں میں چھپ چکے ہیں ڈاکٹر موہن لال نگم اردو اور ہندی کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے خاکہ میں نگم صاحب کے کلام کے کچھ نمونے پیش کیے جو اس طرح ہیں۔

"کچھ لوگ نہ جانے کیوں بہاروں سے ڈرا کرتے ہیں
راہ فنا میں غم کے نظاروں سے ڈرا کرتے ہیں

ہم کس بنا پر ان سے امید وفا رکھیں
پھولوں میں پلے ہیں خاروں سے ڈرا کرتے ہیں

جو زندگی پہ مرتے ہیں کیا خاک جیا کرتے ہیں
سر باندھے کفن قوم کے دیوانے جیا کرتے ہیں"(۳۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکہ میں موہن لال نگم صاحب کی شاعری کا نمونہ پیش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ وہ ماہر میوزیالوجی کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ نگم صاحب کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہوا پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ ضرور نگم صاحب کے لیے خراجِ عقیدت رہا ہوگا۔ اس خاکہ کے ذریعہ زندگی کے ایک الگ طرح کے شعبہ میوزیموں کی دیکھ ریکھ کے بارے میں موہن لال نگم صاحب کی خدمات سے واقفیت لوگوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہوگی۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" میں شامل خاکہ "شاعر ملت حضرت باقر امانت خانی" ہے۔ اب تک پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ایک آئی۔ اے ایس آفیسر، مشہور ماہرِ تعلیم، ماہرِ قانون، سماجی شخصیت اور ماہرِ میوزیالوجی شخصیتوں کے خاکے لکھے تھے۔ ان کا زیرِ نظر خاکہ ایک شاعر اور مصور سے متعلق ہے۔ آج سے سو سال قبل شعرا کی بہتات تھی۔ ایسے میں ایک شاعر کی شخصیت کو بہ طور تعارف اور خاکہ کے پیش کرنا اس بات کی غماز ہے۔ باقر امانت خانی اور شاعروں کی قبیل سے ہٹ کر تھے۔ یہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے مشہور مرثیہ گو شاعر تھے۔ مرثیہ کا نام سنتے ہی عام طور سے ذہن لکھنو کے مشہور مرثیہ گو شعرا میر انیس اور مرزا دبیر کی جانب چلا جاتا ہے۔ لیکن دکن میں بھی چند ایک پائے کے مرثیہ گو شعرا گزرے ہیں ان میں سے ایک حضرت باقر امانت خانی ہیں۔ حیدرآباد میں لکھنو کی طرح اہلِ تشیعہ حضرات کا ایک بڑا طبقہ رہا ہے۔

شعرائے کرام حصولِ ثواب کی خاطر اور بادشاہوں اور نوابوں سے صلہ کی تمنا میں مرثیے لکھتے تھے چناں چہ لکھنو کے علاوہ جنوبی ہند میں حیدرآباد بیجاپور وغیرہ میں مرثیہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ حیدرآباد کے مرثیہ نگار شاعر اور مصور باقر امانت خانی کے احوال زندگی بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ باقر امانت خانی کا اصلی نام میر محمد باقر رضوی اور باقر تخلص ہے۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں ان کے آباد و اجداد میں دو لوگوں کو امانت خاں اوّل اور امانت خاں ثانی کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ اسی نسبت سے باقر صاحب اپنے تخلص کے ساتھ امانت خانی لکھتے ہیں۔ ۱۹ / مارچ ۱۹۰۹ء کو ماتا کی کھڑکی حیدرآباد میں باقر صاحب کی ولادت ہوئی۔ والد میر زین العابدین جاگیردار منصب دار کے علاوہ اچھے خوش نویس تھے۔ باقر صاحب کی تعلیم نارمل اسکول مشقی (موجودہ چادر گھاٹ ہائی اسکول) اور وسطانوی تعلیم دارالشفا مڈل اسکول میں حاصل کی۔ گورنمنٹ سٹی کالج ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی۔ بعد میں مدراس سے فنِ مصوری پر ڈپلوما کیا اور آپ کا تقرر چنچل گوڑہ ہائی اسکول آرٹ سیکشن میں ہوا۔ فانی بدایونی کے ذریعہ باقر صاحب کا تعلق مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد صدر اعظم ریاست حیدرآباد سے ہوا جنھیں فنِ مصوری سے لگاؤ تھا باقر صاحب شاد صاحب کی بنائی ہوئی تصویروں کو درست کرنے لگے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ باقر امانت خانی کی مصوری کی شہرت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "مصور کی حیثیت سے باقر صاحب کی شہرت حیدرآباد ہی میں نہیں ہندستان اور بیرون ہند پہنچ چکی ہے باقر صاحب نے غالب کے اشعار پر معنی خیز اور خوب صورت مرقع بنائے وہ اب تک ڈیڑھ سو سے زیادہ تصاویر بنا چکے ہیں شعرا اور ادبا کی جو تصاویر اردو ہال (حیدرآباد) میں آویزاں ہیں ان میں میر انیس کی تصویر باقر صاحب ہی کی کہ موقلم کا شاہ کار ہے۔" (۳۱)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے باقر صاحب کی شخصیت کے ایک پہلو "مصور" کو پیش کرنے کے بعد انھیں بہ طور شاعر اور مرثیہ نگار پیش کیا اور کہا کہ ۲۲ سال کی عمر سے باقر صاحب نے شعر کہنا شروع کیا۔

انھوں نے ایک سلام سے اپنی شاعری کی ابتدا کی اس کا ایک شعر یہ ہے:

تسکین تشنگی ہے شہ دیں کا نام پاک

سچ پوچھیے تو پیاس کا دریا حسین ہیں" (۳۲)

باقر صاحب نے ابتدا میں اپنے حقیقی ماموں مولانا مرزا بہادر علی صفی حیدرآبادی سے اور بعد میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ شیر علی افسوس کے نواسے میر محمد علی سرور سے کلام پر اصلاح کی باقر امانت خانی نے شاعری میں سلام، قصیدے، غزل، قطعات اور مرثیے کہے۔ انیس کی طرح انھوں نے بھی غزل گوئی چھوڑ کر مرثیہ گوئی اختیار کی۔ ان کی غزل گوئی میں بھی اہلِ بیت اطہار سے عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی غزلوں سے منتخب اشعار پیش کیے ہیں۔

جوہر خون زندگی ٹپکے رگ ممات سے — بس یہ دعائے مختصر نکلی دل حیات سے

حسنِ عمل سے رنگ بھرے نقشِ صفات نیک میں — موت کا جب ہے تو مقر کام تو لے حیات سے

نبض کی چال سے کٹیں عمرِ رواں کی منزلیں — نغمِ موت سن لیا تار رگ حیات سے

ایک برچھی ہے کہ پیوند جگر ہوتی ہے — کیا یہی چاہنے والوں کی نظر ہوتی ہے

زندگی میں نہ سنی دل کے دھڑکنے کی صدا — نبض رکھتی ہے تو دنیا کو خبر ہوتی ہے (۳۳)

باقر امانت خانی کا اصل میدان سخن مرثیہ نگاری تھا۔ اس صنف میں ان کے کارناموں کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ باقر صاحب کی تصانیف میں "امانت سخن، ادبی امانت" امانتِ غم کے علاوہ انفرادی طور پر ان کے کئی مرثیے چھپوا کر مجالس عزا میں تقسیم ہوئے۔ اردو کے ممتاز شعرا ادیبوں اور نقادوں نے باقر امانت خانی کے فن پر تبصرہ کیا ہے۔ اردو کے ممتاز شاعر و ادیب جوش ملیح آبادی مرحوم باقر صاحب کی مرثیہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ بڑے حوصلے کی بات ہے کہ باقر امانت خانی گزشتہ پچیس برس سے برابر مرثیے لکھ رہے ہیں اور تھکتے نہیں کسی ایک ہی موضوع پر مسلسل لکھنا کمالِ فن کا عملی ثبوت ہے۔" (۳۴)

اسی طرح مشہور نقاد پروفیسر احتشام حسین نے باقر صاحب کی مرثیہ نگاری کے بارے میں اپنی آرا پیش کی ہے۔

"میں نے باقر رضوی امانت خانی کے کئی مرثیے دیکھے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کا فن مسلسل ترقی کر رہا ہے اور ہر بار وہ غواصی کر کے کوئی در یکتا نکال لاتے ہیں۔" (۳۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ باقر امانت خانی کا اردو مرثیہ نگاری میں مقام بتاتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں:

"صنف مرثیہ کو دکن میں پروان چڑھانے میں باقر صاحب کا اہم رول رہا ہے۔ فن مرثیہ گوئی میں ان کی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں "انیسِ دکن" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔" (۳۶)

اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے باقر امانت خانی کی شخصیت کی عکاسی کی ہے۔ اس خاکہ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے باقر امانت خانی کو بہ حیثیت مصور اور بہ حیثیت مرثیہ نگار پیش کیا ہے۔ بہ حیثیت مصور ان کے کارنامے بیان کیے ہیں لیکن بہ حیثیت مرثیہ نگار ان کے تعارف میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے مراثی سے کلام کا نمونہ نہیں دیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے مرثیوں میں پائی جانے والی کسی خاص بات کا ذکر ملتا ہے جب کہ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری کے مطالعہ میں ہمیں مرثیہ نگار کے زبان و بیان، جذبات نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور واقعات نگاری جیسی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ اس لحاظ سے باقر امانت خانی کا بہ حیثیت مرثیہ نگار تعارف مکمل نہیں دکھائی دیتا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے چوں کہ یہ خاکے صحافت کے لیے لکھے تھے۔ اس لیے جگہ کی تنگ دامنی اس طرح کی تفصیلات میں رکاوٹ بن سکتی ہے لیکن جب ان خاکوں کو کتابی شکل دی جارہی ہو تو ان میں ترامیم و اضافہ کی گنجائش نکل آتی ہے۔ ان تمام امور کے باوجود باقر امانت خانی سے متعلق پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ معلومات آفرین ہے۔

"خوش نفساں" خاکوں کے مجموعہ میں شامل ساتواں خاکہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "سعید الشعرا، حضرت سعید شہیدی" کے نام سے لکھا۔ سعید شہیدی حیدرآباد اور جنوبی ہند کے نامور شعرا میں سے ہیں اور یہ اپنے کلام کی مخصوص لفظیات کے بدولت شاعر "برق و آشیاں" کے نام سے ادب کے حلقوں میں جانے جاتے

ہیں۔ سعید شہیدی کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ ان کا نام میر عابد علی ہے۔ یہ ۱۴/ جولائی ۱۹۱۴ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے میٹرک کیا۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ گئے تھے لیکن خرابی صحت کی بنا واپس حیدرآباد آگئے۔ ۱۹۳۵ء میں سررشتۂ آبکاری میں ملازمت اختیار کی ۱۴ سال حیدرآباد میں اور ۲۰ سال مختلف اضلاع میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۹ء میں مہتمم آبکاری حیدآباد کے دفتر سے وظیفہ پر سبک دوش ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں سعید شہیدی کی شادی ماموں زاد محترمہ فاطمہ بیگم سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

ان کی منجھلی صاحب زادی بدر فاطمہ اچھی شاعرہ ہیں اور حنا شہیدی تخلص کرتی ہیں۔ سعید شہیدی کے والد میر مہدی علی مرحوم شہید (شہید یار جنگ) بھی اچھے شاعر معظم جاہ شجیع کے استاد تھے۔

سعید شہیدی کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۴۔ ۱۵ سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ نظام کالج میں فانی بدایونی، صدق جاسی اور یگانہ چنگیزی جیسے شاعروں کی موجودگی میں سعید شہیدی نے کلام سنایا تھا ان کا ایک شعر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بہ طور انتخاب پیش کیا ہے۔

مبتلائے زلف گھبراتے نہیں کھیلتے ہیں قید میں زنجیر سے (۳۷)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سعید شہیدی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سعید صاحب کے کلام میں آمد کی کیفیت رہتی ہے۔ سعید خدائے سخن میر سے بہت متاثر ہیں۔۔۔ ابتدا ہی سے سعید شہیدی ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے ہیں۔ ان کے خیال میں شعر مترنم ہونا ضروری ہے۔۔۔ سعید شہیدی کی غزل کا لب و لہجہ درد و غم اور سوز میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں اور سہل ممتنع میں سعید کا بہترین کلام، سونے پر سہاگہ ان کا ترنم یہ دونوں نے سعید کو صنف اول کے شعرا میں لا کھڑا کیا ہے۔" (۳۸)

پروفیسر مسعود حسین خاں نے بھی حیدرآباد ایوننگ کالج کے زیرِ اہتمام مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع ہونے والے اپنے ترجمان کے گوشہ "نذیر سعید" میں سعید شہیدی کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے مقالہ "

شہیدِ غزل" میں لکھا کہ:

"سعید صحیح معنوں میں شہیدِ غزل ہیں۔ دکن میں ان سے غزل کی آبرو باقی ہے شعر کا رخ خارجی بھی ہوسکتا ہے اور داخلی بھی۔ خارج سے الجھنے والوں کی تعداد فی زمانہ کم نہیں۔ کیا ہرج ہے اگر چند دیوانے ایسے بھی رہیں جو "ہم" کے سنگ گراں کو کاٹتے رہیں اور نقاد انھیں سنگسار کرتے رہیں۔" (۳۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سعید شہیدی کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں اپنی اور پروفیسر مسعود حسین خاں کی آراء پیش کرنے کے بعد اس خاکے میں "سعید شہیدی" کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر کا کلام خود اسس کا تعارف ہوتا ہے سعید شہید کے منتخبہ اشعار اس طرح ہیں:

آنکھیں کھل جائیں گی زمانہ کی　　میری آنکھیں تو بند ہونے دو
نشیمن پر نشیمن اس طرح تعمیر کرتا جا　　کہ گرتے گرتے بجلی آپ خود بیزار ہو جائے
اوروں کو مے کدے سے بہت کچھ نصیب ہوا　　قسمت کی بات ہے کہ مجھے تشنگی ملی
مے کدے میں جو پہنچے سعید　　مے کشی محترم ہو گئی
دیکھنے کی ان کو فرصت ہی نہیں　　جن کی خاطر آئینہ خانے بنے
کیا خبر بھول کے آجائے کسی وقت کوئی　　اپنی محفل کو سلیقے سے سجائے رکھنا

وقت بھی ہے میں بھی ہوں فیصلہ یہ کرلیجیے
کس کے ساتھ چلنا تھا کس کے ساتھ چلتے ہیں

سعید شہیدی کے اس انتخاب سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ بتایا کہ سعید شہیدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اردو غزل اپنی داخلیت اور رمزیت کے سبب مقبول رہی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ سعید شہیدی کے تین مجموعے کلام (۱) برق و آشیاں، (۲) شفق، (۳) آفتاب غزل شائع ہوئے اس کے

علاوہ ان کے مذہبی کلام کے دو مجموعے (ا) عرفان وفا، (منقبتیں) اور "آفتاب غزل" پر اردو اکیڈیمی اتر پردیش نے انھیں ایوارڈ دیا۔ سعید شہیدی دو مرتبہ ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۲ء میں پاکستان گئے جہاں ان کی خوب قدر دانی ہوئی۔ ہندستان کے تمام بڑے شہروں میں سعید شہیدی کلام سنا چکے ہیں۔ حیدر آباد کے ہر بڑے مشاعرے اور ادبی محفل میں سعید شہیدی شرکت کرتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سعید شہیدی پر جو خاکہ لکھا ہے۔ وہ معلومات کی فراہمی کے اعتبار سے ایک جامع خاکہ ہے۔ اس میں سعید شہیدی کے حالاتِ زندگی پیش کیے گئے۔ ان کے شاعری کے سفر کی تفصیلات دی گئیں اور ان کے کلام کے منتخب نمونے بھی دیے گئے۔ اس کے علاوہ سعید شہیدی کی شاعری پر مشاہرین کی آراء بھی پیش کی گئی۔ اس طرح اس خاکہ کے مطالعہ سے قاری سعید شہیدی کی شخصیت اور ان کی شاعری کے اہم نکات سے بہ خوبی واقف ہوسکتا ہے۔ چناں چہ کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی خاکہ نگاری کے مجموعے "خوش نفساں" میں ہاشم علی اختر کے خاکہ کے بعد سعید شہیدی پر دوسرا مکمل اور جامع خاکہ پیش کیا ہے۔

کتاب "خوش نفساں" میں شامل آٹھواں خاکہ "حیدر آباد کی ایک صاحبِ طرز ادیبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ" ہیں۔ اب تک پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حیدر آباد کی مشہور شخصیات میں مرد حضرات کا تعارف کروایا تھا۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ پر خاکہ لکھتے ہوئے انھوں نے حیدر آباد کی مایہ ناز شخصیتوں میں خواتین کی نمائندگی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ سید حسین بلگرامی (عماد الملک) کی نواسی اور طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی کی دختر ہیں۔ حیدر آباد میں مختلف سماجی اداروں اور خواتین کی انجمنوں سے وابستگی کے علاوہ انھیں شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا شوق رہا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سکینہ بیگم کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محترمہ سکینہ بیگم ۱۰/ نومبر ۱۹۱۲ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں سنیئر کیمبرج کا امتحان کامیاب کیا۔ بیماری کے سبب ایف۔ اے کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ۱۹/ مئی ۱۹۲۹ء کو سید احمد صاحب صدر محاسب کے صاحب زادے سید رحمت علی سے ان کی

شادی ہوئی۔ سکینہ بیگم کو تین صاحب زادیاں اور دو صاحب زادے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سکینہ بیگم کی ادبی و سماجی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"سکینہ بیگم صاحبہ کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا۔ سماجی خدمات سے دل چسپی ان کے خاندان کی روایت رہی ہے۔ سکینہ بیگم صاحبہ بھی مختلف سماجی اور تہذیبی اداروں سے وابستہ رہیں۔ تربیت اطفال اور گرل گائیڈ میں سکینہ بیگم صاحبہ نے نمایاں حصہ لیا۔ وہ ایک عرصہ تک گرل گائیڈ کی کمشنر رہ چکی ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو نے جب ایک "شعبہ نسواں" قائم کیا تو سکینہ بیگم کو اس شعبہ کا معتمد بنایا... شعبہ نسواں کی معتمدی کے علاوہ ادارے کے ترجمان ماہ نامہ "سب رس" کی مجلسِ انتظامی کی رکن اور مطبوعات کے شعبہ کی مشیر بھی رہیں... ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی فرمائش پر آپ نے ایک کتاب "نذر دکن" مرتب کی جس میں خواتین دکن کے مضامین تھے۔ اس کے علاوہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اپنی والدہ طیبہ بیگم بلگرامی کے مضامین اور تقاریر کو یک جا کر کے "رسائل طیبہ" کے نام سے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا... خود ان کے مضامین کا مجموعہ ان کی صاحب زادی طیبہ بیگم نے "جوہی کی ڈالی" کے نام سے مرتب کر کے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ سکینہ بیگم صاحبہ شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں... مضمون نگاری کا سلسلہ اب بھی جاری ہے روزنامہ "سیاست" کے ادبی ایڈیشن میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے ہیں۔ سکینہ بیگم صاحبہ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ تاریخ اور تمدن کے موضوعات سے خاص دل چسپی رکھتی ہیں۔" (۴۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سکینہ بیگم کے کلام کا نمونہ خاکہ میں شامل کیا ہے جو انھوں نے اپنے نانا عماد الملک کی مدح میں لکھے تھے۔ چند اشعار اس طرح ہیں:

عالم ہو تم شفیق ہو تم نکتہ داں ہو تم — فاضل ہو تم ادیب ہو تم خوش بیاں ہو تم

فخر دکن ہو باعث فخر جہاں ہو تم — عادل ہو تم لطیف ہو تم مہرباں ہو تم

استاد شاہ ملک دکن ہو فہیم ہو   عاقل ہو تم فقیہ و ادیب وزماں ہو تم
تم سا ہوا نہ کوئی نہ ہوگا جہاں میں   قابل ہو تم عزیز ہو تم قدرداں ہو تم (۴۱)

اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سکینہ بیگم کی شخصیت کے مختلف پہلو پیش کیے ہیں۔ سکینہ بیگم پر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ مختصر اور تعارفی نوعیت کا ہے۔ اس میں عام بیانیہ انداز استعمال کیا گیا ہے اور شخصیت کی زندگی سے کوئی اہم واقعہ یا شخصیت کے کارناموں کا کوئی تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ سکینہ بیگم کی شاعری کا مختصر نمونہ ملتا ہے۔ اس کے باوجود سکینہ بیگم سے متعلق یہ خاکہ حیدرآباد کی علمی و ادبی و سماجی سرگرمیوں میں خواتین کی خدمات کو پیش کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

"خوش نفساں" خاکوں کے مجموعہ کا نواں خاکہ "محسن ماموں (ڈاکٹر سید مہدی علی) ہے۔ ڈاکٹر سید مہدی علی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے رشتہ میں چچازاد ماموں تھے۔ لہٰذا انھوں نے محسن ماموں کے نام سے یہ خاکہ لکھا۔ ڈاکٹر سید مہدی علی عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار و صدر شعبہ طبعیات تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ محسن ماموں ڈاکٹر سید مہدی علی کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا تعلق سادات موسوی کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ان کے والد کا نام سید نوازش علی تھا۔ ڈاکٹر سید مہدی علی ۲۳/ جون ۱۸۹۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ سے میٹرک اور نظام کالج سے سائنس سے انٹر کیا۔ بی۔ اے بھی اسی کالج سے اعلیٰ نشانات سے کیا۔ کچھ عرصہ مدرسہ عالیہ میں ریاضی کے استاد رہے ۱۹۳۱ء میں گوٹنگن یونیورسٹی سے COSMICRATS پر پی ایچ۔ ڈی کیا۔ جرمنی سے واپسی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور ترقی پاکر رجسٹرار بنے۔ ڈاکٹر سید مہدی علی کی شادی ہاشم نواز جنگ کی دختر مہدی بیگم سے ہوئی۔ ان کی تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے ہیں۔ بڑے صاحب زادے سید احمد مہدی ایڈوکیٹ کی اہلیہ اردو کی نامور محقق و نقاد ڈاکٹر سیدہ جعفر ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈاکٹر سید مہدی علی کے دوستوں اور شاگردوں کی فہرست دے کر ان کے وسیع تر تعارف کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سید مہدی علی کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"وہ ایک با اصول شخصیت کے حامل تھے۔ اپنے فیصلے پر ہمیشہ اٹل رہتے تھے۔ ٹینس

کے بہترین کھلاڑی تھے ، صداقت پر ہمیشہ قائم رہتے تھے ، غصہ بھی آجاتا تو صداقت قائم رہتی ۔ کئی زبانوں کے ماہر تھے ۔ امیروں سے مرعوب ہونے کے بجائے وہ غریبوں کی عزت کرتے تھے ۔ اکثر موقعوں پر میں نے دیکھا کہ ان کو کسی دو تقریبوں میں جانا ہوتا تو دیکھتے کہ غریب کون ہے اس کی دعوت کو ترجیح دیتے تھے ، کہتے تھے امیر کے پاس تو ہر کوئی جاتا تھا اگر غریب کے پاس جاؤں تو اس کو زیادہ خوشی ہوگی ۔" (۴۲)

ڈاکٹر سید مہدی علی کا انتقال ۶ / مارچ ۱۹۷۳ء کو ہوا ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس طرح اپنے رشتے کے ماموں ڈاکٹر سید مہدی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے حیدرآباد کی ایک اور مشہور شخصیت کا تعارف پیش کیا ہے ۔ اس خاکہ میں سید مہدی علی کے سرسری طور پر حالاتِ زندگی پیش کیے گئے ہیں لیکن ان کی شخصیت سے متعلق خاکہ نگار کے خاکے سے سید مہدی علی کی شخصیت کی مثبت پہلو سامنے آتے ہیں اور قاری کے ذہن میں اس خاکہ کے مطالعے سے ایک باکردار شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے اور اس کام میں خاکہ نگار کامیاب ہوتے ہیں ۔

"خوش نفساں" خاکوں کے مجموعے کا دسواں خاکہ "میر جعفر علی ناگرجنا ساگر پراجکٹ سے وابستہ ایک نام " ہے ۔ یہ ناگرجنا ساگر کے بانی چیف انجینئر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ۔ میر جعفر علی کا خاکہ لکھنے کی وجوہات و اہمیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں :

> "موجودہ نسل بزرگوں کے کارناموں سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو واقف کروایا جائے کہ حیدرآباد کی ممتاز شخصیتوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان ممتاز شخصیتوں میں میر جعفر علی صاحب کی شخصیت ہم اہلِ حیدرآباد کے لیے مینارہ ، نور کی حیثیت رکھتی ہے ۔" (۴۳)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ میر جعفر علی صاحب کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵/ جولائی ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ، والد جناب میر کاظم علی مددگار محاسب تھے ۔ میر جعفر علی نے مفید الانام

ہائی اسکول سے انگلش میڈیم سے مڈل کلاس کامیاب کیا ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ سٹی اسکول سے میٹرک اور ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر درجہ اول میں کامیاب کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مدراس انجینئرنگ کالج سے بی۔ ای سیول کیا۔ پی ڈبلیو ڈی محکمہ آندھرا پردیش میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں مانیر پراجکٹ کے انچارج اگزیکٹیو انجینئر بنائے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ناگرجنا ساگر پراجکٹ کے چیف انجینئر بنائے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں وظیفہ پر علاحدہ ہوئے۔ جعفر علی صاحب کی شادی ۱۹۳۱ء میں چچا زاد بہن وقار النساء سے ہوئی۔ اولاد میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ میر جعفر علی کی خدمات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہندستان کے بڑے بڑے پراجکٹس کے ریویو اور سفارشات کا کام آپ ہی کو تفویض کیا گیا۔ جب کرشنا اور گوداوری پانی کی تقسیم کا ٹریبونل قائم ہوا تب آپ ہی کو "ایڈوائزر" کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس ٹریبونل کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مہاراشٹرا، کرناٹک، آندھرا پردیش، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کو کتنا پانی ملنا چاہیے۔ آندھرا پردیش کی جانب سے میر جعفر علی صاحب نے اس عظیم خدمت کو خوش گوار طریقہ سے انجام دیا۔۔۔ میر جعفر علی صاحب نے علی نواز جنگ مرحوم کے مشورہ سے گوداوری پراجکٹ، کڈم پراجکٹ، تنگبھدرا پراجکٹ، پورنا پراجکٹ، راجل بنڈہ پراجکٹ، سری سیلم پراجکٹ، ناگرجنا ساگر پراجکٹ، مانیر پراجکٹ کی تحقیقاتی رپورٹیں تیار کیں۔ ناگرجنا ساگر پراجکٹ آپ کا عظیم کارنامہ ہے۔" (۴۴)

اس طرح میر جعفر علی کی شخصیت پر خاکہ لکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے گزشتہ حیدرآباد کی ایک اہم شخصیت کو روشناس و متعارف کروایا ہے۔ میر جعفر علی کے روپ میں ہمیں وہ تمام سرکردہ مسلم شخصیتیں یاد آجاتی ہیں جنھوں نے اپنے ملک و قوم کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں اور ملک کی ترقی میں مسلمانوں کے کردار پر سوال اٹھانے والوں کے لیے میر جعفر علی جیسی شخصیتیں کھلا جواب ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس طرح میر جعفر علی کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ قومی یک جہتی ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کے حصے کے طور پر یاد رکھا جاسکتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے مجموعے "خوش نفساں" میں شامل گیارھواں خاکہ "منجھلے ماموں حضرت برق موسوی مرحوم" ہے۔ برق موسوی حیدرآباد کے ایک نامور شاعر تھے اور یہ خاکہ نگار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے رشتے میں منجھلے ماموں تھے۔ ان کے والد حکیم میر نادر علی رعد ریاست حیدرآباد دکن میں طبیب اور ایک صاحبِ دیوان شاعر تھے اور انھیں نظم طباطبائی سے تلمذ حاصل تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ برق موسوی کے حالاتِ زندگی اور شاعری کے سفر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ برق موسوی کا نام میر کاظم علی تھا۔ یہ ۱۷/ شوال ۱۳۲۴ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس موقع پر انھوں نے پہلا شعر اس طرح کہا ہے:

ہوا ظاہر یہ مجھ پر والدہ کی موت سے کاظم
کہ دنیا میں فقط بے لوث ایک ماں کی محبت ہے

نام کی رعایت سے کاظم تخلص کرتے تھے۔ بعد میں برق موسوی تخلص اختیار کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں اچھے شاعر بن گئے تھے گھر والوں کی خواہش پر نظامیہ طبیہ کالج میں داخل کرائے گئے مگر وہ حکمت کی تعلیم مکمل نہیں کرسکے۔ ملازمت کی ابتدا میں خالہ زاد بہن فاطمہ بیگم ثریا سے ان کی شادی ہوئی۔ ان کی اولاد میں دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔

برق موسوی کی اردو اور فارسی شاعری کی نو کتابیں یہ ہیں۔ (۱) عقل و جنوں، (۲) کنول بہاریہ، (۳) للکار، (۴) گلبانگ، (۵) فرداب و فرتاب، (۶) نغمہ و الہام (فارسی)، (۷) ارزندہ و زندہ (فارسی)، (۸) دین یار جنگ، (۹) یادگارِ ولا۔ ان نو کتابوں کے علاوہ چار کتابوں کے مسودے ان کے سرمایہ شاعری میں ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ مجموعے (۱) شاہکار و ابتکار (اردو)، (۲) نغز و مغز (فارسی)، (۳) نوائے نو تاش (اردو) اور (۴) لوح و قلم (فارسی خطوط) شامل ہیں۔ مشہور شاعر جوش ملیح آبادی نے ان کی رومانی نظموں کے مجموعے کنول بہاریہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ:

"آپ کا کلام پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی قدرت نے آپ کی ہستی کو حرکت و حرارت

عطا فرمائی ہے اور آپ کے سینے میں ایک ایسی چنگاری رکھی ہے جو ایک نہ ایک دن شعلہ بن کر رونما ہوگی۔ اپنی قدر کیجیے اور جس قدر بھی بن پڑے شاعرانہ ماحول میں زندگی بسر کیجیے۔" (۴۵)

برق موسوی کی شاعری پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"حضرتِ برق فطری شاعر تھے۔ وہ کسی کے شاگرد نہیں رہے اور نہ ان کی شاعری اکتسابی تھی۔ نظم نگاری کے بارے میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ وہ جوش اسکول سے کافی متاثر رہے۔ حضرت برق موسوی فارسی زبان پر نہ صرف قدرت کاملہ رکھتے تھے بلکہ اس زبان سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ فن عروض میں حضرت برق کو بڑی مہارت تھی۔ عالم یہ تھا کہ بحور و اوزان کی باریکیوں سے وہ اس قدر واقف تھے کہ شعر پڑھتے ہی اس کی اسقام کو گرفت میں لے لیتے تھے۔" (۴۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے ان خیالات سے برق موسوی کی شاعرانہ عظمت بیان کی ہے۔ اس خاکہ میں برق موسوی کے کلام کی چند ایک جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے امدادی وظیفہ ملنے کی خوش خبری پر انھوں نے یہ شعر کہا تھا:

یہ وقت تھا فصل کاٹنے کا   اور میں ابھی بیج بو رہا ہوں

برق موسوی نے خود اپنی حیات کی ناپائیداری کے بارے میں یہ اشعار کہے تھے:

آہ برق موسوی کیا زندگی کا اعتبار   ہے میری تصویر کا کاغذ ہی مجھ سے پائیدار
جب کے میں دارِ فنا سے مسکراتا جاؤں گا   اور روئیں گے جدائی پر میری سب اقربا

چناں چہ وظیفہ پر سبک دوشی کے ۱۰ ماہ بعد ۸ / جنوری ۱۹۰۹ء کو برق موسوی کا انتقال ہوگیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس خاکہ میں لکھا کہ وہ "جشنِ برق" منا کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔ لیکن دوست و احباب کو زحمت دیے بغیر وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس موقع پر شاعروں اور ادیبوں کو یاد کرنے کی اہمیت بتاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ:

"چوں کہ ہم لوگ روایتاً مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے زندگی میں تو کسی کی قدر کرنا سیکھے ہی نہیں اگر حضرت برق موسوی مرحوم کو بھی ان کی زندگی میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ہمیں کم از کم اپنی قائم کردہ روایت کا پاس و لحاظ کرنا چاہیے اور حضرت برق موسوی کی تخلیقات کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے"۔ (۴۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے شعرا و ادیبوں کے بارے میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور مشاہیر کے کارناموں کو وقتاً فوقتاً نئی نسل تک پہنچانے چاہیے۔ اس طرح برق موسوی کے خاکے کہ ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حیدرآباد کے ایک اہم شاعر کے حالات قارئین تک پہنچانے میں سعید شہیدی کے خاکے کی طرح برق موسوی کا خاکہ بھی معلومات کی فراہمی کی حد تک ایک مکمل خاکہ ہے اور قاری شاعر کے حالات اور اس کے کلام کے نمونے کو پڑھ کر شاعر کی شخصیت سے بہ خوبی واقف ہوسکتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" میں شامل بارہواں اور آخری خاکہ "پروفیسر نور احمد شیخ (کناڈا میں مقیم شاعر اور سائنس داں) ہے۔ نور احمد شیخ صاحب ان بے شمار ہندستانیوں میں ایک ہیں جو وطن سے دور خدمت کرتے ہوئے وطن کا نام روشن کیے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو متضاد موضوعات سائنس اور شاعری میں اپنا نام کمائے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نور احمد شیخ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نور احمد شیخ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ضلع پربھنی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباد و اجداد یوپی کے تھے۔ والد شیخ علی احمد ایک دین دار عالم تھے۔ سرکاری واعظ کی حیثیت سے ان کا تقرر حیدرآباد میں ہوا تو شیخ صاحب بھی یہیں آگئے۔ دھرم ونت ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں خاندان والوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کرگئے۔ ۱۹۴۹ء میں اسلامیہ ہائی اسکول لاہور سے میٹرک کیا اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی ایس سی کیا۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم۔ اے کیا۔ انھیں نوبل انعام یافتہ سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ نور احمد شیخ ۱۹۶۱ء میں پی ایچ۔ ڈی کی غرض سے انگلستان چلے گئے

اور لندن یونیورسٹی میں "مصنوعی سیاروں کے مدار پر زمین اور چاند کی کشش ثقل کا اثر" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا جس پر ۱۹۶۲ء میں لندن یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۷۰ء میں وہ کناڈا منتقل ہوئے۔ بعد میں وہ ملازمت کے سلسلے میں واشنگٹن، نائجیریا، سعودی عرب، لبیا وغیرہ میں رہے علمی مصروفیات کے باوجود انھیں شعر و شاعری کا شوق رہا۔ قیام انگلستان کے دوران انھوں نے شاعری شروع کی۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے "رنگ شفق" اور "نوشتہ دیوار" میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے کلام کے چند نمونے اس خاکے میں پیش کیے ہیں:

ڈوب کر تو ہم نے مانا مر گئے
سطح دریا کو تو اونچا کر گئے

میری غربت کو جب راس آگئی وحشت بیاباں کی
تب ہی اہلِ چمن کو بھی خیال تشنہ کام آیا

دیدار ذوالجلال پر آمادہ ہو گیا
کیا حوصلہ نگاہِ دل ناتواں کا تھا

گھنٹیاں بجتی رہیں کانوں میں تیری یاد کی
دور تک نظروں کے آگے ڈوبتا ساحل رہا

میں آئینوں سے الجھتا رہا یوں ہی ہر بار
حجاب ذات میرا تھا جو درمیاں آیا (۴۸)

پروفیسر نور احمد شیخ کی شاعری کا انتخاب پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ وہ سائنس و تحقیق کے علاوہ شعر و شاعری میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔ حیدر آباد سے ان کی وابستگی کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ:

"حیدر آباد سے پروفیسر نور احمد شیخ کو دلی وابستگی ہے۔ وہ ۲۵ / دسمبر ۱۹۳۲ء کو اسی

ریاست میں پیدا ہوئے۔۔۔ہم حیدر آبادیوں کے لیے پروفیسر نور احمد شیخ جیسے ممتاز سائنس داں کی شخصیت باعثِ افتخار ہے۔ وہ دیارِ غیر میں رہتے ہوئے بھی حیدر آباد قدروں کو فراموش نہیں کر سکے اس وقت کینیڈا میں وہ حیدر آباد کی تہذیبی سفارت کے فرائض بہ خوبی انجام دے رہے ہیں۔" (۴۹)

اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حیدر آباد کی نمائندگی کرنے والی ایک اور اہم اور گم نام شخص کو روشناس کروایا ہے۔ پروفیسر نور احمد شیخ کے خاکے کے ساتھ ہی، ۱۲ صفحات پر مشتمل پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے مجموعے "خوش نفساں" کا اختتام عمل میں آتا ہے۔

اس کتاب میں شامل بارہ خاکوں کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حیدر آباد کے مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے۔ یہ خاکے چوں کہ اخباری ضروریات کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس لیے ان مضامین کا اسلوب سادہ اور صحافتی انداز کا ہے۔ خاکوں میں معلومات کی فراہمی کو اہمیت دی گئی ہے اور تحریر میں ادبی چاشنی کم پائی جاتی ہے۔ تمام خاکوں کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ایک مخصوص چوکھٹے میں یہ خاکے لکھے ہیں۔ مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ان خاکوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شخصیت کے تعارف کے بعد اس کے آباد واجداد اور اس کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کا ذکر ملتا ہے۔ تعلیمی حالات میں شخصیت کے دوران تعلیم دوستوں و رفیقوں کے ناموں سے واقفیت ہوتی ہے۔ شخصیت کو پڑھانے والے اساتذہ کے ناموں سے واقفیت ہوتی ہے۔ شخصیت کی ملازمت کے احوال اس کی شادی اور اس کی اولاد کے بارے میں معلومات ملتی ہیں اسی طرح شخصیت کے کارنامے اور اسے ملنے والے اعزازات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح تمام خاکے لکھے گئے۔ بعض خاکوں میں شخصیت کے تذکرے کے ساتھ اس دور کی اہم باتیں مل جاتی ہیں اور شخصیت کے پیشہ سے وابستہ اہم معلومات مل جاتی ہیں۔ ہاشم علی اختر کے خاکے میں آئی۔اے۔ایس کے بارے میں معلومات ڈاکٹر موہن لال نگم کے خاکے میں میوزموں سے متعلق معلومات میر جعفر علی کے خاکے میں ناگر جنا ساگر اور دیگر پراجکٹوں کے بارے میں معلومات اور محمد عزیز مرزا کے

خاکے میں طغیانی موسیٰ کے بارے میں دل چسپ معلومات قارئین کو مل جاتی ہیں۔ "خوش نفساں" میں شامل یہ خاکے تحقیق کرنے والوں کے لیے یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوں گے کیوں کہ ان سے شخصیتوں کے بارے میں جامع معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ کام اس لیے بھی اہمیت حاصل کر جاتا ہے کہ اردو ادب کے استاد رہنے کے باوجود انھوں نے مختلف موضوعات اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے بارے میں سیر حاصل خاکے لکھے۔ ان خاکوں کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ یہ خاکے ان شخصیتوں کی زندگی میں ہی لکھے گئے۔ اردو میں عموماً کسی فرد کے دنیا سے گزر جانے کے بعد اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اور اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کوئی مضمون لکھ دیا جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخصیت مرنے کے بعد ہی قابلِ قدر ہو جاتی ہے۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے شخصیتوں کے احوال ان کی زندگی میں ہی لکھ کر انھیں حقیقی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

> "اردو میں سوانح عمریاں بہت کم ہیں۔ خاص طور پر ایسے سوانح جو کسی شخص کے حسینِ حیات لکھے گئے ہوں اور جن کا مصنف اس کے شب و روز کے احوال کا راز داں ہو۔۔۔ عام طور پر ترقی یافتہ زبانوں میں قاموس الرجال یا سوانحی فرہنگیں مرتب کی جاتی ہیں۔ اردو میں ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ ادیبوں شاعروں کے علاوہ ان اشخاص کے بارے میں بہت کم کچھ لکھا جاتا ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں اہم کارنامے انجام دیتے ہیں۔ مختصر سوانحی مضامین کے ذریعہ اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا جاسکتا ہے۔۔۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جن مشاہیر کے تعارف نامے لکھے ہیں ان کا ریاست کی تہذیبی زندگی پر گہرا اثر رہا ہے۔ ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ تحقیق و تفتیش، شخصی ملاقاتوں اور انٹرویو کے ذریعہ مصدقہ سوانحی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔۔۔ یقین ہے کہ یہ کتاب دل چسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔" (۵۰)

پروفیسر مغنی تبسم کے ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان خاکوں کے ذریعہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کے احوال ان کی زندگی میں ہی جمع کر کے پیش کر دیے ہیں۔ اس کتاب کی خامیاں اور کوتاہیاں اس کی خوبیوں اور اس میں پیش کردہ اہم و قیمتی معلوماتی مواد میں

مفقود ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "خوش نفساں" کی اشاعت کے بعد بھی اپنی خاکہ نگاری کا سفر جاری رکھا۔ ان کے حیدرآبادی شخصیتوں پر لکھے ہوئے خاکے موقر روزناموں اور ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ ان خاکوں کو کتابی شکل دی جا رہی ہے۔ ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ "نفوس گرامی" کے عنوان سے زیرِ طبع ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ نگاری کے عمومی جائزے سے قبل ان کے خاکوں کے زیرِ طبع دوسرے مجموعے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ "نفوس گرامی" خاکوں کے مجموعے میں شامل خاکوں میں جن اہم شخصیتوں کے خاکے شامل ہیں ان میں پروفیسر جعفر نظام، ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر غلام عمر خاں، فصاحت جنگ جلیل، پروفیسر مغنی تبسم وغیرہ نابغہ روزگار شخصیتیں شامل ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام (آندھرا پردیش کے ایک ممتاز ماہرِ تعلیم) کے عنوان سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا خاکہ جون ۱۹۹۴ء کے سب رس حیدرآباد میں شائع ہوا۔ "میری شفیق و محترم استاد (ڈاکٹر زینت ساجدہ) کے عنوان سے خاکہ روزنامہ سیاست کے ادبی ایڈیشن کے علاوہ ادبی جرائد میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ "استادِ محترم پروفیسر غلام عمر خاں صاحب" کے عنوان سے خاکہ نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء کے ماہ نامہ "انشاء کلکتہ" میں شائع ہوا۔ "فصاحت جنگ جلیل" کے عنوان سے خاکہ جنوری ۲۰۰۲ء کے سب رس حیدرآباد میں شائع ہوا اور "تبسم اردو۔ مغنی تبسم" کے عنوان سے خاکہ "نذرِ مغنی تبسم" میں شائع ہوا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے زیرِ طبع دوسرے مجموعے "نفوس گرامی میں مندرجہ بالا خاکوں کے علاوہ دو خاکے سکینہ بیگم اور علی اکبر سے متعلق ترمیم و اضافے کے ساتھ "خوشش نفساں" مجموعے کے علاوہ "نفوس گرامی" میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں "نواب سراج الدین احمد صاحب کی یاد میں" (سب رس اکتوبر، نومبر ۱۹۹۵ء)، حفیظ دہلوی ایک تعارف (ہماری زبان ۱۵/ اگست ۱۹۹۶ء)، عامر موسوی مرحوم (سب رس دسمبر ۱۹۹۵ء) خاکے بھی شامل ہیں۔ "نفوس گرامی" میں شامل خاکوں کی شخصیتوں کے نام پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر شخصیتیں خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے استاد رہ چکی ہیں۔ یا ان کا تعلق اردو شعر و ادب سے رہا ہے۔ "خوش نفساں" کے برخلاف "نفوس گرامی" میں اردو ادب سے وابستہ شخصیتوں کے سوانحی خاکوں پر توجہ دی گئی ہے۔

"نفوسِ گرامی" کا پہلا خاکہ "پروفیسر جعفر نظام (آندھرا پردیش کے ایک ممتاز ماہرِ تعلیم) ہے۔
پروفیسر جعفر نظام کاکتیہ یونیورسٹی ورنگل کے سابق وائس چانسلر اور ادارہ ادبیاتِ اردو کے سابق صدر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام مادر جامعہ، عثمانیہ کے ان ممتاز سپوتوں میں گنے جاتے ہیں جس پر ارضِ دکن بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ پروفیسر جعفر نظام کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے آباد و اجداد آصف جاہ اول کے ساتھ ترک وطن کر کے حیدر آباد آئے تھے۔ ان کے دادا یوسف الدین مرحوم کورٹلہ کریم نگر کے ممتاز زمین داروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے والد نظام الدین جامعہ، عثمانیہ کے پہلے بیاچ کے گریجویٹ تھے۔ پروفیسر جعفر نظام پانچ بھائیوں اور دو بہنوں میں بڑے تھے۔ ان کی پیدائش ۲/ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ہوئی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی چوتھی جماعت کے بعد چادر گھاٹ ہائی اسکول میں شریک ہوئے ساتویں جماعت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شریک کرائے گئے۔ ۱۹۴۳ء میں وہاں سے میٹرک اعلیٰ نشانات سے اور ۱۹۴۵ء میں انٹرمیڈیٹ سائنس سے کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں بی ایس سی اور ۱۹۴۹ء میں ایم ایس سی (باٹنی) کی ڈگری لی۔ گورنمنٹ کالج گلبرگہ میں باٹنی لکچرر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۵۰ء میں نظام کالج تبادلہ ہوا۔ پی ایچ۔ ڈی کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں لندن یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالے "پودوں پر مختلف شعاعوں کے اثرات" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ واپسی پر کالج آف سائنس میں تقرر ہوا اور ترقی پاتے ہوئے کاکتیہ یونیورسٹی کے دو مرتبہ وائس چانسلر بنے۔ ۳۷ سال طویل خدمات کے بعد ۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو وہ وظیفہ پر سبک دوش ہوئے۔ پروفیسر جعفر نظام کی اعلیٰ تعلیمی قابلیت و انتظامی صلاحیت کی بنا پر وہ کئی اعلیٰ سرکاری وغیرہ سرکاری اداروں سے وابستہ رہے جس کی فہرست پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس خاکے میں دی ہے۔ پروفیسر جعفر نظام کی انتظامی صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"بہ حیثیت وائس چانسلر آپ کے دونوں ادوار نہایت درخشاں رہے۔ پہلی بار جب کاکتیہ یونیورسٹی بہ حیثیت وائس چانسلر تشریف لے گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ بہت سے

طلبہ غیر سماجی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ جن کی وجہ سے یونیورسٹی کا ڈسپلن بگڑ گیا ہے۔ انھوں نے گفت و شنید کے ذریعہ طلباء اور اساتذہ دونوں کا اعتماد حاصل کیا اور نہایت تدبر اور دانش مندی کے ساتھ یونیورسٹی کے حالات کو سدھارنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب رہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کی وائس چانسلری کے دور میں کاکتیہ یونیورسٹی ایک بار بھی بند نہیں ہوئی۔" (۵۱)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر جعفر نظام کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کرنے کے علاوہ اس خاکہ میں جعفر نظام صاحب کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں ان کے ملنے والے اعزازات و ایوارڈس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ پروفیسر جعفر نظام کے دو شاگردوں پروفیسر جوگیندر کور بھلا اور ڈاکٹر فاروق سے انٹرویو لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر جعفر نظام کی عظمت بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مرحلوں میں پروفیسر جعفر نظام کو زیور علم سے آراستہ کرنے والے لائق اساتذہ کے نام بھی اس خاکے میں ملتے ہیں۔ ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے پروفیسر جعفر نظام صاحب کی خدمات کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"نومبر ۱۹۹۳ء میں پروفیسر جعفر نظام کا بہ حیثیت کارگزار صدر اور سید ہاشم علی اختر صاحب کے امریکہ جانے کے بعد ادارے کے مستقل صدر کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔ اردو سے والہانہ محبت کی وجہ سے انھوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور اس ادارے کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے اور نشوونما دینے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ ادارہ ادبیاتِ اردو میں جب کوئی ادبی جلسہ منعقد ہوتا ہے پروفیسر جعفر نظام اس میں ضرورت شرکت فرماتے ہیں۔" (۵۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر جعفر نظام کی ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے خدمات بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ پروفیسر جعفر نظام کا علمی میدان تو الگ تھا لیکن تعلیم کے میدان میں اپنے تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے وقت پڑنے پر ادارہ ادبیاتِ اردو کی سرپرستی بھی کی اس طرح پروفیسر جعفر نظام کی شخصیت پر

خاکہ لکھ کر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ارضِ دکن کے ایک اور نامور سپوت کے حالاتِ زندگی نئی نسل کی رہ نمائی کے لیے پیش کیے ہیں اور اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں نے جو شان دار روایات ماضی میں چھوڑی تھیں انھیں پھر سے رائج کرنے اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ "نفوس گرامی" میں شامل دوسرا خاکہ "میری شفیق و محترم استاد ڈاکٹر زینت ساجدہ" ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ عثمانیہ یونیورسٹی کی قابلِ قدر استاد کے علاوہ بلند پایہ ادیبہ ،معتبر نقاد ،نامور محقق ،مشعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں ان کے رفیق حیات ڈاکٹر حسینی شاہد مرحوم بھی قابلِ احترام اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں زینت ساجدہ جس وقت جامعہ ، عثمانیہ کی استاد تھیں اس وقت صدر شعبہ ،اردو پروفیسر مسعود حسین خان تھے اور اساتذہ میں ڈاکٹر حفیظ قتیل مرحوم ، پروفیسر غلام عمر خاں ، پروفیسر رفیعہ سلطانہ ، پروفیسر سیدہ جعفر ، پروفیسر مغنی تبسم ،ڈاکٹر حمید شطاری مرحوم اور جناب محمد اکبر الدین صدیقی جیسے لائق اساتذہ شامل تھے۔ ایم۔ اے کے دوران خاکہ نگار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ خود ڈاکٹر زینت ساجدہ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ چناں چہ اپنے استاد کے بارے میں تعارفی و سوانحی خاکہ لکھ کر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنا حق شاگردی ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ کا تعارف کراتے ہوئے توصیفی انداز میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "موجودہ دور چمک دمک ، ظاہری شان و پروپگنڈہ خود نمائی و خودستائی کا دور ہے۔ جو لوگ دورِ حاضر کے ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتے اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہونے کے باوجود خواص کی نظروں سے او جھل رہتے ہیں تو گم نامی کے اندھیروں میں روپوش ہو جاتے ہیں اگر چہ کہ انھوں نے اپنے فن اور قابلیت کا لوہا اپنے دور میں منوایا تھا۔ ایسی ہی کم یاب اور نایاب ہستیوں میں میری شفیق و محترم استاد ڈاکٹر زینت ساجدہ بھی ہیں۔ جو تقریباً گوشہ نشینی میں اپنے نشیمن "کوہسار" میں علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔" (۵۳)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ مشائخ

کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ان کی پیدائش ۲۸ / مئی ۱۹۲۴ء کو رائچور کرناٹک میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مدرسہ تعلیم المعلمات کاچی گوڑہ میں ثانوی درجوں تک تعلیم حاصل کی۔ زمانے کے رواج کے مطابق وہ شکرام گاڑی میں مدرسہ جایا کرتی تھیں جس پر چلمن پڑی ہوتی تھی۔ گولڈن تھر شولڈ میں قائم ویمنس کالج سے گریجویشن کیا اور آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور ویمنس کالج میں بہ طور لیکچرر تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ وہ ایک اچھی افسانہ نگار بھی تھیں۔ ان کی تخلیقات نشر گاہ حیدرآباد سے نشر ہوتی تھیں۔ اردو کے موقر روزناموں اور جریدوں میں ان کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے گفتگو کرتے ہوئے افسانہ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ :

"کہانی سننا اور کہانی کہنا انسانی فطرت میں داخل ہے اس لیے فکشن سے ان کی وابستگی فطری امر ہے۔" (۵۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تخلیقات افکار (بھوپال)، سب رس (حیدرآباد، پاکستان)، ادبی دنیا (لاہور) اور حیدرآباد کے قدیم رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ کئی اداروں سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۸۰ء میں حکومت آندھراپردیش نے انھیں بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ دیا تھا۔ یہ ایوارڈ ان کے شوہر حسینی شاہد کو بھی ملا تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے طرزِ تدریس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بہ حیثیت استاد وہ اپنے پیشے میں مثالی رہی ہیں۔ جب میں ان کا شاگرد تھا ۲۲ سال قبل ڈاکٹر زینت ساجدہ کی پہلی کلاس تعارفی تھی۔ اس وقت ۳۰ طلباء و طالبات کی تعداد ہماری کلاس میں تھی جن میں ۲۶ لڑکیاں اور صرف ۴ لڑکے تھے تعارفی کلاس میں زینت آپا نے خود اپنے بارے میں چند تعارفی جملے کہے۔ نصاب کے بارے میں اور وہ کیا پڑھائیں گی۔ اس کی فصاحت کی ہر ایک طالبِ علم سے فرداً فرداً متعارف ہوئیں میں غور سے زینت آپا کی طرف سعادت مندی سے دیکھ رہا تھا آواز کے سحر میں ڈوب کر میں نے آپا کے سراپا کی طرف نظر ڈالی۔ میانہ قد،

تیکھے نقوش، ہونٹوں پر مسکراہٹ، گہری گہری بڑی آنکھیں جن سے فراست ٹپکتی تھی۔ میک اپ سے نا آشنا، سادہ لباس میں زیور علم سے آراستہ اس مشرقی خاتون میں بلا کی قوت ارادی تھی۔ وہ ایم اے سال اول سال دوم کو پڑھاتی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ حق ادا کرتی تھیں۔ لیکچر کیا ہوتا ہے، اس کا پتا تو ہمیں زینت آپا کے لیکچرس سننے کے بعد ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ سننے والے غالب کے اس شعر کی تفسیر بن جاتے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" (۵۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈاکٹر زینت ساجدہ کے مثالی طرزِ تدریس کی تفصیلات بیان کرنے کے علاوہ انھوں نے اپنے زمانہ، طالب علمی، ملازمت اور شادی کے وقت ڈاکٹر زینت ساجدہ کے ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کا ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ ایک شفیق استاد رہیں، خاکہ کے آخر میں ضعیف العمری کے باوجود ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تحقیق و تدریس میں جستجو کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی درازی، عمر کی دعا کی ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ پر خاکہ لکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نہ صرف ایک سعادت مندی شاگرد ہونے کا حق ادا کیا بلکہ اس خاکہ کے ذریعہ شعبہ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک مشفق استاد کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس خاکہ کے ذریعہ قاری کو آج سے ۴۰ سال قبل جامعہ، عثمانیہ کے ماحول سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔

"نفوس گرامی" خاکوں کے مجموعے کا تیسرا خاکہ " استادِ محترم " پروفیسر غلام عمر خاں صاحب ہے۔ پروفیسر غلام عمر خاں صاحب ایک ماہرِ اقبالیات اور جامعہ، عثمانیہ کے بزرگ اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو اپنے استاد سے اور استاد کو اپنے شاگرد رشید سے کافی لگاؤ آتا ہے۔ کیوں کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تمام تخلیقات میں پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کی تعارفی تحریری ملتی ہیں۔ اپنے استاد کا تعارف کراتے ہوئے خاکہ کے آغاز میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"پروفیسر غلام عمر خاں صاحب ایک ذہین و فطین عالم اور فلسفی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو افکارِ عالیہ کے مطالعہ اور انسانی زندگی کے بنیادی مسائل پر فکر و انہماک کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ برِ صغیر میں اہلِ علم انھیں " ماہرِ اقبالیات " اور " ماہرِ دکنیات " کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن وہ جس موضوع پر بھی توجہ کرتے ہیں اور جس میدان میں بھی دخل دیتے ہیں وہاں اپنی شخصیت اور جودتِ فکر کے دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ شاید ایسی ہی شخصیتوں کے لیے "نابغہ" کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔" (۵۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ دیگر خاکوں کی طرح اس خاکہ میں بھی شخصیت کے احوالِ زندگی بیان کرتے ہیں۔ چناں چہ پروفیسر غلام خاں کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ غلام عمر صاحب کے آباد و اجداد کا تعلق افغانستان کے یوسف زئی قبیلے سے تھے۔ ان کے والد محمد داؤد خاں صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول دارالشفاء میں مدرس تھے۔ غلام عمر خاں صاحب ۲۱ / اکتوبر ۱۹۲۳ء کو محلہ حسینی علم حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول دارالشفا میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی و سائنس کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ اردو ادب میں دل چسپی بڑھی نیاز فتح پوری اور آسکر وائلڈ اور برنارڈ شاہ کی تحریریں پڑھنے لگے۔ نیٹشے نے انھیں بہت متاثر کیا چناں چہ اردو ادب کی جانب انھوں نے اپنی توجہ مبذول کی۔ ڈگری کے بعد اردو سے ایم۔ اے کے لیے داخلہ لیا۔ ڈاکٹر زور نے ان کے منتخب کردہ موضوع "وجہی ایک شاعر اور ادیب" کو پسند کیا۔ لیکن شعبہ کے ایک اور استاد ڈاکٹر سجاد نے ان کے لیے "اقبال اور مغرب" موضوع کیا جس پر غلام عمر خاں صاحب نے ایم۔ اے کا مقالہ تحریر کیا۔ اس طرح موضوع کی تبدیلی پر ڈاکٹر زور غلام عمر خاں صاحب سے ناراض ہوگئے۔ ایم۔ اے کے بعد غلام عمر خاں صاحب "اقبال کا تصورِ انسانِ کامل" پر پی ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اساتذہ کی سیاست سے دو دو سال تک یونیورسٹی میں داخلے سے محروم رہے۔ وائس چانسلر پروفیسر ولی محمد صاحب کی مداخلت پر بالآخر ان کا داخلہ ہوا۔ والد صاحب کے اصرار پر محکمہ، تعلیمات میں بہ حیثیت ٹیچر ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۰ء میں پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ، اردو عثمانیہ

یونیورسٹی کی صاحب زادی زبیدہ کلثوم صاحبہ سے شادی ہوئی۔ پروفیسر غلام خاں صاحب کی جملہ تین اولادیں ہیں ان میں دو لڑکے ڈاکٹر اور ایک لڑکی ویمنس کالج کوٹھی حیدر آباد میں لکچرر ہے۔ ۱۹۵۴ء میں انھوں نے ایک سال کی رخصت لے کر پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی اور ۱۹۵۸ء میں بہ حیثیت لکچرر اردو کالج ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۶۵ء میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی آئے ۱۹۷۰ء میں صدر شعبہ بننے کے بعد ۱۹۸۳ء کو وہ پروفیسر کے عہدے پر سبک دوش ہوئے۔ بعد میں وہ اوپن یونیورسٹی کے تین سال تک صدر شعبہ رہے اور فاصلاتی طرز تعلیم کے لیے سات آٹھ کتابیں تیار کیں۔ اس کے بعد کوئی دس سال تک وہ ایک اہم تصنیف "Re-Interpretation of Islam based on Quran and Hadith" "قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلام کی از سر نو تفہیم" کی تکمیل میں لگے رہے اور اب یہ کتاب تکمیل کے مراحل میں ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر غلام عمر خاں کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے شعبہ اردو کی صدارت کے دوران بین کلیاتی ادبی مقابلوں کا سلسلہ بڑے پیمانے پر دوبارہ شروع کروایا۔ یونیورسٹی سے ملحقہ کالجوں کے اساتذہ کی ایک ریسرچ ایسوسی ایشن قائم کروائی۔ جس کے تحت ہر ماہ ایک مقررہ موضوع پر مباحث ہوا کرتے تھے۔ تحقیقاتی مجلہ کا اجراء عمل میں لایا۔ انھوں نے شعبہ کے تحت اردو مخطوطہ شناسی کا پوسٹ ڈپلوما کورس کا شروع کیا اور شعبہ میں "دکنی سیل" کے قیام کی جدوجہد کی پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کے اشتراک سے انھوں نے دکنی اردو کی لغت تیار کی اور غواصی کی ایک نایاب مثنوی "میناستونتی" بھی دریافت کی اور اسے جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صاحب نے اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ اقبال سے متعلق تحریر کیا تھا۔ ان کی فکر کو اقبال نے بہت متاثر کیا تھا۔ اقبال کے بارے میں پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کے خیالات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "نیٹشے، شوپنہار وغیرہ کے بعد اقبال مستقل طور پر خاں صاحب کی ذہنی نشو و نما کا ایک اہم جزو بن گیا۔۔۔ فکر اقبال کے توسط سے اسلام کے نظریہ حیات کی عظمت اور وقعت پروفیسر غلام عمر خاں صاحب پر منکشف ہوئی اور پیغمبر اسلام کی حقیقی شخصیت سے اقبال ہی کی بدولت

متعارف ہوئے۔ راقم الحروف نے اپنے ایک انٹرویو میں اس سلسلے میں ان سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا "اقبال کے مطالعہ کے بعد میں نے اسلام کے بنیادی افکار اور پیغمبر اسلام کی حقیقی سیرت و شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا اور مجھے زندگی میں کسی اکتساب پر ناز ہے تو اس بات پر کہ میں نے اسلام کی حقیقی سیرت و شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ گویا پیغمبر اسلام کے ذوق و ذہن کا ایسا ہی رازداں ہوں جیسے ان کی خدمت میں رات دن بسر کرنے والا کوئی خادم۔" (۵۷)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اقبالیات سے متعلق پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کی لکھی ہوئی تین کتابوں "روح اسلام اقبال کی نظر میں، اقبال کا تصور عشق" اور "اقبال کا تصور خودی" کا تفصیلی جائزہ اس خاکے میں لیا ہے اور اقبال کے فلسفے کو سمجھانے میں پروفیسر غلام عمر خاں کی کاوشوں کو سراہا ہے اور خاکے کے آخری میں پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کے فن کے مختلف گوشوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کی تحریروں میں سائنسی قطعیت و اختصار ملتا ہے۔ حکیمانہ بصیرت کے ساتھ ادبی آب و تاب بھی نمایاں ہوتی ہے۔ فلسفیانہ موضوعات پر لکھی ہوئی تحریروں میں بہ یک وقت اعلیٰ افکار اور ادبی کشش کا یہ امتزاج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کا دائرہ علم بہت وسیع ہے۔۔۔ مغرب کے جدید متداول نظریوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔" (۵۸)

پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کے فن کی باریکیوں کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے قابل استاد کے بارے میں یہ خاکہ ماہر اقبالیات، جگناتھ آزاد کے پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کی کتابوں پر کیے گئے۔ اس تبصرہ کے ساتھ ختم کیا ہے۔

"اقبال پر آپ نے اپنی تصانیف مجھے عنایت کی تھیں۔ آپ تو علم کا سمندر ہیں۔ یہ محرومی تھی کہ اس وقت تک یہ کتابیں میرے علم اور مطالعے میں نہیں آئی تھیں۔ آپ نے

میرے علم میں اضافہ کیا جزاک اللہ (۱/۵۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اب تک جتنے خاکے لکھے ان میں سب سے طویل خاکہ پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کے بارے میں ہے۔ ماہ نامہ "انشا" نے ایک ماہر اقبالیات کی خدمات کے اعتراف میں "انشا" کے چند خصوصی صفحات کے عنوان سے ۱۳ صفحات میں یہ خاکہ شائع کیا۔ اس خاکہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کی ان کے افراد خاندان اور دیگر مواقعوں پر لی گئی ان کی تصاویر بھی شائع کرا دیں۔ یہ خاکہ اقبال سے متعلق پروفیسر غلام عمر خاں کے مطالعہ کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کا یہ خاکہ ایک ماہر اقبالیات کے طور پر دیکھا جائے گا۔

"نقوش گرامی" خاکوں کے مجموعے میں شامل پانچواں خاکہ "فصاحت جنگ جلیل" کے عنوان سے ہے۔ دبستانِ جلیل کے نمائندہ شاعر فصاحت جنگ جلیل کا شمار غزل کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ حیدرآباد سے جلیل کے خاص تعلق کی بنا پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی شخصیت پر یہ تعارفی خاکہ لکھا ہے۔ جلیل کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ فصاحت جنگ جلیل کا اصلی نام جلیل حسن اور تخلص جلیل تھا۔ وہ ۱۸۶۲ء میں مانک پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالکریم اور دادا کا نام عبدالرحیم تھا۔ باپ دادا کے نقش قدم پر چل کر یہ بھی حافظ قرآن ہوئے۔ والد کی نگرانی میں ۲۰ سال تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا بعد میں لکھنو کے فرنگی محل کے علماء کی صحبت میں حصہ لیتے تھے۔ وہ خود بھی شعر کہنے لگے تھے۔ امیر مینائی سے کلام کی اصلاح کی درخواست کی۔ خط و کتابت کے ذریعہ امیر مینائی ان کے کلام کی اصلاح کرنے لگے۔ بعد میں وہ امیر مینائی کے پسندیدہ شاگرد بن گئے۔ اپنے استاد کے ہم راہ بھوپال و بنارس کا سفر کیا اور حیدرآباد کے نواب میر محبوب علی خاں آصف کی درخواست پر امیر مینائی اور جلیل حیدرآباد آکر یہیں مقیم ہوگئے۔ اپنے استاد کے انتقال کے بعد جلیل امیر مینائی کے جانشین بنے۔ نوابوں کی موجودگی میں ۱۹۰۰ء میں جلیل نے حیدرآباد میں پہلی مرتبہ مشاعرہ میں کلام سنایا اور اپنی غزل کے مطلع:

اب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے

اے شوخِ چشم پھونک دے برقِ نگاہ سے

سنا کر ہی مشاعرہ لوٹ لیا۔ استاد داغ نے بھی جلیل کے کلام کی تعریف کی تھی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس خاکہ میں جلیل کے عہد میں ہونے والی مختلف شعری محفلوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ جلیل اپنے عہد کے ایک سربرآوردہ شاعر تھے اور نوابوں اور مصاحبین کی مجلسوں میں انھیں قدری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شاہ آصف کے ۱۹۱۱ء میں انتقال کے بعد شاہ عثمان نے ان کی سرپرستی کی شاہ آصف نے انھیں "جلیل القدر" کا لقب دیا تھا اور شاہ عثمان نے اپنی سال گرہ کی تقریب کے موقع پر "نواب فصاحت جنگ" کا خطاب عطا کیا۔ یہ خطاب پانے کے بعد جلیل علیل ہوگئے اور ۶/ جنوری ۱۹۴۶ء کو ان کا انتقال ہوا اور خطہ صالحین نامپلی حیدرآباد میں دفن ہوئے۔ فصاحت جنگ جلیل کی تخلیقات اور ان کے جانشین فرزند علی احمد جلیلی کے کارناموں کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"نعتیہ کلام "معراج سخن" کے علاوہ جلیل کے تین دیوان "تاج سخن"، "جان سخن" اور "روح سخن" ہیں۔ نثری کتابوں میں پہلی کتاب "تذکرہ و تانیث" نایاب و کم یاب تھی۔ جن کو ان کے لائق فرزند ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے شائع کیا۔ "معیار اردو، تذکرہ و تانیث" کی کڑی ہے "اردو کا عروض" تیسری نثری تصنیف بھی جلیل کا کارنامہ ہے چوتھی تصنیف "سوانح امیر مینائی" ہے "مکاتیب جلیل" پچاس سال کی مدت میں لکھے گئے خطوط ہیں۔ اس کی ترتیب اور مقدمہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے لکھا۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے اپنے والد محترم پر تحقیقی مقالہ بہ عنوان "فصاحت جنگ جلیل مانک پوری" زیرِ نگرانی پروفیسر مغنی تبسم صاحب لکھا تھا جس پر ان کو عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی عطا ہوئی۔ یہ مقالہ ۱۹۹۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر خاص و عام میں سند قبولیت حاصل کرچکا ہے۔" (۵۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خاکہ کے آخر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اس مضمون میں جلیل

جیسے استاد فن شاعر کے کلام کا تفصیلی جائزہ ممکن نہیں۔ لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے شاعر کا کلام خود اس کا تعارف ہوتا ہے۔ اس لیے انھوں نے فصاحت جنگ جلیل کے کلام سے چند منتخب اشعار اپنے خاکہ میں پیش کیے ہیں تاکہ فصاحت جنگ جلیل کے رنگ و مزاج سے واقفیت ہو وہ اشعار اس طرح ہیں:

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا ساتھ نہ دے جب تم چلو زمین چلے آسمان چلے

مری نظر نے عجب کار لاجواب کیا کہ تجھ کو لاکھوں حسینوں میں انتخاب کیا

پوچھا جو اس نے جانتے ہو تم جلیل کو بولے کہ ہاں وہ شاعر نازک خیال ہے

چلتے پھرتے جہاں نظر آئے آنکھ سے دل میں وہ اتر آئے

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں" (۹۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فصاحت جنگ جلیل کے کلام سے منتخب اشعار خاکے میں پیش کرتے ہوئے جلیل کے رنگِ تغزل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ جلیل غزل کے شاعر تھے اور اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اس طرح اس خاکہ سے فصاحت جنگ جلیل کا بہ حیثیت شاعر ایک اجمالی تعارف مل جاتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے دیگر خاکوں کے مقابلے میں اس خاکہ میں شخصیت کے احوال زندگی اور اس کی اولادوں کی تفصیلات مکمل طور پر نہیں پیش کیں اور نہ ہی جلیل کے شاگردوں وغیرہ کا تذکرہ کیا۔ فصاحت جنگ جلیل کے افراد خاندان میں ان کے فرزند علی احمد جلیلی کے علاوہ اور بھی افراد شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود جلیل کے منتخب اشعار پیش کرنے میں اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فصاحت جنگ جلیل کو بہ حیثیت

ایک مکمل شاعر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا یہ خاکہ جلیل کے جامع تعارف کے طور پر اہمیت کا حامل ہے۔

"نفوس گرامی" خاکوں کے مجموعے میں شامل ساتواں خاکہ "تبسم اردو ، مغنی تبسم" کے نام سے ہے۔ مغنی تبسم کی شخصیت ہند و پاک کے علاوہ اردو ادب کے عالمی منظر نامے پر کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اپنے استاد پروفیسر مغنی تبسم کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "دنیا میں ایسی ہستیاں کم ملیں گی جو حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کی بھی حامل ہوں۔ جن کے پاس علم کے ساتھ ساتھ شہرت بھی ہو۔ تقریر کی صلاحیت کے ساتھ وہ تحریر پر بھی قدرت رکھتے ہوں۔ خاندانی شرافت کے ساتھ دنیوی دولت و عزت بھی حاصل ہو۔ مذکورہ بالا تمام خصوصیات پروفیسر مغنی تبسم کے پیکر میں جلوہ گر ہیں۔" (۶۱)

اس طرح کا تعارف پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر مغنی تبسم کی ہمہ پہلو شخصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور حقیقت بھی ہے کہ پروفیسر مغنی تبسم برِ صغیر ہند و پاک کے نام ور اسکالر، نقاد، سخن ور کلاسکیت سے جدیدیت تک سفر کرنے والے دانش ور، قلم کار، شاعر و ادیب، عثمانیہ یونیورسٹی و سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے استاد اور ادبی صحافت کے رمز شناس کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ گزشتہ ایک دہے سے وہ جنوب ہند کے اہم ادبی مرکز ادارہ ادبیاتِ اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں وہ حصہ لے کر انھیں رونق بخش رہے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سابقہ خاکوں کے برخلاف اس خاکے میں اپنی ہی قائم کردہ روایت سے انحراف کیا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم کی شخصیت سے متعلق اس خاکہ میں مذکورہ شخصیت کے آباد و اجداد، تاریخ پیدائش، تعلیم، بچپن کے حالات، ملازمت، شادی اور ادبی خصوصیات کا تذکرہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نہیں کیا ہے اور اپنے زمانہ طالبِ علمی میں پروفیسر مغنی تبسم کے ان کے برتاؤ کے ساتھ اس خاکہ کا آغاز کرتے ہوئے موجودہ زمانے میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے زمانہ طالبِ علمی کے دوران مغنی تبسم صاحب سے متعلق یادوں کا تذکرہ

کرتے ہوئے لکھا کہ اردو کالج حمایت نگر میں اس وقت کے اساتذہ میں پروفیسر مغنی تبسم کے علاوہ ڈاکٹر حسینی شاہدت پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، نصیر الدین نظامی، بدیع حسینی، مقبول احمد صدیقی اور پروفیسر سید محمد صاحب پرنسپل درس دیتے تھے۔ مغنی صاحب طلباء کے پسندیدہ استاد تھے۔ جامہ زیب، میانہ قد، وجیہ صورت، گورا رنگ، پیکر اخلاص، بڑی بڑی آنکھیں جو تاریک شیشوں والی عینک میں ڈھکی رہتی تھیں بات بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی غیر ملکی ہمارے مافی الضمیر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے کبھی شیروانی کبھی سوٹ اور کبھی بشرٹ پتلون میں ملبوس ہوتے تھے۔ روزانہ سائیکل رکشہ میں اپنے مکان سلطان پورہ سے کالج تشریف لاتے تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، اردو کالج حمایت نگر آتے پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "مغنی صاحب نے اردو کالج میں تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ و طالبات کو لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا، ان ہی کی کوششوں کی بنا پر اردو کالج کا میگزین پہلی بار شائع ہوا۔ بعد میں انھوں نے "اکبر الہ آبادی" نمبر بھی شائع کیا۔ جو ہند و پاک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ .. مغنی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اور باعثِ فخر سرمایہ، تلامذہ سے ان کا رشتہ ہے۔ اساتذہ تو بہت سے ہیں، لیکن یہ اعزاز و افتخار شاید ہی کسی استاد کو حاصل ہو جو مغنی صاحب کو حاصل ہوا ہے۔ ان کے تلامذہ ان سے بے پناہ انسیت ہی نہیں رکھتے بلکہ بے لوث محبت و عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ مغنی صاحب کو بھی اپنے شاگرد اولاد کی طرح عزیز ہیں ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔" (۶۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر مغنی تبسم کے بارے میں آگے لکھا کہ ایم۔ اے کر لینے اور ملازمت مل جانے اور شادی ہو جانے کے بعد انھوں نے پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے مشورے پر پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا اور پروفیسر رفیعہ سلطانہ اور پروفیسر سیدہ جعفر سے ہوتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم صاحب ان کے پی ایچ۔ ڈی نگران بنے اور تحقیق کے لیے مفید مشوروں سے نوازا۔ اپنے مقالہ کے عنوان "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے"

کے مواد کے حصول کے لیے پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے انھیں دہلی، لکھنو، علی گڑھ اور کلکتہ جانے کا مشورہ دیا اور دہلی میں اپنے دوست کے پاس قیام کا انتظام کروایا۔ حکومت آندھرا پردیش کے ادارہ اسٹیٹ آر کائیوز سے انھیں ماہ نامہ پارٹ ٹائم ریسرچ فیلوشپ دلانے میں رہ نمائی کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ پروفیسر مغنی تبسم صاحب بڑی گہرائی اور گیرائی سے تحقیقی مسودوں کا مطالعہ کرتے اور اکثر کئی صفحات کو از سر نو طریقہ سے لکھنے کے لیے کہتے۔ کبھی وہ اپنے شاگرد کے گھر آکر بھی کام دیکھ جاتے اور چائے اور کھانے کا دور بھی چلتا تھا۔ ریسرچ کی تکمیل کے بعد پروفیسر مغنی تبسم کے مشورے پر ہی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بنگلور، میسور اور اوٹی کا تفریحی دورہ کیا تھا۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلوؤں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے ان کی خدمات کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "ادارہ ادبیاتِ اردو کو زور صاحب نے ۱۹۳۱ء میں قائم کیا تھا۔ زور مرحوم کے اغراض و مقاصد کا مغنی صاحب بہت احترام کرتے ہیں۔ پابندی کے ساتھ ادارے کے ادبی جریدہ "سب رس" کو شائع کر رہے ہیں۔ لیتھو سے اب یہ رسالہ کمپیوٹر پر شائع ہو رہا ہے۔ ہند و پاک کے ادبی جریدوں میں اس کا ایک اہم مقام ہے۔ ادارہ ادبیاتِ اردو کی ترقی میں مغنی صاحب شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب کہ ادارہ ہندستان کا ایک عظیم تحقیقی سنٹر بن کر اپنا مقام بنا لے گا۔" (۹۳)

خاکہ کے آخر میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر مغنی تبسم کے حق میں صحت و عافیت کی دعا کی ہے اور ع اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن، مصرعہ کے ذریعہ اپنے ہر دل عزیز استاد سے شاگرد کے لیے (خود کے لیے) عنایتوں کا سلسلہ جاری رہنے کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے یہ خاکہ ختم کیا ہے۔

پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ خاکہ دراصل ایک سعادت مند شاگرد کی جانب سے اپنے شفیق استاد کی یادوں کو خراج ہے کیوں کہ اس خاکہ میں پروفیسر مغنی تبسم کی شخصیت کو اجاگر کرنے والے پہلو کم ہیں اور پروفیسر مغنی تبسم کی اپنے شاگرد کی رہ نمائی اور اس کی ترقی کے حالات

زیادہ ہیں۔ چناں چہ یہ مضمون خاکہ کم اور تاثراتی مضمون زیادہ ہے۔

"نفوس گرامی" خاکوں کے مجموعہ میں شامل دسواں خاکہ "حفیظ دہلوی" ایک تعارف ہے۔ حفیظ آصف جاہی عہد میں حیدر آباد کے ایک پرگو شاعر تھے۔ نواب سکندر شاہ ثالث کے زمانے میں وہ حیدر آباد آئے تھے۔ اس زمانے میں چندولال شاداں صدر المہام تھے شاداں اور نواب سکندر جاہ ثالث کے مصاحبین شعرا سے بھی حفیظ واقف تھے حفیظ دہلوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے "آبِ حیات" کے مصنف "محمد حسین آزاد" نے لکھا کہ:

> "نواب عبداللہ خاں صدر الصدور شعر کے عاشق تھے۔ ان سے ایک جلسہ میں میاں شہیدی نے کہا آج ہندستان میں تین شیخ ہیں لکھنو میں شیخ امام بخش ناسخ، دلی میں شیخ محمد ابراہیم ذوق اور دکن میں شیخ حفیظ حفیظ۔" (۶۳)

حفیظ دہلوی کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ حفیظ کا پورا نام محمد حفیظ تھا اور نام کی مناسبت سے انھوں نے حفیظ تخلص اختیار کیا تھا۔ دلی کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دلی کی تباہی کے بعد اورنگ آباد منتقل ہوگئے تھے شاہ نصیر کی زبانی حیدر آباد والوں کی ادب نوازی کا ذکر سن کر حفیظ نے بھی حیدر آباد کا رخ کیا۔ مہاراجہ چندولال شاداں نے حفیظ کی بڑی قدر دانی کی اور اپنے دربار میں مناسب جگہ دی۔ وہ مہاراجہ کے استاد بھی رہے مہاراجہ نے ان کے لیے ایک ہزار روپے ماہ نامہ تنخواہ مقرر کی تھی اور انھیں "ملک الشعرا" کے خطاب سے بھی نوازا حیدر آباد کی ادبی و شعری محفلوں میں حفیظ "شیخ دکن" کے نام سے جانے جاتے تھے شاہ نصیر سے ان کی چشمک رہی، حیدر آباد میں ایک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد ۱۸۳۱ء میں حفیظ کا انتقال ہوگیا۔ حفیظ امامیہ مذہب کے پیرو تھے اور ان کے کلام میں مذہبی رنگ جا بجا پایا جاتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کے کلام کا انتخاب اس خاکہ میں پیش کیا ہے حفیظ نے حضرت علی اور پنجتن پاک کی مدح میں لکھا ہے:

مطلع پڑھے ہے یا علی مدح میں آپ کے حفیظ   شافع روز باز پرس اس کو ہے آسرا تیرا

اپنی مشکل پر نظر کرتا نہیں میں اے حفیظ   حضرت مشکل کشا کو حل مشکل دے کر (۶۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ حفیظ کی میر و سودا کی عقیدت اور خود ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"حفیظ کو خدائے سخن میر سے بڑی عقیدت تھی۔ یہ کہا جائے تو بے جا بھی نہ ہوگا کہ حفیظ کے کلام میں میر کا سوز و گداز، سنجیدگی، سہل ممتنع، پاکیزگی جذبات طہارتِ فکر و نظر، بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔۔۔ میر سے عقیدت رکھنے کے باوجود وہ سودا کی شاعری کے بھی معترف تھے۔" (۶۶)

میر و سودا کے بارے میں حفیظ نے اپنی شاعری میں جن خیالات کو پیش کیا تھا اسے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بطرا انتخاب پیش کیا ہے:

حفیظ اشعار میں معجز نما اہلِ کشش ایسے
کہ گویا گور سے تم نے جنابِ میر کو کھینچا

سودا ہے کہ یاروں سے کریں بحث حفیظ اب
ہے اپنے سخن کو سخنِ میر سے جھگڑا

ہے جانے سخن بزم جہاں ورنہ تہہ خاک
کیا جانیے کس فکر میں ہیں میر اکیلے (۶۷)

اسی طرح اپنے مربی مہاراجہ چندولال کے اعتراف میں جو اشعار حفیظ نے کہے تھے ان میں سے چند ایک منتخبہ اشعار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پیش کیے ہیں:

آستانہ سے مہاراجہ بہادر کے حفیظ
سر اٹھاؤں کیا کہ طوقِ بندگی گردن میں ہے

صد شکر حفیظ اب تو یہ کہتے ہیں عدو بھی
پھر جائے خدا ہم سے جو شاداں سے پھرے ہم (۶۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حفیظ دہلوی کے مدحیہ کلام کا نمونہ ہی پیش کیا ہے جو انھوں نے مذہبی قصیدہ اور اپنے مربی شاداں کی تعریف میں لکھا تھا۔ ان کے عمومی کلام کا نمونہ اس خاکہ میں نہیں ملتا۔ ان کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"حفیظ ایک خوش اخلاق اور نیک انسان تھے۔ نازک دماغ اور پاکیزہ خیالات رکھتے تھے، دولت مند ہونے کے باوجود وہ غریبوں کے دوست و ہمدرد تھے۔ ان کے گھر سے سینکڑوں غریب اور فقیر وابستہ تھے، دوستوں کے ساتھ حفیظ کا سلوک بہت اچھا تھا۔ ان کی مہمان نوازی مشہور تھی۔۔۔ وہ انتہائی باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ کسی بھی ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر ضرورت مند کی وہ دامے، درمے، سخنے مدد کرتے تھے سینکڑوں لوگوں کو حفیظ کی بدولت ملازمتیں مل گئیں۔ حیدرآباد کے عوام و خواص ان کے ممنون و مشکور رہا کرتے تھے۔ حیدرآباد کی شعری محفلوں کے حفیظ روح رواں تھے۔ حفیظ نے محض اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت شاداں کے مزاج میں ایسا رسوخ حاصل کرلیا تھا کہ شاداں حفیظ کی ہر سفارش مان لیتے تھے۔" (۶۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حفیظ کی شخصیت کے علاوہ ان کی شاعری کے بارے میں بھی لکھا ہے اور کہا کہ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کے دواوین کی تعداد کے بارے میں پروفیسر ثمینہ شوکت اور پروفیسر لئیق صلاح کے حوالے سے لکھا ہے کہ حفیظ کے تین سے چھ دیوان ملتے ہیں جو حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں و مخطوطات کے مراکز میں پائے گئے ہیں۔ اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حفیظ دہلوی پر خاکہ لکھ کر انیسویں صدی کے ایک شاعر کا تعارف ادبی دنیا سے کرایا ہے۔ اس خاکہ میں بھی حفیظ کی ابتدائی زندگی کے حالات کی تفصیلات نہیں ملتیں اور ان کے کلام کا انتخاب بھی مناسب طور پر نہیں ملتا۔ البتہ مہاراجہ چندولال شاداں کی ادب نوازی کے حالات اس خاکے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۔نفوس گرامی" خاکوں کے مجموعے میں شامل آخری خاکہ "دانش مندِ گراں مایہ، سلیمان بھائی" کے

عنوان سے ہے۔ یہ خاکہ دراصل پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے بارے میں ہے جو آندھرا پردیش کی سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی کے صدر شعبہ اردو رہ چکے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید چوں کہ دونوں اردو ادب کے استاد رہ چکے ہیں اور دونوں اردو کی جامعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا اردو کی مختلف ادبی محفلوں، سمیناروں اور مشاعروں وغیرہ میں شرکت کے دوران ملاقاتوں سے شناسائی کی وجہ اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے خاکے میں دو دیرینہ رفیقوں کی دوستانہ یادیں جھلک دکھاتی ہیں۔ اس خاکہ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سلیمان بھائی کے نام سے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کو یاد کرتے ہوئے دوستانہ قربت کا ثبوت دیا ہے۔ اس خاکہ میں بھی صرف یادیں ہی جھلکتی ہیں۔ مذکورہ شخصیت کے حالاتِ زندگی اور اس کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بلکہ مختلف مواقع پر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی ملاقاتوں یا تعلقات کے احوال ملتے ہیں چناں چہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے پہلے تعارف کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "اب یہ تقریباً تیس سال قبل جب میں ایم۔اے (اردو) کے سال اول کا طالبِ علم تھا۔ شفیق و محترم استاد پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب۔۔۔ کے اجلاسِ صدارت میں اپنے کسی کام کے سلسلے میں بیٹھا تھا۔ اس وقت ایک نوجوان دراز قد گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں (جن سے ذہانت ٹپکتی تھی) ایک بریف کیس بغل میں دبائے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے علیک سلیک کے بعد مسعود صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ یہ ہمارے ایم۔اے سال اول کے ہونہار طالبِ علم مرزا اکبر علی بیگ ہیں مجھ سے کہا۔۔۔ اکبر صاحب ان سے ملیے یہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لیکچرر سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی ہیں۔ انھوں نے میری ہی نگرانی میں اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ بہ عنوان "رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن" لکھا ہے۔" (۱۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ ان کا پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سے غائبانہ تعارف پہلے سے ہی تھا جب کہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی تحریریں روزناموں اور رسائل میں چھپتی تھیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی یادوں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا کہ سٹی کالج میں ان کے تقرر پر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے انھیں مبارک بادی کا خط لکھا تھا اور پی ایچ۔ ڈی کرنے کی تلقین کی تھی اور یہ بھی ہدایت دی تھی کہ وہ پی ایچ۔ ڈی پروفیسر مغنی تبسم کی نگرانی میں کریں پی ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے بعد انھیں مبارک باد دینے والوں میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید بھی تھے اور انھوں نے یہ تمنا کی تھی کہ ڈاکٹر اکبر علی بیگ اب کالج کے بجائے یونیورسٹی میں پڑھائیں۔ چناں چہ ۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا بہ حیثیت لکچرار اردو شعبہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر عمل میں آیا۔ لیکچرر سے پروفیسر تک ترقی کے مراحل میں ہر موقع پر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے انھیں یاد رکھا اور مبارک باد سے نوازتے رہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے تروپتی سے لگاؤ اور تعلق کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "مثل مشہور ہے کہ اونٹ جب بھاگتا ہے تو مکہ کی طرف ہی بھاگتا ہے۔ اسی کے مصداق سلیمان بھائی تروپتی کو اس اونٹ کی طرح اپنا مرکز سمجھتے ہیں ہندستان کی تقریباً تمام جامعات کی ماہرین کمیٹی میں وہ شامل ہیں۔ تروپتی سے وہ کسی ایک یونیورسٹی کو جاتے ہیں اور لوٹ کر تروپتی آتے ہیں۔ پھر وہاں سے دوسری یونیورسٹی تشریف لاتے ہیں۔ ویسے وہ تروپتی ہی میں گوشہ ٔ عافیت محسوس کرتے ہیں، تروپتی ہی کی دین ہے ایک درجن سے زائد کتابیں، سینکڑوں تحقیقی مقالے ہر ہفتہ "میرا مطالعہ" روزنامہ منصف وغیرہ۔۔۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز تروپتی سے ہوا جہاں انھوں نے شعبہ ٔ اردو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی کے استاد کی حیثیت سے بے شمار شاگردوں کی ذہنی تربیت میں حصہ لیا۔ ان کو تروپتی تک محدود کر دینا زیادتی ہوگی۔ وہ ہمارے ہندستان کے ان نمائندہ پروفیسروں میں شمار ہوتے ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔" (۱۰)

اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بتایا کہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی زندگی کے ترقی کے مراحل میں ہمیشہ ترویج کا ساتھ رہا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا خاکہ کھینچتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ یوں رقم طراز ہیں:

"کہنے کو تو پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ایک اونچے پورے کھرے پٹھان کا پرشکوہ نام ہے۔ لیکن ان کی حیات اور خدمات کا ایک سرسری جائزہ ہی اس یقین کو تقویت پہنچاتا ہے کہ یہ یگانہ روزگار، وحید عصر ذاتِ گرامی پٹھان اپنے آپ میں ایک انجمن ہے، اوپر سے بہت سخت لیکن ناریل کی طرح اندر سے نرم نہایت پرجوش، راست گو، سرگرم، فعال اور متحرک انجمن جس کا ہر لمحہ ہر پل ہر گھڑی اور ہر لحظہ اردو زبان و ادب کے لیے وقف ہے۔ اتنے سینئر پروفیسر ہونے کے باوجود وہ انکسار، سادگی اور شرافت، اخلاق حمیدہ کی تصویر بنے ہوئے سلیمان بھائی، سلیمان اریب مرحوم کے اس شعر کی تفسیر بنے ہوئے نظر آتے ہیں:

بے تاج ہوں بے تخت ہوں بے ملک و حکومت

ہاں نام کا لیکن میں سلیمان رہا ہوں" (۲)

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی حرکی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی خدمات و کارناموں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ درس و تدریس میں وہ طلباء کی رہ نمائی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے زیرِ نگرانی دو درجن طلباء نے ایم۔ فل اور ایک درجن طلباء نے پی ایچ۔ ڈی کی، ادارہ ادبیاتِ اردو کے امتحانات کے کامیاب انصرام میں وہ اپنی خدمات دیتے رہتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ان کی یاد میں منائے جانے والے "جشن جاوید" کا تذکرہ کرنے کے بعد اس مصرعہ کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے دوست کی یاد میں لکھا یہ خاکہ ختم کیا ہے۔ ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے بارے میں یہ خاکہ بھی تاثراتی نوعیت کا ہے اور اس خاکہ میں مصنف

نے شخصیت کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنے زمانہ ،طالب علمی کے واقعات ملازمت اور شادی کے بارے میں بھی بالواسطہ تذکرہ کیا ہے۔ چناں چہ پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے خاکوں میں خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے احوال بھی تفصیلی انداز میں مل جاتے ہیں۔ یہ دونوں مضامین خاکوں سے زیادہ تاثراتی تحریریں معلوم ہوتی ہیں اور شخصیت کے مزید احوال جاننے کے معاملے میں قاری کے لیے یہ دونوں مضامین تشنگی بڑھا دیتے ہیں۔ اگر ان مضامین کو خاکے کہا جائے تو فنی اعتبار سے اس میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔

"نفوس گرامی "خاکوں کے مجموعے میں ایک خاکہ " عامر موسوی مرحوم "کے نام سے ہے۔ جو حیدرآباد کے ایک معتبر شاعر اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بھانجے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور خاکہ "نواب سراج الدین احمد صاحب "کی یاد میں ہے۔ یہ ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے اپنی خدمات کے سبب جانے جاتے ہیں۔ ان دونوں خاکوں میں بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے سابقہ خاکوں کے طرز پر شخصیت کے حالاتِ زندگی، ان کی خدمات اور ان کے افراد خانہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس طرح ان کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ "نفوس گرامی "اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس دوسرے مجموعے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زیادہ خاکے ان شخصیتوں پر لکھے گئے جن سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا راست یا بالراست تعلق رہا ہو۔ پروفیسر جعفر نظام کے علاوہ، پروفیسر غلام عمر خاں، پروفیسر زینت ساجدہ، پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سب اساتذہ اردو اور خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اساتذہ اور رفیق رہ چکے ہیں۔ حفیظ دہلوی، فصاحت جنگ جلیل، عامر موسوی، حیدرآبادی شعرا ہیں۔ اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے پہلے مجموعہ " خوش نفساں " کے مقابلے میں دوسرے مجموعہ " نفوس گرامی " میں شخصیتوں کے انتخاب میں تنوع کم پایا جاتا ہے تاہم جن شخصیتوں کے بارے میں انھوں نے اپنا قلم اٹھایا ہے وہ اردو شعر و ادب اور حیدرآبادی تہذیبی سرگرمیوں کی نمائندہ شخصیتیں ہیں اور ان کے بارے میں معلومات اکٹھا کر کے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حیدرآباد کے ماضی و حال کی اہم شخصیتوں کو تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کے یہ خاکے اردو ادب میں اہمیت کے حامل سمجھے جائیں گے۔

• پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ نگاری کا عمومی جائزہ :

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے مجموعے " خوش نفساں " اور " نفوس گرامی " میں شامل خاکوں کے انفرادی جائزے کے بعد اب یہ دیکھا جائے گا کہ ہیئت اور فن کے اعتبار سے عمومی طور پر ان کے خاکے فن خاکہ نگاری کے معیار پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔ عموماً ہر تخلیق کا مقصد ترسیل ہوتا ہے اور تخلیق کار چاہتا ہے کہ اس کی تخلیق کو کوئی پڑھے اور دیکھے اور سمجھے۔ چناں چہ ادبی تخلیقات کا بنیادی مقصد قاری تک اس کی ترسیل ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری بھی قارئین تک ایک شخصیت کے احوال پہنچانے کی کوشش ہوتی ہے۔ ایک قاری کسی شخصیت کا خاکہ پڑھنا چاہتا ہے اس بارے میں صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> " خاکہ جہاں ایک اچھے افسانے کی طرح قاری کے لیے تفریح طبع اور سکون قلب کا سامان مہیا کر سکتا ہے وہیں ایک اچھے دوست کا بدل بھی ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ڈرامائیت اور موضوعیت موجود ہو ایک اچھے خاکے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد قاری یہ کہہ اٹھے کہ میں تو اس شخص سے واقف ہوں جس کا تعارف کرایا گیا ہے۔۔۔ عظیم شخصیتوں کے خاکوں کا مطالعہ نہایت عمدہ اور مستحسن جذبات پیدا کرتا ہے۔ انسان ان کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی خوبیوں اور خامیوں اور صلاحیتوں کا ان سے مقابلہ کرتا ہے اور اس طرح خود اعتمادی حاصل کرتا ہے اور لغزشوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔" (۳۰)

خاکہ نگار اور قاری کے رشتہ کے بارے میں صابرہ سعید کے ان خیالات کو پڑھنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ نگاری لیا جائے تو انھوں نے بھی یہ خاکہ قارئین کی تسکین اور ان کی اصلاح و رہنمائی کے لیے لکھے ہیں۔ ہاشم علی اختر، عزیز مرزا، پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر مغنی تبسم، سید علی اکبر، ڈاکٹر موہن لال نگم، ڈاکٹر زینت ساجدہ و سکینہ بیگم ایسی نابغہ روزگار شخصیات ہیں کہ جن کے حالات پڑھ کر عام قاری اپنے لیے سبق حاصل کرتا ہے۔ چناں چہ قارئین کے لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے یہ خاکے مشعلِ راہ سے کم نہیں۔ اسی بات کو

پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے بھی "خوش نفساں" کے پیش لفظ میں بیان کیا اور کہا کہ:

"ان مضامین کی ایک اخلاقی افادیت بھی ہے۔ بیش تر سوانحی خاکے ایسی شخصیتوں کے ہیں جنھوں نے نامساعد حالات کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن کسی دنیوی مفاد کی خاطر اپنے اصولوں کو قربان نہیں کیا اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے۔ ان کی زندگی نئی نسل کے لیے قابلِ تقلید مثال بن سکتی ہے۔" (۴۰)

خاکہ نگاری اور قاری کے مابین رشتے کے بعد دوسرا اہم پہلو خاکہ کے لیے شخصیت کا انتخاب ہے۔ عموماً اردو کے خاکہ نگاروں نے صرف مخصوص یا ایک ہی طرح کے افراد کو موضوع نہیں بنایا۔ ان کے خاکوں میں ادیب، شاعر، نقاد، رہ نما، علما، مدبر، وزیر، سیاست داں، صحافی، مقرر، محقق، فلسفی، مترجم، مزاح نگار، دوست وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ زیادہ تر خاکہ نگاروں نے عظیم ہستیوں پر خاکے اس لیے لکھے تاکہ ان کی سیرت کی بے نقابی انسانی مشاہدات و تجربات میں اضافے کا سبب بن سکے۔ عام اشخاص پر خاکے کم لکھے گئے کیوں کہ خاکہ نگار کو کسی ایسی شخصیت کی تلاش ہوتی ہے جو زندگی کے کسی شعبہ میں اونچا مقام رکھتی ہو۔ لیکن مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" اور "نور خاں" جیسے عام انسانوں پر خاکے لکھ کر یہ ثابت کیا کہ خاکہ نگاری کے لیے شخصیت کا انتخاب دنیوی شان و شوکت کی بناء نہیں بلکہ انسانیت کے سبب قرار پایا ہے۔ "چند ہم عصر" میں وہ لکھتے ہیں:

"دولت مندوں، امیروں، بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں غریب امیر کا کوئی فرق نہیں ہے"

ع   پھول میں گر آن ہے تو کانٹے میں بھی شان ہے" (۵۰)

موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں دیکھا جائے تو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی پہلے زمرہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات کا انتخاب کیا ہے۔ "خوش نفساں" اور "نفوس گرامی" میں شامل شخصیتیں اعلیٰ تعلیم یافتہ،

نامور شعرا اور ماہرین تعلیم ہیں۔ ان خاکوں میں کوئی بھی شخصیت غیر معروف نہیں یہ بات ناممکن ہے کہ خواص کے علاوہ عوام میں حیدرآباد میں ایسی کوئی شخصیت نہ گزری ہو جس کے ایک حقیر کارنامے کو ہی سہی لیکن اس کے ذریعہ اس شخصیت پر خاکہ لکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح کی مثالیں مولوی عبدالحق کے ہاں ملتی ہیں لیکن اس کے لیے مشاہدے اور دلی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے زیادہ تر خاکے عابد علی خاں مدیر سیاست کی خواہش پر اخباری ضرورت کے لیے لکھے تھے اور ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ حیدرآباد کی مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی سربر آوردہ شخصیات پر تعارفی مضامین لکھے جائیں چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے وقتی ضرورت کے اعتبار سے اپنے خاکوں کا موضوع حیدرآباد کی عظیم شخصیات رکھا۔ اگر وہ آئندہ بھی اپنی خاکہ نگاری کا سلسلہ جاری رکھیں تو انھیں سماج کے نچلے طبقات میں بھی کئی شخصیات ایسی نظر آسکتی ہیں جن پر اچھے خاکے لکھے جاسکتے ہیں۔

خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس میں فنی مہارت ہو اور اس حاصل شدہ مواد کو اس طرح ترتیب دینے کی صلاحیت ہو کہ اس کی تخلیق فن کسی کسوٹی پر پوری اترتے ہوئے بھی ماہرین ادب اور قارئین کی نظروں میں قبولیت کا درجہ رکھتی ہو۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک نامور محقق کے علاوہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں ان کا تحقیقی کارنامہ " مرزا علی لطف حیات و کارنامے " اساتذہ تحقیق سے داد سند حاصل کرچکا ہے۔ چناں چہ انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان میں فنی لوازم اور اسلوب نگارش بہت حد تک پختگی کا حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ خاکے آج بھی اردو کے موقر روز ناموں میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر رہے ہیں خاکہ نگاری کے لیے موضوع سے متعلقہ شخصیت کے انتخاب اور فنی مہارت رکھنے کے بعد سب سے اہم مرحلہ خاکے کا مواد ہوتا ہے۔ خاکہ کے ذریعہ ایک شخصیت کا بھرپور تعارف مطلوب ہوتا ہے۔ اس کے لیے شخصیت کا تعارف، اس کے آباد و اجداد کے حالات، تاریخ پیدائش، ابتدائی زندگی میں تعلیم و تربیت اساتذہ، تعلیم کے مراحل، ملازمت، شادی، زندگی کے اہم واقعات، شخصیت کے کارنامے، شخصیت کی سیرت و صورت، گفتار و کردار، عادات و اطوار سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ مواد کے حصول کے لیے اگر شخصیت باحیات ہو تو اس سے راست انٹرویو لے کر اس

کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح اس کے افراد خانہ دوست احباب، شخصیت کے لکھے ہوئے خطوط، ہم عصر شخصیتوں کے خطوط اور تحریروں سے بھی خاکہ کے لیے کار آمد مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جو خاکے لکھے ان میں بیش تر خاکے با حیات شخصیتوں کے بار میں لکھے گئے چناں چہ ان خاکوں کا مواد زیادہ تر شخصیت سے بہ راہِ راست ملاقات کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جن شخصیتوں کے بارے میں لکھا ان کے بارے میں بہت کچھ مواد پہلے سے ہی تحریری شکل میں موجود تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بکھرے ہوئے مواد کو بہ خوبی ترتیب دیا ہے۔ شعرا کے خاکوں میں ان کے کلام کے انتخاب کے ذریعہ انھوں نے شخصیت کا تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ "نفوس گرامی" میں شامل خاکوں کی بیش تر شخصیتیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے بہ حیثیت استاد، دوست یا رشتہ دار کے وابستہ رہی ہیں۔ چناں چہ انھوں نے ان شخصیتوں سے اپنے تعلقات کے احوال کو خاکوں کے مواد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

خاکہ نگاری کی کامیابی کے لیے ایک اور ضروری بات خاکوں کا اسلوب ہے۔ دیگر اصنافِ ادب کی طرح خاکہ نگار کے اظہار کا ذریعہ بھی زبان ہوتی ہے۔ خاکہ میں چوں کہ شخصیت کا تعارف ہوتا ہے لہذا اس کا اسلوب بیانیہ ہونا چاہیے۔ بیان کی صناعی کے ذریعہ ہی خاکہ نگار کسی شخصیت کے معائب و محاسن قوتوں اور کمزوریوں اور اس کی خدمات کو پیش کر سکتا ہے اچھے خاکے میں اسلوب کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے صابرہ سعید لکھتی ہیں:

"خاکہ نویس خاکے کی ابتدا سے اس کے اختتام تک کسی جگہ حسنِ بیان کے رشتے کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔ اگر اس سے ذرا سی چوک ہو جائے تو تاثر میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور خاکے میں انتشار پیدا ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ دراصل اندازِ پیش کش ہی خاکے کی اہم خصوصیت ہے، انتخاب ترتیب و تشکیل کی صلاحیت سے اگر کوئی فن کار بہرہ ور نہیں تو وہ مواد کو ٹھیک طرح سے سمیٹ سکتا ہے اور نہ موضوع کی بہتر عکاسی ہی میں کامیاب ہو سکتا ہے بہم انداز اور بے تکی صاف گوئی بھی اثر کو بگاڑ سکتی ہے اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر کوئی

خاکہ نویس کیمرے کی آنکھ سے دیکھے اور مصور کے موقلم سے لکھنے کے فن سے ناواقف ہے تو اس کی تحریر موضوع کے مزار کا کتبہ تو بن سکتی ہے۔ اس کی زندگی کا آئینہ نہیں اور اگر موضوع اور بیان دونوں دل کش ہوں تو خاکہ نگاری خوب ہوتی ہے۔" (۶۰)

خاکہ نگاری میں بیانیہ اسلوب کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے اسلوب کو دیکھا جائے تو ان خاکوں میں بھی بیانیہ اسلوب دکھائی دے گا۔ "نفوس گرامی" میں شامل خاکے چوں کہ اخباری ضرورت کی خاطر لکھوائے گئے تھے لہذا ان خاکوں میں صحافتی رنگ غالب ہے۔ شخصیت کے حالات بیان کرنے میں بیانیہ انداز استعمال کیا گیا ہے اور ایک مخصوص چوکھٹے میں احوال بیان کیے گئے ہیں۔ اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ ادبی چاشنی یا محاوراتی انداز بیان کم ہے۔ بعض مواقع پر شخصیت کی زندگی میں پائی جانے والی حسن مزاح یا شعریت کے سبب ان خاکوں کے اسلوب میں بھی مزاح اور ادبی رنگ پیدا ہوا ہے۔ ہاشم علی اختر کے خاکے میں ان کی شخصیت کے ظرافتی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"ایک بار اردو مجلس کا جلسہ ہاشم علی اختر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں راقم الحروف نے ایک مقالہ اکبر کی شاعری پر پڑھا تھا۔ مقالہ میں اکبر کے اس شعر کا بھی ذکر تھا:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہاشم علی اختر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس شعر کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ مزاحیہ انداز میں سنایا۔ ہاسٹل میں رہنے والے لڑکے اس شعر کو یوں پڑھ سکتے ہیں:

ہم بھوک سے مرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ دال بھی دیتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ شعر سنا کر ہاشم علی صاحب نے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ جب ان کے کسی دوست

کی صاحب زادی کی شادی "ٹرنک کال" پر طے پائی تب ہاشم صاحب کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے دریافت کیا جناب مونو گیمی، پولوگیمی کی اصطلاحات تو ہم نے سنی ہیں۔ اس شادی کو کیا نام دینا چاہیے۔ اس پر ہاشم علی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ٹیلی گیمی۔" (۷)

اس طرح کے دل چسپ اور پُر مزاح واقعات کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکوں کو دل چسپ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خاکوں میں جا بجا اشعار و مصرعوں کو استعمال کرتے ہوئے ان خاکوں میں ادبی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید علی اکبر کے خاکے میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میر کے شعر کو پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"سید علی اکبر صاحب نے اساتذہ کے وقار کو بڑھایا۔ خدائے سخن میر نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں" (۸)

اسی طرح "محسن ماموں" کے خاکے میں ان کے انتقال پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یہ مصرعہ لکھا: ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ڈاکٹر زینت ساجدہ اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے خاکوں کے اختتام پر ان شخصیتوں کے لامتناہی کارناموں کو بیان کرنے کے لیے مزید گنجائش کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ مصرعہ لکھا: ع

"سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے" (۹)

پروفیسر مغنی تبسم کے خاکے کے اختتام پر اپنی زندگی میں جاری فیض کے لیے اپنے استاد شفقت و تعلیم و تربیت کو خراج پیش کرتے ہوئے اس مصرعہ کے ذریعہ اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا ہے: ع

اسی کے فیض سے ہے میری نگاہ روشن" (۸۰)

اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکوں میں اشعار استعمال کرتے ہوئے انھیں ادبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

خاکہ نگاری میں کردار نگاری کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ خاکے میں بیان کردہ شخصیت کے خد و خال، حرکات و سکنات، لباس، نفسیاتی اور ذہنی کیفیات و تغیرات کے مجموعہ سے شخصیت کا کردار بنتا ہے۔ خاکے میں کردار نگاری کی اہمیت بیان کرتے ہوئے صابرہ سعید لکھتی ہیں:

"خاکے میں خاکہ نگار کو اپنی فن کاری سے شخصیت کی دوبارہ تخلیق کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح کہ وہ خاکے کے کینوس پر متحرک بھی ہو اور اس کے نقوش ایسے گہرے ہوں کہ پڑھنے والے کا ذہن اسے مدت تک بھلا نہ سکے۔ اسی مقصد کے لیے خاکہ نگار کسی شخصیت کے رنگ و روپ، وضع قطع اور عادات و اطوار کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔ یہ اجمالی تصویر اتنی جاذب نظر ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے اس لیے کردار نگاری میں شبیہہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شبیہہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ انسانی شکل و صورت کے ساتھ اس کی فطرت کا رازدان بھی ہوتا کہ وہ سیرت کو صورت کے ذریعہ نمایاں کر سکے۔" (۸۱)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکوں میں کرداروں کو اجاگر کرنے کے لیے شخصیت کی وضع قطع اور عادات اطوار کو بہ خوبی بیان کیا ہے اور اس کے ذریعہ قاری تک شخصیت کی ہو بہو لفظی بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

عزیز مرزا کے خاکے میں ان کے سراپا اور لباس و وضع قطع کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا قد آور آدمی تھے۔ پیشانی بلند، مونچھیں داڑھی سے ملی ہوئی تھیں داڑھی

بھرے ہوئے چہرے پر بہت زیب دیتی تھی۔ آنکھیں کسی قدر ابھری ہوئی تھیں کلائیاں چکلی اور مضبوط تھیں۔ شخصیت انتہائی بارعب تھی، جس سے ملتے وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔" (۸۲)

ایک خاکے کو کامیاب اور دل چسپ بنانے میں واقعات کے بیان سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ شخصیت کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے اہم اور دل چسپ واقعات کو خاکے میں بیان کرنے سے شخصیت کی سیرت پوری طرح بے نقاب ہو سکتی ہے۔ خاکہ نگار کی طبع پر یہ بات منحصر ہوتی ہے کہ شخصیت کی زندگی سے کس نوع کے واقعات کا انتخاب کرتا ہے۔ واقعات عموماً تعمیری ارادے سے اور اخلاقی اور سماجی نقطہ نظر سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ واقعات کے بیان سے خاکے میں نہ صرف دل چسپی پیدا ہوتی ہے بلکہ ان کی پیش کشی سے خاکوں کو تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد ان واقعات کی تفصیلات مختلف مضامین سے حاصل ہونے والی جزئیات کے ذریعہ قارئین کے ذہن میں تازہ ہوتی ہیں۔ مثلاً بہت سے لوگوں نے رودِ موسیٰ میں آئی طغیانی کے بارے میں سرسری سننا ہو گا لیکن اس واقعہ کی تفصیلات اگر کتابوں میں موجود ہوں تو ان کے مطالعہ سے قارئین کے ذہن میں رود موسیٰ کی طغیانی کی تفصیلات آ سکتی ہیں۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے خاکوں کے مجموعے "خوش نفساں" اور "نفوسِ گرامی" میں جن جن شخصیتوں کو پیش کیا ان کے ساتھ پیش آئے بعض دل چسپ واقعات ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ عزیز مرزا کے خاکے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ موسیٰ ندی میں آئے سیلاب کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امدادی کاموں میں عزیز مرزا کی خدمات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۹۰۸ء میں حیدرآباد میں ایک زبردست سیلاب آیا۔ جس کو طغیانی رودِ موسیٰ کہتے ہیں اس سیلاب میں ہزاروں آدمی بہہ گئے ہزاروں مکانات دیکھتے ہی دیکھتے گر گئے۔ ایک ریلیف کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے معتمد مہاراجہ کشن پرشاد کے حکم سے عزیز مرزا ہی بنائے گئے۔ اس پر حاسد بری طرح جلنے لگے ان کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر سازش کی گئی۔

طغیانی رودِ موسیٰ کے وقت بہ حیثیت معتمد ریلیف کمیٹی عزیز مرزا نے بہت شان دار کارنامے انجام دیے۔ عوام و خواص میں ان کی مقبولیت دیکھ کر سازشی تاب نہ لاسکتے۔" (۸۳)

اسی طرح دیگر خاکوں میں بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے واقعات کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دل چسپی بڑھائی ہے۔

منظر نگاری اور جزئیات نگاری بھی اگر خاکہ نگاری کا ضروری عنصر سمجھی جائیں تو یہ عناصر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں میں خال خال نظر آتے ہیں۔ یہ خاکے چوں کہ اخباری ضرورت کے لیے لکھے گئے تھے اس لیے اس میں اختصار کو مدنظر رکھا گیا۔ لیکن بعض خاکے جیسے پروفیسر غلام عمر خاں صاحب اور ہاشم علی اختر کے خاکے تفصیلی لکھے گئے لیکن ان میں بھی ضرورتاً یا بلا ضرورت منظر نگاری یا جزئیات نگاری نہیں ملتی۔ فنی اعتبار سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ نگاری کا جائزہ لینے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی خاکہ نگاری بہت حد تک فنی معیار پر اترتی ہے۔ ہر اچھی تخلیق میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں اسی طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں میں جہاں بے شمار خوبیاں ہیں وہیں چند خامیاں بھی ہیں لیکن بے شمار خوبیوں میں چند ایک خامیاں نہ کے برابر دکھائی دیتی ہیں۔ "خوش نفساں" اور "نقوش گرامی" خاکوں کے مجموعے میں پائی جانے والی ایک بنیادی اسلوب کا روکھا پن اور سادگی ہے۔ ان خاکوں کے اسلوب میں بیانیہ انداز پایا گیا ہے۔ خاکہ نگار نے شخصیتوں کے احوال سیدھے سادھے انداز میں مخصوص فارمولے کے تحت لکھے ہیں۔ تمام خاکوں میں مواد کی پیش کشی میں یکسانیت پائی گئی ہے خصوصاً احوال زندگی کے بیان میں ایسا لگتا ہے کہ خاکہ نگار نے مخصوص طرز پر شخصیات کے حالات قلم بند کیے ہیں تقریباً تمام خاکوں میں شخصیت کا تعارف اس کے آباد و اجداد کے احوال، پیدائش، ابتدائی تعلیم، اسکولوں اور جامعات میں تعلیم، دورانِ تعلیم شخصیت کے ساتھیوں کا تذکرہ، اساتذہ کا تذکرہ، زمانہ طالبِ علمی کے واقعات، ملازمت، شادی، افراد خانہ کی تفصیلات اور آخر میں شخصیت کے کارنامے اور ان کی خدمات کو خراج شامل ہے۔ ان خاکوں میں تنوع نہیں پایا جاتا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اسلوب میں اگر جمالیاتی رنگ ہوتا اور اگر اندازِ بیان کی چاشنی ہوتی تو ان خاکوں میں دل چسپی مزید

بڑھ جاتی۔ خاکوں کے نام رکھنے میں انھوں نے اس طرح کا انداز اپنایا ہے پروفیسر مغنی تبسم کے خاکے عنوان، تبسم اردو مغنی تبسم رکھا تو دیگر خاکہ نگاروں کو کبھی ماموں یا کبھی بھائی سے مخاطب کیا۔ اس طرح دل چسپ عنوانات دیکھ کر انھوں نے قاری کو ان خاکوں کے مطالعے کے لیے موڑتے ہوئے کامیابی حاصل کی ہے۔ منجملہ ان سب باتوں کے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ نگاری حیدرآباد کی نابغہ روزگار شخصیات کے بھرپور تعارف کے ساتھ اردو ادب کی تاریخ میں ضرور اہم مقام رکھتی ہے۔ ان خاکوں کے ذریعہ گزشتہ حیدرآباد کی تاریخ نہ صرف ان خاکوں میں محفوظ ہو گئی بلکہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی حیدرآباد کی نامور ہستیاں نئی نسل کے لیے اپنے کارناموں کے ساتھ ان خاکوں میں محفوظ ہو گئیں۔ اس طرح یہ خاکے اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔

○●○

حوالے :

١ مشمولہ "اردو میں خاکہ نگاری" صابرہ سعید (٩٣ - ٩٢)

٢ پروفیسر سیدہ جعفر "اردو مضمون کا ارتقا ١٩٥٠ء تک" ١٩٧٢ء، ص: ١٣ - ١٣

٣ صابرہ سعید "اردو میں خاکہ نگاری" ص: ٦٧ - ٦٨

٣ صابرہ سعید "اردو میں خاکہ نگاری" ص: ١٠٣

٥ مشمولہ "اردو میں خاکہ نگاری" از صابرہ سعید، ص: ٩

٦ مشمولہ "اردو میں خاکہ نگاری" از صابرہ سعید، ص: ١١

٧ مشمولہ "خوش نفساں" از ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ۔ اکتوبر ١٩٨٣ء حیدرآباد، ص: ٧

٨ مشمولہ "خوش نفساں" از ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص: ٦

٩ مشمولہ "خوش نفساں" از ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص: ٧

١٠ مشمولہ "خوش نفساں" ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص: ٨،٩

١١ مشمولہ "خوش نفساں" ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص: ١١،١٢

۱۲ مشمولہ "خوش نفساں" ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص: ۱۲۔۱۳

۱۳ مشمولہ "خوش نفساں" ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ص: ۱۳

۱۴ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۴

۱۵ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۵۔۱۶

۱۶ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۷

۱۷ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۲۰

۱۸ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۲۲۔۲۳

۱۹ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۲۴

۲۰ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۲۷۔۲۸

۲۱ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۲۸۔۲۹

۲۲ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۲۹

۲۳ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۳۸

۲۴ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۳۹۔۴۰

۲۵ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۵۰۔۵۱

۲۶ مولوی عبدالحق "چند ہم عصر (دہلی ۱۹۳۲ء) "مشمولہ خوش نفساں ص: ۵۷

۲۷ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۶۰۔۶۱

۲۸ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۶۳

۲۹ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۶۴

۳۰ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۷۳۔۷۴

۳۱ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۷۷۔۷۸

۳۲ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۹۰

۳۳ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۸۰ - ۸۱

۳۴ جوش ملیح آبادی "امانت غم" حیدر آباد (۱۹۸۲ء) ص: ۱۴

۳۵ احتشام حسین "امانت سخن" (۱۹۷۷ء) ص: ۸

۳۶ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۸۲

۳۷ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۸۶

۳۸ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۸۸، ۸۹ - ۹۲

۳۹ پروفیسر مسعود حسین خاں مشمولہ "خوش نفساں" ص: ۸۸

۴۰ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

۴۱ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۹۹

۴۲ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۰۵ - ۱۰۶

۴۳ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۰۷

۴۴ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۱۲ - ۱۱۳

۴۵ جوش ملیح آبادی مشمولہ "خوش نفساں" ص: ۱۱۸

۴۶ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۱۶ - ۱۱۷

۴۷ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۲۲

۴۸ نور احمد شیخ مشمولہ "خوش نفساں" ص: ۱۲۶

۴۹ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ "خوش نفساں" ص: ۱۲۷

۵۰ پروفیسر مغنی تبسم مشمولہ "خوش نفساں" ص: ۱۱، ۱۲، ۱۳

۵۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "نفوس گرامی" سودہ / سب رس، جون ۱۹۹۴ء، ص: ۱۸

۵۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ/ سب رس، جون ۱۹۹۴ء ص: ۲۰

۵۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ

۵۴ ڈاکٹر زینت ساجدہ مشمولہ۔نفوس گرامی ۔مسودہ

۵۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔مسودہ

۵۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ/ ماہ نامہ انشا کلکتہ ،نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء، ص: ۴۴

۵۷ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ/ انشا کلکتہ نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء، ص: ۴۹

۵۸ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ/ انشا کلکتہ نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء، ص: ۵۶

۵۸/۱ پروفیسر جگناتھ آزاد بہ حوالہ۔نفوس گرامی ۔ مسودہ

۵۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ/ سب رس حیدرآباد، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۶۱

۶۰ فصاحت جنگ جلیل۔ مشمولہ۔نفوس گرامی ۔مسودہ/ سب رس حیدرآباد، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۶۱

۶۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ/ تبسم اردو۔ مغنی تبسم

۶۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ خاکہ تبسم اردو۔ مغنی تبسم

۶۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔سودہ تبسم اردو۔ مغنی تبسم

۶۴ محمد حسین آزاد۔ "آبِ حیات" مشمولہ۔نفوس گرامی ۔مسودہ

۶۵ حفیظ دہلوی مشمولہ۔نفوس گرامی ۔مسودہ/ حفیظ دہلوی ایک تعارف از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" ۱۵/ اگست ۱۹۹۶ء

۶۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔مسودہ مضمون حفیظ ایک تعارف

۶۷ حفیظ دہلوی، مشمولہ۔نفوس گرامی ۔مسودہ

۶۸ حفیظ دہلوی، مشمولہ۔نفوس گرامی ۔مسودہ

۶۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔نفوس گرامی ۔مسودہ

۷۰۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ نفوس گرامی ۔ سودہ / مضمون سلیمان بھائی

۷۱۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ نفوس گرامی ۔ سودہ / مضمون سلیمان بھائی

۷۲۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ نفوس گرامی ۔ سودہ / مضمون سلیمان بھائی

۷۳۔ صابرہ سعید ۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ۔ ص: ۱۱۔ ۱۲

۷۴۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔ خوش نفساں ۔ ص: ۱۳

۷۵۔ مولوی عبدالحق ۔ چند ہم عصر ۔ مشمولہ ۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ۔ ص: ۱۵

۷۶۔ صابرہ سعید ۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ۔ ص: ۳۱

۷۷۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ خوش نفساں ۔ ص: ۲۴۔ ۲۵

۷۸۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ خوش نفساں ۔ ص: ۳۱

۷۹۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ نفوس گرامی ۔ مسودہ

۸۰ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ نفوس گرامی ۔ مسودہ

۸۱ صابرہ سعید ۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ۔ ص: ۳۹

۸۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ خوش نفساں ۔ ص: ۵۰

۸۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ خوش نفساں ص: ۳۷

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
بہ حیثیت سوانح نگار

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اعلیٰ پائے کے محقق و مدون، نقاد، شاعر و ادیب، انشا پرداز اور خاکہ نگار کے علاوہ ایک اچھے سوانح نگار بھی ہیں۔ ان کی سوانحی کتاب "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ہے۔ جو ادارہ، شعر و حکمت کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے جسے سعادت علی قریشی صاحب مرحوم نے کیا اور یہ کتاب زیرِ طبع ہے۔ "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" کتاب کے ذریعہ سوانح نگاری میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا مقام متعین کرنے سے قبل فن سوانح نگاری کی تعریف، اس فن کے لیے درکار مہارت و لوازمات کے بارے میں جان لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

سوانح نگاری کے ذریعہ ایک شخصیت کی زندگی کے حالات تفصیلی طور پر جمع کرتے ہوئے شخصیت اور اس سے متعلقہ عہد کو محفوظ کر دیا جاتا ہے اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں افراد کی زندگیوں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ دیگر اصناف کی طرح سوانح نگاری کا فن بھی انگریزی ادب کے زیرِ اثر اردو زبان میں رائج ہوا۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں سوانح عمری کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

"سوانح عمری کسی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے۔" (۱)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سوانح عمری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سوانح حیات کا مطالعہ ایک خاص نقطہ نظر سے مطالعہ فطرت ہے اور اس کا لکھنا حقیقت میں فطرت نگاری ہے۔ سوانح حیات ایک ریکارڈان ارتسامات کا ہوتے ہیں جو گوناگوں خارجی واقعات اور داخلی تاثرات کے تسلسل سے تشکیل پاتے ہیں۔" (۲)

انسانی تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادب کی اصناف میں بھی تنوع پیدا ہوتا گیا۔ انیسویں صدی میں چھاپہ خانوں کے عام ہونے سے کتابوں اور اخبارات ورسائل کا چلن عام ہونے لگا۔ تعلیم کے فروغ کے ساتھ لوگوں کی توجہ اپنے اطراف اور اپنے ماضی میں گزری ان سرکردہ شخصیتوں کی جانب ہوئی جن کی شخصیت اور ان کے کارنامے وخدمات اس قابل تھے کہ انھیں محفوظ کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ان سے رہ نمائی کا کام لیا جاسکے ۔ ایسے ماحول میں افراد کی زندگی کے حالات قلم بند کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ جو متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھوں نے کسی علم یا فن میں کمال حاصل کیا تھا۔ یا اپنے کردار اور تعلیمات سے معاشرے کو فائدہ پہنچانا تھا۔ سوانح میں ہیرو کے کارناموں کے بیان کے ساتھ اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جانے لگا۔ سوانح دو قسم کی ہوتی ہے۔ تاریخی اور ادبی۔ تاریخی حیثیت سے اس میں فرد کی زندگی کے واقعات سچائی کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ ادبی حیثیت میں سوانح کے اسلوب اور سانچے کے ذریعہ جمالیاتی ذوق پہچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جدید سوانح نگاروں میں "پلوٹارک" اور "باسول" شہرت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی سوانح میں کسی انسان کے حالات ہی قلم بند نہیں کیے بلکہ ایک روح کی مکمل تحقیق کی ہے۔ داستان کی طرح سوانح میں بھی ابتدا سے آخر تک دل چسپی برقرار رکھنا سوانح کی کامیابی کی علامت سمجھا جاتا ہے سوانح میں شخصیت کی سیرت بے نقاب ہوتی ہے غیر جانب داری کے ساتھ شخصیت کے ذاتی اور نجی حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ایک معمولی انسان سے لے کر عظیم ترین شخصیات بھی سوانح کا موضوع ہو سکتی ہیں۔ سوانح نگار تصوراتی نہیں بلکہ ایک حقیقی شخصیت کی مرقع کشی کرتے ہیں اور اس دوران مکالمے، لطائف، ظرافت، خطوط اور افسانے کا رنگ استعمال کرتے ہوئے کسی شخصیت کی سوانح میں دل چسپی پیدا کی جاتی ہے۔ صابرہ سعید ایک اچھے سوانح نگار کے لیے درکار مہارت کے بارے میں لکھتی ہیں:

"سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ ایک مکمل تصویر پیش کر دے جو کسی انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام حالات افکار و افعال کی تاریخ وار نقوش سے مزین ہو۔۔۔ ایک مستقل سیرت میں انسان کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔۔۔ سوانح نگار کو اپنی موضوع کی شخصیت اور کارناموں کو واضح طور پیش کرنا پڑتا ہے۔۔۔ سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرے۔ اس کی شخصیت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہوں تاکہ اس کا ہیرو ایک جیتا جاگتا انسان معلوم ہو اور وہ اپنی انفرادیت کی تمام گہرائیوں اور داخلیت کی ساری وسعتوں کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔" (۳)

اردو ادب میں حالی نے "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" جیسی جامع سوانح عمریاں لکھ کر سوانح نگاری کی ایک پختہ روایت قائم کی جسے آگے چل کر شبلی نعمانی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے پروان چڑھایا۔

سوانح نگاری کی تعریف، اس کے فنی لوازم اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد دیکھا جائے تاکہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تصنیف "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" نے سوانحی نگاری کے فنی لوازمات کو کس طرح برتا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی کتاب نواب سعید جنگ بہادر مرحوم سابق چیف جسٹس ریاست حیدرآباد کے نام معنون کی ہے اور عدالتی لباس میں موجود ان کی تصویر کے نیچے اقبال کا یہ شعر دیا ہے:

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے　　　سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۲۵۵ صفحات پر مشتمل اس سوانحی کتاب کی قیمت چالیس روپے رکھی گئی۔ کتاب کے ڈسٹ کور (گرد پوش) پر پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کے تعارفی خیالات ملتے ہیں۔ عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی جمع کرنے کی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے پروفیسر غلام عمر خاں لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کا احاطہ کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے دوسرے ماخذوں کے علاوہ خود عزیز مرزا کے ذی مرتبت اخلاف، حیدرآباد اسٹیٹ آرکائیوز اور دفاتیر باب حکومت حیدرآباد کی قدیم امثلہ کی مدد سے نادر اور قیمتی مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے خوش سلیقگی کے ساتھ ناقدانہ انداز میں پیش کیا ہے۔" (۴)

پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کے ان خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی یکجا کرنے میں جانفشانی سے کام لیا اور تحقیق کے جملہ اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مواد اکٹھا کیا۔ کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر یوسف سرمست نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس کاوش کے بارے میں لکھا ہے:

"حرکت و عمل سے ایک گلہری بھی پہاڑ پر فوقیت حاصل کرلیتی ہے۔ اگر کسی پہاڑ میں یہ حرکت و عمل کی قوت آجائے تو وہ کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ اس کو اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اکبر کو دیکھیے اکبر اپنے ڈیل ڈول ہی نہیں طرز تخاطب سے بھی متاثر کرتے ہیں... خاکہ نگاری کے بعد وہ سوانح نگاری کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ ان کی زیرِ نظر کتاب "عزیز مرزا" مختصر سوانح عمری ہے۔ جو بہت دل چسپ انداز ہی میں نہیں بلکہ بڑی تحقیق کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انھوں نے ہر ممکن طریقہ پر عزیز مرزا کے تعلق سے مواد حاصل کیا ہے۔" (۵)

پروفیسر یوسف سرمست کے ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بڑی تحقیق و جستجو کے ذریعہ عزیز مرزا کے حالات یکجا کیے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے حرفِ آغاز کے عنوان سے لکھا کہ وہ بچپن ہی سے عزیز مرزا کی شخصیت ان کی قومی و سماجی خدمات اور علمی کارناموں کے بارے میں سن کر متاثر ہوئے اور ان کے حالاتِ زندگی لکھنے کا ارادہ کیا اور اسے اپنی خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا جیسے مترجم، سوانح نگار، انشا پرداز، مخلص مصلح قوم، قابل عہدے دار اور

بہترین مقرر حیدرآباد کی تاریخ میں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھ کو اس کتاب کے ذریعہ ایسے نیک صفات انسان اور بلند پایہ ادیب کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کا موقع نصیب ہوا۔" (۶)

عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی پر ایک کتاب "محفل عزیز" ۱۹۵۱ء کو شائع ہو چکی تھی۔ جس کے مولف قمر الدین احمد بدایونی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں اس کتاب کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ عزیز مرزا پر چیدہ چیدہ مضامین ہیں لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے افراد خاندان اور دیگر ذرائع سے عزیز مرزا کی حیات کے نامعلوم گوشوں کو روشناس کرایا۔ یہ کتاب ابتدائی شکل میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایم۔ اے کا مقالہ تھا۔ جو انھوں نے پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کی نگرانی میں ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا۔ بعد میں مزید اضافوں اور ترامیم کے بعد اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اس پہلے تحقیقی کام کی ستائش کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا پر ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ کتاب ان کا پہلا تحقیقی کام ہے۔۔۔ یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے اہمیت تو رکھتی ہے ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے موضوع کے ساتھ پورا انصاف بھی کیا ہے۔ تمام ممکنہ ذرائع سے عزیز مرزا کی زندگی کے حالات اکٹھا کر کے انھیں خوش سلیقگی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے کارناموں کا بھی مفصل جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس دور کے سیاسی حالات اور علمی اور ثقافتی تحریکات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ایک مفید اور اہم تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔" (۷)

پروفیسر مغنی تبسم کی اس ناقدانہ رائے اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس کتاب پر کیے گئے جامع تبصرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" کتاب حقیقت میں اپنے دور کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں عزیز مرزا کے احوال زندگی کے ساتھ اس دور کے ہندستان کی سیاسی و سماجی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

کسی شخصیت کے سوانح میں شخصیت کے حالات زندگی، اس کی سیرت، اس کی خدمات اور کارنامے وغیرہ ہوتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی سوانح چار حصوں میں لکھی ہے۔ پہلا حصہ عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں نسل، آباد و اجداد، خاندان پیدائش، نام، گھریلو ماحول، ابتدائی

ملتا ہے جو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے فرزند تھے اور عزیز مرزا کا پدری سلسلہ اٹھارویں پشت میں ظہیر الدین بابر سے ملتا ہے اور بابر کی پشت میں تیمور اور چنگیز خاں کے سلسلے ملتے ہیں۔ عزیز مرزا کے پر دادا مرزا جمیل بیگ خاں نظام الملک آصف جاہ کے ہم راہ آئے تھے۔ عزیز مرزا کے دادا صفدر بیگ اپنی جراءت اور انتظامی صلاحیتوں کی بنا انگریزوں کے پاس قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے محمد عزیز مرزا کے والد مرزا وزیر بیگ پہاسو ضلع علی گڑھ کے نواب ممتاز الدولہ سر محمد فیض علی خاں کے مہتمم و منتظم تھے۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی دوسری بیوی صفیہ بیگم سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا عزیز مرزا تولد ہوئے۔

عزیز مرزا کے تاریخ پیدائش کے بارے میں مختلف اختلافات پیش کرنے کے بعد عزیز مرزا کے فرزند محمد سجاد مرزا سابق معتمد تعلیمات سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ عزیز مرزا کی تاریخ پیدائش مئی ۱۸۶۵ء ہے۔ تحقیق میں تاریخ پیدائش کے تعین کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیوں کہ اس سے شخصیت کے دور کا صحیح طور پر تعین ہوتا ہے اور دیگر واقعات کی صداقت بھی طے ہوتی ہے چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے وقار الملک، طالبِ علی، شمس الدین نجم، قمرالدین بدایونی، مانک راؤ، وٹھل راؤ وغیرہ کے حوالوں سے عزیز مرزا کی صحیح تاریخ پیدائش کے تعین کی کوشش کی ہے۔ عزیز مرزا کے نام کی تفصیلات بتاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ عزیز مرزا کا اصلی نام مرزا مصطفیٰ بیگ تھا۔ ان کے بڑے بہنوئی محمد علی ظفریاب خاں پیار سے انھیں "عزیز میاں" اور بعد میں عزیز مرزا پکارنے لگے۔ اس طرح ان کا عزیز مرزا مشہور ہو گیا۔

عزیز مرزا کی پرورش اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ بچپن ہی میں عزیز مرزا کے سر سے ان کی ماں کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ لہٰذا ان کے والد مرزا وزیر بیگ نے ملازمت کی مصروفیات کے باوجود ان کی اچھی دیکھ بھال کی وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ لہٰذا وہ عزیز مرزا کو قرآن پڑھنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ جب عزیز مرزا کی عمر چار سال چار ماہ چار دن ہوئی تب مرزا وزیر بیگ نے نہایت دھوم دھام کے ساتھ اپنے فرزند کی تسمیہ خوانی پڑھائی اور ان کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا مرزا وزیر بیگ ریاست ملک پور سے دہلی آکر زیادہ مدت تک مقیم رہے تو انھوں نے عزیز مرزا کا داخلہ بھی دہلی میں مکتبہ جیجتش خاں میں کروا دیا۔ جہاں

محمڈن کے لفظ کا رواج تھا۔ خود مسلمانوں نے اس لفظ کو اپنے واسطے پسند نہیں کیا تھا۔ چناں چہ سر سید نے اپنے کالج کا نام ہندستانی "مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ" رکھا۔ ۔ ۔ مابعد کی تحریکوں میں یہ رجحان عام رہا اور بجائے "محمڈن" کے "مسلم" اسلامی لفظ زیادہ تر مروج ہوئے۔ بعد میں مسلم یونیورسٹی کی کمیٹی نے اس عظیم الشان درس گاہ کا نام "مسلم یونیورسٹی" تجویز کیا۔" (۱۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی تعلیمی پیش رفت کے ساتھ ساتھ اس عہد کی علی گڑھ کی تعلیمی سرگرمیوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی اور لکھا کہ عزیز مرزا نے ۱۸۸۲ء میں انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ وہ اس وقت یونین کی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی زندگی کے اس دور کے واقعات تفصیل سے پیش کیے۔ عزیز مرزا نے ۱۸۸۷ء میں انگریزی اور تاریخ میں آنرز سے کے ساتھ بی۔اے کی ڈگری لی۔ اس وقت ہندستان میں وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے بہ یک وقت دو مضامین سے بی۔اے کیا تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ عزیز مرزا کی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی شادی ابراہیم بیگ کی بیٹی شرف جہاں بیگم سے ہوئی۔ ان کی شادی میں پڑھے گئے سہرے کی دست یابی سے پتہ چلا کہ یہ شادی ۱۸۸۷ء میں ہوئی تھی۔ یہ سہرا محمد یوسف پروپرائٹر اردو اخبار آکولہ برار نے لکھا تھا۔ سہرے کے اشعار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی سوانحی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ اس سہرے کے چند اشعار اس طرح ہیں:

گوند کر میں گل توحید سے لایا سہرا
قل ھواللہ احد پڑھ کر بنایا سہرا
موتیوں کا کوئی یاقوت کا لایا سہرا
میں نے گلہائے مضامین کا بنایا سہرا
مصر میں حضرت یوسف سے تھی کچھ چھیڑ چلی
پر عزیز آپ کو یوسف نے بندھایا سہرا (۱۱)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی پہلی ملازمت کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

بھی رہے۔ حضور نظام کی قدردانی سے عزیز مرزا ۱۹۰۶ء میں حیدرآباد واپس آئے اور وہ ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے۔ عدالتی کاموں کے لیے نئے ہونے کے باوجود عزیز مرزا نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے نام کمایا اور اعلیٰ حضرت نے انھیں قدردانی کے طور پر سابقہ عہدہ پر ایک سال کے لیے مامور فرمایا۔ عزیز مرزا کے چاہنے والے اس خوش خبری سے خوش ہوئے۔ "دکن ریویو" کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں نے جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں عزیز مرزا کو خراج پیش کرتے ہوئے ایک طویل قصیدہ شائع کیا۔ اس نایاب قصیدہ کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے من وعن شائع کیا۔ اس قصیدہ کی اشاعت سے عزیز مرزا اور ظفر علی خاں دونوں کے خلاف سازش ہونے لگی تھی۔ کیوں کہ یہ دونوں شمالی ہند کے رہنے والے تھے اور حیدرآباد میں آکر نام کما رہے تھے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ ۱۹۰۵ء میں عزیز مرزا کی اہلیہ شرف جہاں بیگم کا انتقال ہوگیا۔ جس سے ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگیا۔

سیلاب رودِ موسیٰ کے بعد راحت و امدادی کاموں کے سلسلے میں عزیز مرزا کی خدمات یادگار تھیں۔ چناں چہ اس مشکل گھڑی کے واقعات کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کافی تفصیل سے بیان کیا ہے اور عزیز مرزا کی سوانح کے ساتھ ساتھ اس دور کے حیدرآباد کی تاریخ کے باب بھی کھلتے جا رہے ہیں۔ رودِ موسیٰ کی طغیانی کی بھیانک تصویر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

> "۲۸ / ستمبر ۱۹۰۸ء کی رات قیامت کی رات تھی۔ تین دن رات کی موسلادھار بارش نے رودِ موسیٰ کو اپنے طاس سے باہر کر دیا۔۔۔ مغرب کے وقت غل مچا کہ سیلاب آیا سیلاب آیا ندی کے دونوں کناروں کے رخ بلکہ دور دور محلوں کے مکانات بھی خالی ہو چکے تھے۔۔۔ لوگ مال و دولت چھوڑ چھاڑ کر گھروں کو قفل لگا کر جدھر سینگ سمائے بھاگے چلے جاتے تھے۔ امیر اور غریب کا امتیاز باقی نہ رہا پردہ نشین بیگمات جن کی پرچھائیں تک غیروں نے نہ دیکھی بدحواس بے نقاب سربازار ٹھوکریں کھاتی گرتی پڑتی متاع جان کو سنبھالتے بھاگی چلی جاتی تھیں ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ قیامت کا سا عالم تھا۔ نام پلی، لال ٹیکری، فلک نما، غرض کوئی

بلکہ سطح کا محلہ ایسا نہ تھا جہاں تل دھرنے کو جگہ مل سکے۔۔۔ پانی تھمتے تھمتے تھما تو نعشیں ریتی، کیچڑ، شہتیروں کے انبار ڈھے ہوئے مکانوں کے نیچے اور اکھڑے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں میں پھنسی پڑی تھیں۔ بے نوا بے بس، زندوں کی حالت، مردوں سے بھی بدتر سکڑے، سکڑا منھ فق، سینہ شق روتے بلبلاتے پھرتے تھے۔۔۔ موت کی ان ویرانیوں میں عزیز مرزا تن تنہا نعشوں میں زندوں کو ٹٹولتے پھر رہے تھے۔" (۱۳)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے رودِ موسیٰ کی طغیانی کے بعد ہوئے امدادی کاموں کے سلسلے میں لکھا کہ عزیز مرزا اور دوسرے نوجوانوں نے "عزیز والنٹیر کور" کے نام سے ایک راحت کاری کام شروع کیا۔ اس میں عزیز مرزا کے صاحب زادے ابوسعید مرزا (نواب سعید جنگ بہادر) کی خدمات بھی تھیں۔ حکومت کی جانب سے بھی ایک ریلیف کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ہر محکمہ سے لائق اور محنتی عہدے دار کا انتخاب کیا گیا۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد کے حکم سے عزیز مرزا کو کمیٹی کا معتمد بنایا گیا اور انھیں پلوں اور سرکاری عمارات کی مرمت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ حکومت برطانیہ نے عزیز مرزا کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں "تمغۂ قیصرِ ہند" عطا کیا۔ محکمہ فینانس میں ایک انگریز عہدے دار واکر آیا تھا۔ جسے ابتدا ہی سے عزیز کی شہرت نہیں بھاتی تھی۔ ادھر مقامی طور پر بھی لوگ عزیز مرزا سے حسد کرنے لگے تھے۔ چناں چہ واکر کے ذریعہ حضور نظام سے کھلوا کر ریلیف کے کاموں میں بے قاعدگی کا الزام لگا کر عزیز مرزا کو نیچا دکھانے کی مذموم کوشش کی گئی۔ عزیز مرزا کے خلاف کی گئی اس سازش کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ظفر علی خاں نے اسی زمانے میں "واکر نامہ" کے نام سے ایک معرکۃ الآرا نظم لکھی تھی۔ یہ نظم "پیسہ اخبار" لاہور میں چھپی تھی۔ بعد میں حسن الدین احمد نے روزنامہ سیاست ۳۱/ مئی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا تھا اس کا عنوان "واکر نامہ، ایک اردو شاعر کی بیباکی" شائع کیا تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے روزنامہ سیاست کی فائل سے لے کر یہ نظم اس کتاب میں شائع کی جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

"نہ بنگالی سے گھبرا اور نہ مدراسی کی پروا کر
مگر سجدے میں جھٹ گر پڑ نظر آئے اگر واکر
عنانِ اختیار اس ملک کی ہے اس کے ہاتھوں میں
حکومت کر رہا ہے باہزاروں کر و فر واکر
قیامت تک نہ ہوگی ختم توسیع اس کی مدت کی
رہے گا حیدرآباد دکن میں عمر بھر واکر" (۱۴)

"واکر نامہ" کی اشاعت کو لوگوں نے عزیز مرزا کی کارستانی سمجھا۔ عزیز مرزا مہاراجہ سرکشن پرشاد سے کہلوا کر عبدالحلیم شرر کو دوبارہ لکھنؤ سے بلا کر ملازمت پر بحال کروایا۔ یہ تمام واقعات عزیز مرزا کے مخالفین کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔ چناں چہ ان کے خلاف سازش کی گئی اور اعلیٰ حضرت کو ایک خط کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ ولی عہد میر عثمان علی خاں عزیز مرزا کے ساتھ مل کر اعلیٰ حضرت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ اس خط کو پڑھ کر اعلیٰ حضرت برہم ہوئے اور یہ فرمان صادر کیا کہ عزیز مرزا، ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر اور صفی الدین بدر چاروں کو شہر بدر کیا جائے۔ اخراج کا پروانہ ملتے ہی ایک دن کے اندر عزیز مرزا نے ذمہ داریاں دوسروں کو سونپ کر واپسی کا سفر اختیار کیا اور علی گڑھ روانہ ہوگئے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بڑی تحقیق کے ساتھ سرکاری فائیلو کے ریکارڈ ڈھونڈتے ہوئے عزیز مرزا کے اخراج کے حکم نامے اس کتاب میں شامل کیے اور عزیز مرزا کے وہ خطوط بھی شامل کیے جو انھوں نے اپنی بے گناہی میں دوست احباب کو لکھے تھے۔ یکم نومبر ۱۹۰۹ء کو ان کی اکلوتی صاحب زادی کا انتقال ہوگیا تھا جس کی خبر انھوں نے خط کے ذریعہ منجھلے صاحب زادے نواب سعید جنگ بہادر کو دی۔

عزیز مرزا کے جانے کے بعد اعلیٰ حضرت کو ان کی بے گناہی کا احساس ہوا اور اس کی تلافی کے لیے انھوں نے عزیز مرزا کے چاروں بیٹوں کو وظیفہ جاری کیا۔ اس بارے میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"ایک فرمان کے ذریعہ حضور نظام ان کے چار لڑکوں (محمد سجاد مرزا، محمد بابر مرزا، محمد

حامد مرزا اور محمد مرزا) کو ۵۰۰۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ جاری کیا جو ان کو (۲۱) برس کی عمر تک پابندی سے ملتا رہا۔ جناب سجاد مرزا جو عزیز مرزا کے تیسرے صاحب زادے ہیں انھوں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ جب وہ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں کی خدمت میں باریاب ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے ان سے برسبیل تذکرہ یہ ارشاد فرمایا کہ تمھارے والد پر ایک بہتان عظیم لگایا گیا تھا۔" (۱۵)

عزیز مرزا کے حیدرآباد سے اخراج کو نقصان عظیم قرار دیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ جذباتی انداز میں لکھتے ہیں کہ:

"حیدرآباد دکن کے عوام عزیز مرزا کے اخراج کی خبر سن کر بہت ملول ہوئے۔ حیدرآباد میں بڑے بڑے لوگ آئے اور گئے مگر صرف دو شخصیات ایسی ہیں جن کو عام مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہوئی۔ ان میں سے ایک نواب محسن الملک ہیں اور دوسرے عزیز مرزا ان دونوں حضرات کی حیدرآباد سے رخصت کے وقت کہرام سا مچ گیا تھا ہزاروں آدمیوں کا مجمع نامپلی اسٹیشن کے باہر و اندر جمع تھا سب زار و قطار رو رہے تھے یہ ان لوگوں کی ہر دل عزیزی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔ خصوصاً حیدرآبادی عوام عزیز مرزا کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ ان کی بھلائیاں ان کے کارنامے اور ان کے احسانات ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔" (۱۶)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ عزیز مرزا اپنی بیٹی کی وفات کے بعد بیمار رہنے لگے تھے۔ دردِ گردہ کی وجہ سے صحت دن بہ دن گرتی جارہی تھی۔ مسلم لیگ کے دفتر کے ایک حصہ میں رہنے لگے۔ ۲۶/ فروری ۱۹۱۲ء کو ان کی صحت بگڑ گئی اور ۱۱ بجے دن صرف (۴۰) سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چیتاپور روڈ قبرستان میں دفن ہوئے ان کے مزار کی تصویر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کتاب میں عزیز مرزا کی مختلف ایام کی تصاویر کے ساتھ شائع کی ہے۔

عزیز مرزا اپنے دور کی ایک ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ ان کی بے وقت موت پر مشہور شخصیات نے تعزیت کی اور اردو کے مشہور رسائل اور جرائد نے تعزیتی نمبر نکالے۔ شاعروں نے تعزیتی اشعار کہے۔ عزیز مرزا کی وفات پر مولوی عبدالحق نے ان الفاظ میں اظہار تعزیت کیا:

"آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن ایسے شخص کی موت جس سے دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کی بہبودی وابستہ ہو جس پر قوم کی رہبری اور سرداری کے لیے ملک کی نظر انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسے توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہو ہزار حسرت و افسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔" (۱۸)

عزیز مرزا کی وفات پر مختلف شعرا نے جو انھیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا اسے بھی تفصیلی طور پر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی کتاب میں جمع کیا ہے رسالہ "زمانہ" میں سفیر کاکوری کے چند قطعات عزیز مرزا کی یاد میں شائع ہوئے تھے انھیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پیش کیا ہے:

قومیت کا کچھ اب مزا نہ رہا — ایک ہم درد قوم تھا نہ رہا
اپنی تقدیر ہی مخالف ہے — اب کسی کا ہمیں گلہ نہ رہا
رہبر و دستگیر و ہادی راہ — کارنامے رہیں گے اس کے گواہ
قوم کی کارکن جماعت میں
ایک ہی تھا عزیز مرزا آہ (۱۸)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی اس سوانحی کتاب میں عزیز مرزا کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی اولاد کی تفصیلات بھی بڑے محققانہ انداز میں دی تھیں اور لکھا کہ مرحوم کے چھ لڑکے محمد احمد مرزا، محمد ابوسعید مرزا (نواب سعید جنگ بہادر) محمد سجاد مرزا، محمد بابر مرزا، محمد حامد مرزا، محمد مرزا اور ایک لڑکی عزیز جہاں بیگم تھی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "فرزندانِ محمد عزیز مرزا" کے نام سے ایک گروپ فوٹو بھی شامل

کیا ہے جس میں عزیز مرزا کے چھ بیٹے شیروانی اور ٹوپی زیب تن کیے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی سوانحی کتاب میں "شجرہ خاندان چغتائی مغل" کے عنوان سے عزیز مرزا کا مفصل شجرہ پیش کیا ہے اور چنگیز خاں اور تیمور سے شجرہ کا آغاز کرتے ہوئے عزیز مرزا تک پشتوں کا سلسلہ بیان کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جس میں چغتائی نسل کے سلسلوں کے احوال معلوم ہوتے ہیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے حالات زندگی اور ان کی اولاد کے بارے میں تفصیلات پیش کرنے کے بعد کتاب کے دوسرے حصہ میں عزیز مرزا کی شخصیت اور سیرت بیان کی ہے۔ کسی شخصیت کی سوانح میں اس کی سیرت اخلاق و کردار اور اس کی زندگی گزارنے کے طور طریق اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس سے شخصیت کے محاسن و معائب سامنے آتے ہیں عزیز مرزا کا سراپا بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "محمد عزیز مرزا قد آور آدمی تھے۔ پیشانی بلند، مونچھیں داڑھی سے ملی ہوئیں داڑھی بھرے ہوئے چہرے پر بہت زیب دیتی تھی۔ ان کی آنکھیں کسی قدر ابھری ہوئی تھیں کلائیاں چوڑی اور مضبوط شخصیت انتہائی پُر رعب تھی۔ جس سے بھی ملتے وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔۔۔ انتقال کے وقت سر کے بال پوری طرح سفید نہیں ہوئے تھے۔ لباس میں عموماً شیروانی اور پتلون حسب رواج پہنا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ترکی ٹوپی ضرور سر پر رہتی تھی۔ یہ دفتری لباس تھا دربار جاتے وقت سر پر دستار ہوتی تھی۔" (۱۹)

عزیز مرزا کا سراپا پڑھنے کے بعد کتاب میں شامل ان کی تصویر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی ہو بہو لفظی تصویر کھینچی ہے عزیز مرزا کی شخصیت کے دوسرے پہلو بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ وہ زندہ دل انسان تھے۔ وقت کے پابند تھے، غیر ضروری کسی پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔ ملازمین سے اخلاق سے پیش آتے تھے، بچوں سے محبت تھی ان کے شور شرابے کو برداشت کر لیتے تھے۔ لوگوں سے انھیں ہمدردی رہتی تھی۔ اسی بناء پر اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے انھوں نے مولانا ظفر علی

خاں ، امجد حیدر آبادی ، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور عبدالغفور شہباز کا مختلف محکموں میں تقرر کرایا ، ملازمت کے سلسلے میں مصروف رہنے کے باوجود انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی دھیان دیا۔ وہ بچوں کو مختلف پیشوں میں ترقی کرتا دیکھنا چاہتے تھے ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا مقصد کردار سازی تھا۔ مروت ، خودداری ، غنا ، زندہ دلی وغیرہ وغیرہ مرزا کی شخصیت کے وہ نمایاں پہلو ہیں جنھیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مختلف واقعات کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ عزیز مرزا کی شخصیت کے مذہبی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> " عزیز مرزا روزہ کے بڑے پابند تھے۔ کہیں اور کسی حالات میں ہوں نماز قضا نہیں ہوتی تھی۔ مذہب کے بڑے پابند تھے ، جس کی بنا پر ان کی تمام زندگی ایک آئینے کی طرح صاف شفاف نظر آتی ہے۔ ۔ ۔ وہ کورٹ آف وارڈس مقرر کیے گئے یہاں اس واقعہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ حیدر آباد کی اس خدمت کی تنخواہ ماہانہ چار سو روپے تھی۔ جس کو لینے سے انھوں نے انکار کیا اس کی وجہ یہ بتائی کہ یتیموں کا پیسہ لینا خلاف اصول اسلام ہے۔ " (۲۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانحی کتاب کے تیسرے حصے میں "قومی اور سماجی خدمات" کے عنوان سے عزیز مرزا کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا اور بتایا کہ حیدر آباد میں ملازمت کے (۲۲) سال اور علی گڑھ کے قیام میں انھوں نے ملک و ملت کی بھلائی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ عزیز مرزا کی غیر معمولی ذہانت اور قوت کارکردگی کی بدولت وہ حیدر آباد میں بے حد مقبول تھے اور کئی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ ذیل کی فہرست سے ان کی ہمہ تن مصروف زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

" (۱) صدر کمیٹی دائرۃ المعارف ، (۲) صدر کمیٹی آصفیہ لائبریری ، (۳) کمیٹی اصلاح ٹپہ خانہ جات ، (۴) کمیٹی جاگیرداررانِ ریاست کی جبری تعلیم ، (۵) محلہ واری سماجی کام کی تنظیمیں ، (۶) کمیٹی تعین اختیارات امرائے بائے گاہ ، (۷) خط نستعلیق اور اردو ٹائپ کی اصلاح ، (۸) سررشتہ تعلیمات کی نصابی کمیٹی ، (۹) انجمن سرمایہ تعلیمی ، (۱۰) کمیٹی اصلاحات تعلیمی ، (۱۱) کمیٹی احیائے طب یونانی ، (۱۲) کمیٹی متعلقہ سیلاب رودِ

موسیٰ، (۱۳) نیگ من امپرومنٹ سوسائٹی، (۱۴) صدر نظام کلب ۔" (۲۱)

حیدر آباد میں مصروف ترین ایام اور سماجی خدمت میں وقت گزارنے کے بعد علی گڑھ کے قیام میں بھی وہ مصروف بہ کار رہتے تھے۔ مسلم لیگ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی ترجمان تھی۔ مسلم لیگ کے لیے عزیز مرزا کی خدمات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا نے اپنے وسیع تجربہ اور زبردست قوتِ عمل سے مسلم لیگ کی ساکھ قائم کرنے میں نمایاں کام کیا۔ انھوں نے پورے ملک کا دورہ کر کے لیگ کو مسلمانوں میں مقبول بنایا اور اس کے دائرہ عمل کو عمومی استحکام دیا۔ سیاست میں ان کا مسلک یہ تھا کہ لیگ کل ہند مسائل میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے البتہ مسلمانوں کے مخصوص قومی و تہذیبی مسائل میں اپنی جدوجہد کی راہ علاحدہ رکھے۔ عزیز مرزا نے مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیا۔" (۲۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ عزیز مرزا کی دیگر سماجی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عزیز مرزا کو مسلم یونیورسٹی سے گہری دل چسپی و وابستگی تھی۔ یونیورسٹی کی بقا کے لیے انھوں نے بہت کام کیے۔ ۱۹۰۳ء میں اردو کی ترقی کے لیے قائم ہونے والی انجمن ترقی کے وہ معتمد بھی رہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ علوم مشرقیہ کے امتحانات کو پنجاب کے علاوہ حیدر آباد میں منعقد کرانے کی سعی ہے۔ مدرسہ دارالعلوم کو سرکاری امداد دلا کر انھوں نے علوم مشرقیہ کے امتحانات کا آغاز کراتے ہوئے حیدر آبادی طلبا کو ان امتحانات کے لیے پنجاب کے سفر سے بچایا۔ ان امتحانات کے نصاب کی تیاری کے لیے شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر کو مامور کیا۔ ۱۸۸۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے حیدر آباد میں ہوئے جلسہ کے کامیاب انعقاد کے لیے عزیز مرزا نے کافی اہتمام کیا سر اکبر حیدری کو توجہ دلا کر مدرسہ نظامیہ کی امداد کو دو سو بڑھا کر دو ہزار کیا۔ رودِ موسیٰ کی طغیانی میں عزیز مرزا کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس موقع پر ان کی خدمات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

"لاشوں کو منتقل کرنے اور بڑے بڑے ملبوں سے لاشوں کو نکالنے کا معقول انتظام کیا۔

انجینئرس پلوں کی اور دوسری عمارتوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ عزیز مرزا ان کا معائنہ کرتے جاتے تھے اور رات دن اس اصلاحی کام میں مصروف رہتے ہوئے بھی روزانہ اس کی روئداد لکھتے تھے۔ جس کو ٹائپ کروانے کے بعد سررشتہ کے ناظم کے پاس بھجوایا جاتا تھا۔ عزیز مرزا نے تحریک پیش کر کے تمام سرکاری ملازمین کو ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دلادی تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہونے پائیں۔" (۲۳)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ عزیز مرزا کی خدمات بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ

"وہ علم دوست تھے۔ ان کے پاس اکثر اہلِ علم جمع رہتے تھے۔ مصنفوں اور مولفوں کی مدد کرتے تھے۔ انھوں نے ترجمہ کا ایک مرکز قائم کرایا تھا جو آگے چل کر "دارالترجمہ" کی شکل اختیار کر گیا۔ یونانی طریقہ علاج کے فروغ کے لیے اور طبابت یونانی میں تنظیم و باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے نظماء کا ایک بورڈ قائم ہوا تو اس کے معتمد عزیز مرزا بنائے گئے۔ وہ "انجمن مواخاۃ المسلمین" کے صدر بنائے گئے تھے۔ یہ انجمن قرآن مجید کے تراجم شائع کرتی تھی۔ ان کے زمانے میں "انجمن ترقی نسواں" بھی قائم ہوئی تھی۔ بیڑ کی کلکٹری کے دوران عزیز مرزا ایک انجمن "سرمایہ تعلیمی" قائم کی۔ جس کے ذریعہ صاحب حیثیت اصحاب کے چندوں سے علی گڑھ کے نادار طالب علموں کی مدد کی جاتی تھی۔ عزیز مرزا نے مختلف طبقوں میں محبت و اتفاق قائم کرنے کے لیے "انجمن اتفاق دکن" قائم کی تھی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز کی خدمات بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ درحقیقت "ذات میں انجمن تھے۔ ان کی ہر دل عزیزی کا یہ اثر ہوا کہ ریاست حیدرآباد کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کے ہاتھ میں آگیا مدارالمہام وقت کو عزیز مرزا پر اس قدر اطمینان تھا کہ ریاست کے بہت کم کام ایسے تھے جو بغیر ان کے مشورے کے عمل میں آتے تھے۔" (۲۴)

عزیز مرزا کی قومی و سماجی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ مرحوم حیدرآباد کی تمام قومی ملکی اور تمدنی تحریکوں کے روح رواں تھے اور اس کا سب سے قوی ثبوت یہ ہے کہ جب سے مرحوم حیدرآباد سے گئے ہیں حیدرآباد جیسا شہر سنسان ہوگیا اور کسی قسم کی تحریک کا نام تک بھی زبان پر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس دم کے ساتھ تھا جو خود علمی ذوق اور قومی درد رکھتا تھا اور دوسروں میں اس احساس کی قدر کرتا تھا"۔ (۲۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی سماجی خدمات کو بیان کرتے ہوئے بیان کردہ سوانحی شخصیت کی مداحی کی ہے الطاف حسین حالی کی سوانحی کتاب "یادگار غالب" کو بھی ناقدوں نے "مدلل مداحی" قرار دیا تھا۔ اسی طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ سوانحی کتاب "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" عزیز مرزا کی مدلل مداحی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے دل میں عزیز مرزا کی قدر و منزلت تھی وہ انھیں بچپن سے ہی آئیڈیل مانتے تھے چناں چہ ان کی سوانح لکھتے ہوئے انھوں نے عزیز مرزا کی شخصیت اور ان کی خدمات کے حیثیت پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ ان کی علمی اور سماجی خدمات میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو عزیز مرزا کی شخصیت کا ایک بھی منفی پہلو دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی انھوں نے ان پہلوؤں کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ نقادوں نے جو خامی حالی کی سوانحی کتابوں میں نکالی تھی وہ خامی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس سوانحی کتاب میں بھی نکالی جاسکتی ہے۔ سکے کے دو رخ کی طرح انسان کی زندگی کے بھی دو پہلو مثبت اور منفی ہوتے ہیں، لیکن ہر بڑے انسان کی زندگی کے وسیع تر مثبت پہلو کے پیچھے منفی پہلو چھپ جاتے ہیں۔ شاید یہی بات عزیز مرزا کی زندگی پر بھی صادر آتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے جس عمیق گہرائی اور تحقیق سے عزیز مرزا کے کارنامے بیان کیے ہیں لیکن ان کارناموں کے درمیان انھیں عزیز مرزا کی شخصیت کے منفی پہلو دکھائی نہیں دیے۔ اس کے باوجود عزیز مرزا کی یہ سوانحی کتاب اور اس میں بیان کردہ ان کی سماجی خدمات نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور انھیں حرکت و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سوانحی کتاب "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" کے آخری

حصے میں عزیز مرزا کے علمی کارنامے بیان کیے ہیں اور عزیز مرزا بہ حیثیت مترجم، سوانح نگار اور انشا پردازان کے علمی کارناموں کو بیان کیا ہے۔ عزیز مرزا کو بہ حیثیت مترجم پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ ان کے دو ترجمے "گلگشت فرنگ" اور "وکرم اروسی" ہیں۔ گلگشت فرنگ نواب مہدی حسین (فتح نواز جنگ بہادر) کا روزنامچہ ہے جو انھوں نے اپنے انگلستان کے سفر کے دوران مرتب کیا تھا عزیز مرزا کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو انھوں نے ۱۸۸۹ء میں مفید عام پریس سے شائع کردایا۔ بہ حیثیت مترجم عزیز مرزا کا دوسرا کارنامہ "وکرم اروسی" ہے۔ سنسکرت میں اسے کالی داس نے لکھا تھا۔ عزیز مرزا (۶۸) صفحات کا طویل مقدمہ لکھا یہ ترجمہ ۱۹۰۷ء میں مطبع شمسی آگرہ سے شائع ہوا۔ عزیز مرزا کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فن ترجمہ کی مبادیات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور لکھا کہ:

"ترجمے میں بنیادی بات یہ ہوتی ہے کہ اصل مضمون اور ترجمے میں فرق ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ مفہوم و معنی میں فرق نہ آئے ترجمے میں ایک زبان کا مفہوم دوسری زبان میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اصل مضمون پر پہلے حادی ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر زبان کا روزمرہ اور محاورہ الگ ہوتا ہے۔ کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ ہم اس زبان کے روزمرہ اور محاورے سے واقف ہو جائیں ورنہ صحیح طور پر ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔" (۲۶)

ترجمے کے فن کے تعلق سے قمر رئیس نے بھی بنیادی اصول بیان کیے ہیں وہ اپنی کتاب ترجمہ کا فن میں لکھتے ہیں:

"ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے۔ جو بڑی مہارت ریاضت چاہتا ہے ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لیے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کم یاب ہوتی ہے۔ ترجمے بہت ملتے ہیں۔ اچھے ترجمے خال خال ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل

بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔" (۲۷)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے آلِ احمد سرور کے حوالے سے لکھا کہ:

"جن لوگوں نے بیسویں صدی میں مترجم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ان میں مرزا بادی رسوا، خلیفہ عبدالحکیم، حکیم احمد حسین، عنایت اللہ دہلوی، نظم طباطبائی، عزیز مرزا، سجاد حیدر، نیاز فتح پوری، لطیف الدین احمد اکبر آبادی، ظفر علی خاں، خواجہ منظور حسین ہاشمی فرید آبادی، پنڈت کیفی، نواب جعفر علی خاں اثر، غلام رسول مہر، اختر رائے پوری، عزیز احمد، منور لکھنوی، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، شاہد احمد دہلوی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔" (۲۸)

ترجمہ کے فن اور مشہور ترجمہ نگاروں کے بیان کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی ترجمہ نگاری کے بارے میں لکھا کہ وہ انگریزی اور اردو ادب دونوں پر حاوی تھے۔ انھوں نے قلم برداشتہ ترجمہ کیا ہے ان کے ترجمے پر اصل تصنیف کا گمان ہوتا ہے انگریزی اصلاحات اور الفاظ کا اردو میں نہایت موزوں ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے اس قابل تقلید ترجمے سے تصنیف اور مصنف دونوں کی اہمیت واضح کی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس ترجمہ سے مختلف حوالے پیش کرتے ہوئے عزیز مرزا کو ایک کامیاب مترجم کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

عزیز مرزا کے دوسرے ترجمہ "وکرم اروسی" کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈرامہ کے فن اور اردو میں اس کی روایت کی تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے۔ جو موقع کے اعتبار سے غیر ضروری اور مقالہ کی ضخامت بڑھانے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ عزیز مرزا کو بہ حیثیت مترجم پیش کرنا مقصود تھا۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈرامہ کے سرسری تعارف کے بجائے اس کی تفصیلات پیش کر دیں بعد میں انھوں نے ڈراموں کے ترجموں کی تفصیلات پیش کیں۔ عزیز مرزا کے ترجمہ میں شامل مقدمہ کی تفصیلات سے

کالی داس کے اس ڈرامہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اس ترجمہ سے چنندہ جملے لیتے ہوئے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ محمد عزیز مرزا نے سلیس زبان میں بامحاورہ ترجمہ کیا ہے عزیز مرزا کے اس ترجمہ کی ستائش کرتے ہوئے اردو کے مشہور افسانہ نگار پریم چند نے لکھا کہ:

"اردو زبان میں بجز شکنتلا کے ایک ٹوٹے پھوٹے ترجمہ کے ابھی تک ان میں سے کسی ایک کا بھی ترجمہ نہیں ہوا خوشی کا مقام ہے کہ اردو کے مشہور جادو نگار مولوی محمد عزیز مرزا صاحب نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے اور کالی داس کے مشہور ناٹک "وکرم اروسی" کا ترجمہ اردو پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ مرزا صاحب پختہ کار انشا پرداز ہیں اور آپ کا نام اردو دنیا میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اس ترجمہ کی وقعت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ ایک مسلمان انشا پرداز کے قلم سے اس کا وجود ہوا اگر کسی ہندو نے یہ کام انجام دیا ہوتا تو غالباً اس کے ہندو پن کی وجہ سے یہ کتاب اہلِ اسلام میں اتنی عام نہیں ہو سکتی جس کا اسے حق حاصل ہے۔" (۲۹)

عزیز مرزا کی ترجمہ نگاری کے بارے میں مختلف ماہرین کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ مولوی عزیز مرزا سنسکرت کے کوئی بڑے عالم نہ تھے بلکہ سنسکرت میں تھوڑی بہت شد بد رکھتے تھے اور "وکرم اروسی" کے ترجمے کے لیے ان کو انگریزی ترجمے سے استفادہ کرنا پڑا تھا۔ "وکرم اروسی" کے مقدمے میں اس کتاب کے ترجمے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے عزیز مرزا لکھتے ہیں:

"اس کام کی ضرورت مجھے اس وجہ سے اور بھی محسوس ہوئی کہ زمانے میں ملک کی بدنصیبی سے ہندستان کی بڑی قوموں ہندو مسلمانوں میں سخت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور میرے خیال میں اگر کوئی تدبیر اس اختلاف کو روکنے یا اس کے بجائے ہمدردی پیدا کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ ایک دوسرے کے لٹریچر سے مستفیض ہونے کا موقع جو فارسی لٹریچر کے دونوں قوموں کی ترقی دماغی و دنیوی کے لیے لازمی ہونے کی وجہ سے تھا باقی نہیں رہا"۔ (۳۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ "وکرم اروسی" ترجمہ میں شامل عزیز مرزا کا مقدمہ اہمیت اختیار کر گیا تھا چناں چہ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد نے "سنسکرت ڈراما" کے عنوان سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ عزیز مرزا کے علمی کارنامے کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بیسویں صدی کے ایک اہم مترجم کے احوال سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے اور اپنی تصنیف میں شخصیت متذکرہ کی زندگی کے ایک اور پہلو کو بیان کیا ہے۔ عزیز مرزا کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کو بہ حیثیت سوانح نگار پیش کیا ہے۔ سوانح نگاری میں ان کی تخلیق "سیرۃ محمود" ہے یہ دراصل خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں وزیر سلطنت بہمنیہ کی سوانح عمری ہے جن کو عزیز مرزا نے ۱۸۹۶ء میں مطبع مقتن دکن حیدر آباد سے چھپوا کر شائع کیا تھا اس سوانحی کتاب کی تمہید میں وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے عزیز مرزا لکھتے ہیں:

"اعلیٰ درجے کے اخلاق کے نمونے جیسے تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ ان کی نظیر بہت ہی کم کسی دوسری قوم کی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس بیش بہا میراث تک پہنچنے میں ایسی دشوار گزار گھاٹیاں طے کرنی پڑتی ہیں کہ ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی اور اس لیے اس زمانے میں یہ بہت بڑا قومی فرض ہے کہ مشاہیر اسلام کے واقعات زندگی کو ایسے پیرایہ میں لکھا جائے جو عام دل چسپی کا باعث ہو۔ اس مختصر رسالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ عماد الدین محمود گاواں وزیر سلاطین بہمنیہ اور اس کے زمانے کی سچی تصویر دکھا کر مسلمان نوجوان کے لیے عموماً اور اہلِ دکن کے لیے خصوصاً ایک نمونہ پیش کیا جائے کرنل میڈوز ٹیلر نے اپنی تاریخ ہند میں اعتراف کیا ہے کہ محمود گاواں جیسے اشخاص دنیا میں بہت کم گزرے ہیں۔ اگر اس کتاب کے مطالعے سے کسی ایک شخص کو بھی اس بات کی ترغیب ہوئی کہ محمود گاواں کی اخلاقی برتری کو اپنی زندگی کا معیار بنائے تو مولف کی تمام محنت وصول ہو جائے گی۔" (۳۱)

سوانح نگاری کے عمومی مقصد کی طرح عزیز مرزا نے بھی محمود گاواں کی سوانح اصلاحی نقطہ نظر سے لکھی۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی اس سوانحی کتاب کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے محمود گاواں کی زندگی کے احوال عزیز مرزا کی زبانی پیش کیے اور ان کی سوانح نگاری کے طرز کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سوانح کی تعریف اور اردو ادب میں اس کی روایت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے عزیز مرزا کی سوانح نگاری الطاف حسین حالی کی سوانح نگاری سے تقابل کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا کہ:

"اردو ادب میں حالی کو ایک بہترین سوانح نگار مانا جاتا ہے ایسا نہیں ہے کہ حالی سے پہلے سوانح عمریاں نہیں لکھی جاتی تھیں لکھی تو جاتی تھیں لیکن سوانح نگاری کے تقاضوں کو ان میں پورا نہیں کیا جاتا تھا۔ انسان کو بہ حیثیت انسان کے ان سوانح عمریوں میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی یا تو اسے فرشتہ بنا دیا جاتا تھا یا اس میں ایسی غیر معمولی صفات دکھائی جاتی تھیں جو عام انسانوں میں نہیں ملتیں۔ اسے سوپرمین بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ یہ صرف داستانوں میں ممکن ہوسکتا ہے عام زندگی میں ممکن نہیں حالی نے اس روش کو ترک کیا اور جس کی بھی سوانح عمری لکھی اس کو ایک انسان کی طرح پیش کیا۔ جس میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہیں چند خامیاں بھی ہیں۔ عزیز مرزا نے بھی محمود گاواں کی سوانح عمری میں ایک انسان کو پیش کیا ہے۔" (۳۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی سوانح نگاری کے سلسلے میں لکھا کہ محمود گاواں نے جس طرح ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ مدارج طے کیے تھے اسی طرح کے حالات عزیز مرزا کی زندگی میں بھی پیش آئے تھے۔ محمود گاواں کے روپ میں انھیں ایک ہیرو نظر آیا تھا۔ سیرۃ المحمود کی زبان سلیس ہے۔ اس میں تنقیدی پہلو کم ہے محمود گاواں کی کمزوریوں اور لغزشوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے کتاب کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ صرف (۴۹) عنوانات کے تحت اس سوانح عمری کو مکمل کیا گیا ہے۔ عزیز مرزا نے طوالت سے پرہیز کیا اور اختصار میں یہ سوانح عمری لکھی ہے۔ بہ نسبت طویل سوانح کے اس مختصر سوانح کو پیش کرنا زیادہ دشوار ہے۔ اس

کے لیے صحیح قوتِ فیصلہ، تربیت یافتہ مذاق اور انتہائی ضروری باتوں کے انتخاب کی صلاحیت کی ضرورت ہے سارے مواد کو سمجھ کر اس کا لب لباب پیش کرنا ایسی بات ہے کہ جیسے سمندر کو کوزے میں سمو دیا گیا ہو۔ عزیز مرزا کی سوانح نگاری کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مزید لکھتے ہیں کہ:

"عزیز مرزا ایک عظیم آدمی تھے۔ انھوں نے ایک عظیم تر آدمی محمود گاواں کی تشریح سوانح عمری کی صورت میں پیش کی ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ شاعروں کی طرح سوانح نگار بھی بنتے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ عزیز مرزا نے سیرۃ المحمود کو اپنے دلی جذبات کا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ اس لیے اس میں صداقت ہی صداقت نظر آتی ہے۔۔۔ عزیز مرزا کی اس سوانح عمری کو پڑھنے کے بعد قاری سکونِ قلب محسوس کرتا ہے۔" (۲۳)

عزیز مرزا کی سوانح نگاری کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی ادبی شان بڑھانے کی کوشش کی ہے اور جس طرح عزیز مرزا نے "سیرۃ المحمود" میں محمود کی سیرت کے مثبت پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اس طرح عزیز مرزا کی سوانح میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی بھی سیرت کے مثبت پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی تحریروں سے جانب داری اور شخصیت سے دلی وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک نقاد کے فرائض نبھاتے ہوئے انھوں نے عزیز مرزا کا بہ حیثیت سوانح نگار مقام واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

عزیز مرزا کو بہ حیثیت انشا پرداز پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے لکھا کہ ان کے انشائیوں اور مضامین کا ایک مجموعہ "خیالاتِ عزیز" کے نام سے ان کے انتقال کے بعد ۱۹۱۲ء میں کانپور سے شائع ہوا۔ اس کتاب کو منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ نے مرتب کیا اور اس کا دیباچہ وقار الملک نے لکھا۔

عزیز مرزا کی انشا پردازی کے جائزے سے قبل پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فنِ انشائیہ پر مختلف ماہرینِ ادب کی آرا، پیش کرتے ہوئے اس کے اہم نکات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انشائیہ ایک ایسی جامع اور فکر انگیز تحریر ہوتی ہے جس میں مصنف بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اس میں بہ راہِ راست تبلیغ یا تشہیر کی گنجائش نہیں ہوتی، انشائیہ چند الفاظ کا بھی ہوسکتا ہے اور طویل بھی۔ کائنات و ماورا کی حقیر ترین یا اعلیٰ سے اعلیٰ شے اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہ سنجیدہ و مزاحیہ یا طنزیہ ہوسکتا ہے انشائیہ کے لیے لازمی اور بنیادی خصوصیت اس کی بے تکلف اور شگفتہ فضا ہے جو تحریر کو دل نشین اور قابلِ قبول بنالیتی ہے۔" (۳۴)

اردو میں انشائیہ نگاری کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ "خیالاتِ عزیز" میں ستائیس (۲۷) انشائیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے عزیز مرزا کے مزید بارہ (۱۲) انشائیوں کی تحقیق کا ادعا کیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے عزیز مرزا کے انشائیوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے عزیز مرزا کے انشائیوں میں تاریخی، سیاسی، مذہبی و اصلاحی پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں عزیز مرزا کی انشائیہ نگاری پر رائے قائم کرنے کے لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نواب وقارالملک اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے اقتباسات پیش کیے ہیں، ذیل میں نواب وقارالملک کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

"دنیا میں جس قدر بڑے بڑے کام ہوتے ہیں وہ سب انھیں لوگوں نے کیے ہیں جو سخت عدیم الفرصت تھے اور ہم کو امید ہے کہ ہم سب کو دعا کرنی چاہیے کہ جناب مرزا صاحب کے مضامین لٹریری قابلیت خاص کر اردو زبان کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہو اور در حقیقت ایسی ہی تصنیفات سے کوئی زبان زندہ رہ سکتی ہے اور ترقی کرسکتی ہیں۔" (۳۵)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالقادر، ظفر علی خاں، عزیز مرزا، سجاد یلدرم، دیا نارائن نگم، پریم چند، اور سدرشن وغیرہ ایسے انشا پرداز ہیں جنھوں نے ایک خوش گوار مستقبل کی شگفتہ امیدوں کو

اپنی مختلف الموضوع تحریروں کے ذریعہ سے ہر وقت تر و تازہ رکھا ان کے ذریعہ سے اردو نہ صرف موضوع بلکہ اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی نہایت وسیع ہو گئی اور دراصل یہی وہ آبیاریاں ہیں جنھوں نے اردو کو اس قابل بنا دیا کہ وہ مستقبل قریب میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو رہ سکے۔" (۳۶)

اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مشاہیر کی آراء کے ذریعہ عزیز مرزا کو ایک کامیاب انشاء پرداز کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

عزیز مرزا کی سوانحی کتاب کے آخری حصہ میں "عزیز مرزا کی متفرق تحریریں" کے عنوان سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کی دیگر تخلیقات کا جائزہ لیا ہے اور لکھا کہ ان میں تقریظ، پیش لفظ، رپورٹیں، خطوطات کتاب چے اور مکالمے وغیرہ شامل ہیں۔ عزیز مرزا کے خطوط کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ ان کے زیادہ تر خطوط تلف ہوگئے ہیں صرف چند خطوط ہی دست یاب ہیں۔ عزیز مرزا نے اچھی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے خطوط بھی لکھے تھے۔ ان خطوط سے ان کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے ان خطوں، صداقت اور خلوص نظر آتا ہے عزیز مرزا کا ایک مضمون ماہ نامہ ادیب (مدیر ظفر یاب خاں) جولائی ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان "مسلمان اور نتائج الہ آباد یونیورسٹی" ہے۔ اس کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے جذبات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون کا اقتباس اس طرح ہے:

"ہمارے قومی کالج کے نتائج اس قدر خراب ہوا کریں گے تو آئندہ قوم کے سنبھلنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود ایسی پست حالات کے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہم تعلیم میں ایک خاص حد تک ترقی کر چکے ہیں اور یہ خیال ہماری آئندہ ترقی کا مزاحم اور سدراہ ہو رہا ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ ان نتائج پر غور کرے اور اس خیال کو اپنے دل سے نکالے اور بہ خوبی سمجھے کہ اگر ہم برابر سرگرمی کے ساتھ کوشش نہ کیے جائیں گے تو ہماری قوم کی تباہی و بربادی میں کوئی شک نہیں۔" (۳۷)

عزیز مرزا کی اس تحریر کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے عزیز مرزا کے اسلوب کی سادگی و شستگی کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کے مضامین و متفرق دیباچوں رپورٹوں اور تقریظوں کے جائزے کے بعد ۲۵۵ صفحات پر مشتمل یہ سوانحی کتاب اختتام کو پہنچتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر "کتابیات" کے عنوان سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ان کتابوں، رسائل اور اخبارات کی فہرست پیش کی جن سے انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں استفادہ حاصل کیا۔ اس کام کے لیے انھوں نے اردو اور انگریزی کی کم و بیش (۶۴) کتابوں سے استفادہ حاصل کیا۔ اس کے علاوہ وہ جدید و قدیم (۱۴) رسائل اور (۵) اخبارات کے حوالے بھی انھوں نے دیے ہیں۔ کتابیات کی اس طویل فہرست سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تحقیق کے ایک ہونہار طالبِ علم کی طرح موضوع سے متعلق بکھرے ہوئے ممکنہ تمام مواد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو ترتیب دیتے ہوئے عزیز مرزا کی شخصیت کے مکمل پہلوؤں کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

- **پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح نگاری کا عمومی جائزہ:**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانحی کتاب "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" کے تفصیلی جائزے کے بعد جب ہم پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح نگاری کا بہ حیثیت فن جائزہ لیں تو بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ویسے سوانح نگاری کی جانچ کے لیے تنقید کے کسی اسکول نے کوئی خاص اصول مرتب نہیں کیے ہیں اس لیے ڈاکٹر عبدالقیوم اپنی کتاب "حالی کی اردو نثر نگاری" میں لکھتے ہیں:

> "یہ موضوع (سوانح نگاری) جس قدر دل چسپ ہے اسی قدر سیماب صفت بھی۔ افسانوں کے اصول بنائے گئے، ڈرامہ لکھنے کے قاعدے مقرر ہوئے، نظموں میں اصناف کے علاحدہ علاحدہ قاعدے مرتب کیے گئے، تاریخ کے لیے چند چیزوں کی موجودگی ضروری ہے۔ ورنہ اس کے بغیر تاریخ نہ رہے گی۔ لیکن سوانح عمری کے لیے اب تک کوئی باقاعدہ ایسا اصول نہیں

بنایا جاسکا جسے سامنے رکھ کر ہم سوانح عمریوں کی جانچ کریں۔ تنقید لکھتے وقت جن سے مدد لیں
پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوانح عمری اچھی لکھی گئی ہے وہ اچھی سوانح عمری ہے۔" (۳۸)

ڈاکٹر عبدالقیوم کے خیالات کی روشنی میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی لکھی ہوئی سوانح عمر "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" کو بھی ہر لحاظ سے ایک اچھا کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندستان کی ایک ایسی شخصیت کے احوال بیان کیے ہیں جن سے اپنی علمی قابلیت اور انتظامی مہارت سے دکن اور شمالی ہند کے لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ لیکن موضوع کی پیش کشی، اسلوب بیان وغیرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح نگاری کا جائزہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سوانح نگاری کے لیے شخصیت کو بہ طور موضوع دو وجوہ سے منتخب کیا جاتا ہے ایک بار اعتبار عقیدت مندی جیسے شبلی کی "سیرت نبویؐ" دوسرے بااعتبا بزرگی جس کی مثال سر سید احمد خاں کی سوانح عمر "حیاتِ جاوید" ہے جسے حالی نے اپنے مربی و بزرگ سر سید کے اعتراف خدمات کے طور پر لکھا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں سوانح نگار کے ذہن میں شخصیت کی بزرگی اور تقدس چھایا رہتا ہے اور شخصیت سے جتنی زیادہ عقیدت ہوتی ہے اتنی ہی ممدوح کی خامیاں بھی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے سوانح نگاری میں اعتدال نہیں آتا بلکہ وہ کتاب یا مضمون ممدوح کا نثری قصیدہ بن جاتا ہے۔ جس کی بہترین مثال حالی کی "حیاتِ جاوید" اور "یادگارِ غالب" ہے۔ چوں کہ حالی سر سید احمد خاں سے بہت متاثر تھے اور غالب حالی کے استاد تھے۔ اس لیے مولانا حالی نے ان دونوں کتابوں میں جانب داری سے کام لیا ہے۔ اس جانب داری کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ شخصیت کے مخالفین اس کی زندگی کے منفی و قبیح پہلو نمایاں کر کے دکھانے لگتے ہیں۔ چناں چہ "یادگارِ غالب" کے خلاف پروفیسر عبداللطیف نے "غالب" نامی کتاب میں غالب کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو بیان کیا ہے اس لیے سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ جس کی سیرت یا سوانح عمری لکھے اس کی زندگی کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو پیش کرے تاکہ پڑھنے والا شخصیت کے بارے میں ایک صحیح رائے قائم کرسکے۔ اگر سوانح نگار اس اصول سے ہٹتا ہے تو سوانح نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ تاہم اس کسوٹی پر بہت کم سیرت نگار اترتے ہیں۔ مندرجہ بالا امور کو

مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح نگار کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی کسی حد تک حالی اور شبلی کے طرز کے سوانح نگار دکھائی دیتے ہیں۔ موضوع یعنی شخصیت کے انتخاب میں عقیدت کا پہلو نمایاں ہے کیوں کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی بیش تر تحریروں میں عزیز مرزا سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

چناں چہ اس سوانحی کتاب کے آغاز میں "حرفِ آغاز" میں وہ خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں:

"بچپن ہی سے عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی، شخصیت، قومی اور سماجی خدمات اور علمی کارناموں کے قصے سن کر میں ان سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔۔۔ عزیز مرزا کی وفات کے (۵۰) سال بعد مجھے یہ سعادت میسر ہوئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کروں۔" (۳۹)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے علاوہ اکثر سوانح نگار بھی کسی شخصیت کی سوانح لکھنے کا ارادہ تب ہی کرتے ہیں جب کہ آیا وہ شخصیت سے خود متاثر ہوتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ شخصیت کے احوال آنے والی نسلوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ عقیدت، ارادت، تاثر اور سماجی و تہذیبی اہمیت کے پیش نظر سوانح نگاری کے لیے شخصیتوں کا انتخاب ہوتا ہے تو چوں کہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے سوانح لکھی جاتی ہے اس لیے سوانح میں شخصیت کی مدح کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور اس کے کردار کے منفی پہلو یا تو کم ہوتے ہیں یا بالکل نہیں ہوتے ہیں۔ چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی اس سوانح میں شروع سے آخر تک عزیز مرزا کی زندگی کے احوال پیش کیے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت، سیرت و کردار قول و فعل میں کہیں بھی انھیں عزیز مرزا کی شخصیت کے منفی پہلو نظر آئے۔ اگر آئے بھی تو انھوں نے اسے عزیز مرزا کے اعلیٰ کردار کے طور پر پیش کیا مثلاً عزیز مرزا کے زمانہ طالبِ علمی کے احوال بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"اگر ان سے غلطی ہو جائے بہت نادم ہوا کرتے تھے۔ علی گڑھ طلباء کی پہلی ہڑتال کے وہ لیڈر تھے۔ جس کی بناء پر ان کی ٹکر سر سید احمد خاں سے ہوئی تھی۔ ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ وہ غلطی پر ہیں چناں چہ ایک خط میں وہ سر سید احمد خاں سے معافی کے طلب گار ہوتے

ہوئے اپنی پہلو تنخواہ پوری کی پوری سر سید احمد خاں کے نام بھجوادی۔ ۔ ۔ اپنی غلطی کو مان لینا بہت بڑی عظمت کا ثبوت ہے۔" (۴۰)

اس چھوٹے سے واقعہ کے علاوہ عزیز مرزا کی ملازمت کے دوران اور ان کے خلاف ہونے والی سازش کے دوران پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو عزیز مرزا کی شخصیت کے منفی پہلو سے متعلق کوئی بات نہیں ملی جو ایک نارمل انسان کی زندگی میں ممکن نہیں۔ لیکن چوں کہ کسی کے حالات کے زبانی بیان اور سوانح میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سوانح میں شخصیت کو سنوار کر پیش کیا جاتا ہے کیوں کہ اسے تاریخ کے صفحات میں پیش کرنا ہوتا ہے اس لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ سوانح عزیز مرزا کی مدلل مداحی نہ سہی کم از کم اس میں جانب داری اور شخصیت سے عقیدت و ارادت کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ سوانح میں چوں کہ شخصیت کے احوال حقیقی انداز میں بیان کیے جاتے ہیں اور اس میں سوانح نگار کو ردو بدل کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اس لیے سوانح نگار کی شخصیت کے تئیں جانب داری کو خود شخصیت کی عظمت قرار دیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک مواد کی پیش کش کا سوال ہے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے بڑی تحقیق سے عزیز مرزا کے آباد و اجداد، بچپن کے حالات، زمانہ، طالب علمی کے واقعات، ملازمت کی تفصیلات، ان کی علمی، ادبی و سیاسی و سماجی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ لیکن حیدر آباد سے روانگی کے بعد اور انتقال سے قبل علی گڑھ میں قیام کے دوران مسلم لیگ کے لیے ان کی خدمات کے بیان میں تشنگی پائی جاتی ہے۔ اگر اس کی تفصیلات بیان کی جاتیں تو جدوجہد آزادی میں بالواسطہ طور پر عزیز مرزا کا رول بھی واضح ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود عزیز مرزا کے مکمل احوال اس سوانح سے قاری کو معلوم ہوتے ہیں اور ان کی مکمل شخصیت کتاب کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ جہاں تک اس کتاب کے اسلوب کا سوال ہے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ابتدا میں لکھا تھا کہ یہ ان کا ابتدائی شکل کا "ایم۔ اے" کا مقالہ ہے۔ چناں چہ اس سوانح میں اسلوب کے اعتبار سے تحقیقی رنگ جھلکتا ہے۔ حوالوں کی کثرت بعض مرتبہ تحریر کو بوجھل بنا دیتی ہے اور قاری کو یہ سوچنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ جو تحریر پڑھ رہا ہے خود سوانح نگار کی ہے یا کسی شاعر و ادیب یا نقاد کی تحریر کا حوالہ ہے۔ جب یہ سوانح کتابی شکل میں شائع ہو رہی تھی

تو اس میں مختلف موضوعات کی تائید کرنے والے حوالے کم کیے جاسکتے تھے۔ اسلوب میں سادگی ہے لیکن روانی اور سلاست نہیں پائی جاتی۔ سوانح کے مطالعہ کے لیے اسلوب میں دل چسپی پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عزیز مرزا اپنی سوانحی کتاب سیرۃ المحمود کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں یہ بہت بڑا قومی فرض ہے کہ مشاہیر اسلام کے واقعات زندگی کو ایسے پیرایہ میں لکھا جائے جو عام دل چسپی کا باعث ہو۔" (۴۰)

عزیز مرزا کے خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس سوانح کا جائزہ لیں تو اس میں بہ اعتبار اسلوب دل چسپی کا عنصر کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ واقعات کے بیان میں روانی نہ ہونے سے اس سوانح میں دل چسپی کم دکھائی دیتی ہے۔ پھر بھی عزیز مرزا کے زمانہ طالبِ علمی کے واقعات، رودِ موسیٰ کی طغیانی کے واقعات اور ان کے خلاف ہونے والی سازش کے احوال پڑھتے ہوئے قاری کو دل چسپی محسوس ہوسکتی ہے۔ دل چسپی کے اعتبار سے حالی کی سوانح " یادگارِ غالب " کا پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" سے موازنہ کیا جائے تو اپنی روانی، تسلسل اور بیانیہ انداز کے لیے یادگار غالب میں دل چسپی کا عنصر زیادہ ہے تاہم اس میں تحقیقی انداز اختیار نہیں کیا گیا اور حالی نے غالب کے حالات یکجا کر کے انھیں ترتیب وار بیان کر دیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح میں تحقیقی انداز نمایاں ہے۔ انھوں نے عزیز مرزا کی زندگی کے حوالے سے جو بات بھی کی اس کا مصدقہ حوالہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں روانی اور تسلسل کم ہوگیا۔ " یادگارِ غالب " کی سوانح ہے اور غالب کی شخصیت میں پائی جانے والی شوخی و ظرافت کی جھلک ان کی زندگی کے واقعات میں جا بجا جھلکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے قاری کو دل چسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف عزیز مرزا کی شخصیت ایک سنجیدہ علمی و سماجی و تہذیبی شخص کی ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی میں نہ غالب کی سی شوخی و ظرافت ہے اور نہ ہی دل چسپ واقعات اس لیے بھی اس کتاب میں دل چسپی کا عنصر کم پایا گیا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس سوانحی کتاب کو ایک طویل سوانح کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں

تفصیلی انداز میں عزیز مرزا کے احوال بیان کیے گئے ہیں اور ان کی سماجی اور علمی و ادبی خدمات کا تفصیلی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ عزیز مرزا جیسی شخصیت کے احوال تفصیلی انداز میں پیش کرنے کے لیے جس جانفشانی سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کام کیا ہے اس سے خود ان کی عظمت، لگن اور جستجو کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک شخصیت کے احوال بیان کرنے کے باوجود سوانح عمری ایک فنی اور تخلیقی کارنامہ ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تاریخی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے عزیز مرزا کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ بیان میں سچائی کو ملحوظ رکھا اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا۔ ان تمام امور کے پیشِ نظر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ سوانح اردو کے سوانحی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے اور اس سے سوانح نگاری کو نئی جہت عطا ہوئی ہے۔

○●○

حوالے :

١ مشمولہ "اردو ادب میں خاکہ نگاری" صابرہ سعید ص: ٦،

٢ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" حیدرآباد ١٩٨٠، ص: ٦

٣ صابرہ سعید "اردو ادب میں خاکہ نگاری" ص: ٧، ٨، ٩٠،

٤ پروفیسر غلام عمر خاں "عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ڈسٹ کور، (گرد پوش)

٥ پروفیسر یوسف سرمست مشمولہ "عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ص: ٩۔ ١٠

٦ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ص: ٥

٧ پروفیسر مغنی تبسم "عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ڈسٹ کور، (گرد پوش)

٨ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ص: ١٣

٩ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ص: ٢٣

١٠ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے" ص: ٢٧۔ ٢٨

۱۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۳۶

۱۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۳۶۔۳۷

۱۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۳۶،۳۷

۱۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۵۸،۵۹

۱۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۷۹

۱۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۸۲

۱۷ مولوی عبدالحق۔ چند ہم عصر۔ دلی ۱۹۴۲ء، ص:۵۸

۱۸ مشمولہ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۸۷

۱۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا، شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۰۲

۲۰ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۰۸

۲۱ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۱۵۔۱۱۶

۲۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۱۷

۲۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۲۶

۲۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۳۱

۲۵ مولوی عبدالحق۔ چند ہم عصر۔ ص:۹۰

۲۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۳۶

۲۷ ڈاکٹر قمر رئیس مرتبہ۔ ترجمہ کا فن۔ دلی ۱۹۷۶ء، ص:۱۸۷

۲۸ پروفیسر آلِ احمد سرور مشمولہ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۳۹

۲۹ منشی پریم چند مشمولہ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۶۲۔۱۶۳

۳۰ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے۔ ص:۱۶۶

۳۱ عزیز مرزا دیباچہ سیرۃ المحمود بہ حوالہ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ”ص: ۱۶۲

۳۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ”ص: ۱۰۰

۳۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ”ص: ۱۸۸

۳۴ ڈاکٹر آدم شیخ ۔ انشائیہ ” بمبئی ۱۹۶۵ء ص: ۱۰

۳۵ وقار الملک مشمولہ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ص: ۲۲۳ ۔ ۲۲۴

۳۶ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مشمولہ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت اور کارنامے ”ص: ۲۲۳ ۔ ۲۲۴

۳۷ عزیز مرزا مشمولہ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ”از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ص: ۲۳۸

۳۸ ڈاکٹر عبد القیوم ۔ حالی کی اردو نثر نگاری ”لاہور ۱۹۶۳ء ص: ۱۰۵

۳۹ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ”ص: ۵

۴۰ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۔ محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے ”ص: ۱۱۲، ۱۱۳

۴۱ عزیز مرزا ” سیرۃ المحمود ” دیباچہ

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

بہ حیثیت نقاد

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک نامور محقق، خاکہ نگار، سوانح نگار، انشا پرداز کے علاوہ ایک معتبر نقاد بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریریں برصغیر ہند و پاک سے جاری ہونے والے اہم ادبی رسائل، جرائد اور روزناموں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تحریریں اہم ادبی موضوعات، شعرا اور مصنفین کے کلام و کتابوں پر تبصروں کی شکل میں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیقی کتابوں جیسے "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے"، "دیوانِ لطف"، "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" اور خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" اور "نفوس گرامی" (زیرِ طبع) کے خاکوں میں بھی جا بجا ان کا تنقیدی شعور جھلکتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تنقیدی مضامین جو گزشتہ بیس سال میں اردو کے موقر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

- "مرزا علی لطف اور لکھنو" (نیا دور۔ اپریل ۱۹۷۹ء)۔
- "برق موسوی" (آج کل۔ اپریل ۱۹۸۰ء)
- "جدید عربی ادب کے ارتقاء میں مہجری ادبا کی خدمات" از ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی، تبصرہ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ (سب رس حیدرآباد۔ جولائی ۱۹۸۷ء)
- "شاہ نصیر دہلوی اور حیدرآباد" (آج کل۔ اگست ۱۹۸۷ء)۔
- "میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد" از طیبہ بیگم۔ تبصرہ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ (سب رس حیدرآباد۔ جولائی ۱۹۹۴ء)

- "نقد اور تحقیق" از عتیق اقبال مقدمہ از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ (۱۹۹۴ء)
- "سلام اشک صادق" از ڈاکٹر صادق نقوی تبصرہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ (خوش بو کا سفر جنوری ۱۹۹۸ء)
- حیدرآباد دورِ عثمانی میں از ڈاکٹر داؤد اشرف۔ تبصرہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ (خوش بو کا سفر جون ۲۰۰۰ء)
- پروفیسر گیان چند جین کی کتاب۔ "تحقیق کا فن" تبصرہ (قومی زبان، آندھرا پردیش، جنوری اور فروری ۲۰۰۰ء)
- "حیدری کا تذکرہ گلشنِ ہند گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے" (ہماری زبان ہفتہ وار اگست ۱۹۷۸ء)
- "رامائن جدید دنیا کے لیے" از نارائن تبصرہ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ (سیاست ۲۵ / مارچ ۱۹۸۱ء)
- "اردو میں منظر نگاری کی روایت اور نظیر اکبر آبادی" از مرزا اکبر علی بیگ (منصف ۱۳ / دسمبر ۱۹۸۷ء)
- "اردو یونیورسٹی آزادی کے بعد ایک تحفہ" (سیاست ۱۵ / مئی ۱۹۹۵ء)
- "انشا" کا اسکنڈے نیویائی نمبر۔ تبصرہ از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ (سیاست ۱۰ / جولائی ۱۹۹۵ء)
- "غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار" (ہماری زبان یکم۔ ۸ / اگست ۱۹۹۵ء)
- "قطب شاہی عہد میں دکنی مرثیے کا جائزہ" (ہماری زبان۔ ۸ / دسمبر ۱۹۹۵ء)
- "اردو یونیورسٹی کا ایک عظیم تجربہ" (ہماری زبان۔ ۸ / جون ۱۹۹۵ء)
- "اردو ناول کا مستقبل" (ہماری زبان۔ ۱۵ / جولائی ۱۹۹۶ء)
- "صفی اورنگ آبادی کی غزل گوئی" (ہماری زبان۔ ۸ / نومبر ۱۹۹۸ء)
- "شاعر لافانی فانی بدایونی" (سیاست۔ ۵ / دسمبر ۱۹۹۸ء)
- "بانگ درا" (ہفت روزہ) ایڈیٹر سید کرار حسین کاظمی تبصرہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سیاست ۹ / مارچ ۲۰۰۰ء
- "جوش ملیح آبادی کی سلام گوئی"۔ ایک مطالعہ از مرزا اکبر علی بیگ (سیاست ۱۶ / اپریل ۲۰۰۰ء)
- "مخلص شاعر۔ یوسف علی خلوص" از مرزا اکبر علی بیگ (سیاست ۲۰ / مئی ۲۰۰۲ء)
- رسالہ ادراک (دو ماہی) مدیر ڈاکٹر سید حسن عباس (سیاست ۲۰ / ستمبر ۲۰۰۲ء)

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیقی کتاب مرزا علی لطف حیات اور

کارنامے کے پیش لفظ اور لطف کے کلام کے جائزے کے دوران دیوانِ لطف کے مقدمہ میں محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے اور عزیز مرزا کی تخلیقات کے جائزے کے دوران خوش نفساں اور نفوس گرامی خاکوں کے مجموعے میں شامل شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات کے جائزے، دیوانِ حفیظ اور ید بیضا کے مقدموں میں اور نظیر شناسی کی ترتیب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحریروں سے ان کا تنقیدی شعور ملتا ہے۔ اس سے قبل کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ لے کر اردو تنقید میں ان کے مقام کا تعین کیا جائے اردو تنقید کی تعریف اور جدید دور میں تنقید کے مختلف اسالیب کا تعارف ضروری ہو جاتا ہے تاکہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تنقیدوں میں مختلف تنقیدی پہلوؤں اور روایات کو تلاش کیا جاسکے۔

لفظ تنقید "نقد" سے مشتق ہے جس کے معنی جانچنا، کھوج اور پرکھ کے ہیں۔ اصطلاح ادب میں کسی فن پارے یا تخلیق کے محاسن و معائب بیان کرتے ہوئے ادب میں اس کے مقام کا تعین کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ ہر زمانے میں تنقید کی مختلف تعریفیں پیش کی گئی ہیں۔ کسی نے ادب کا مقصد مسرت و حظ پہنچانا بتایا اور تنقید کا کام تخلیق میں مسرت کے پہلوؤں کو تلاش کرنا بتایا۔ کسی نے ادب کو تفسیر حیات سے تعبیر کیا اور زندگی کے تغیر و تبدل کے زیرِ اثر ادب میں رونما ہونے والے مسائل اور تبدیلیوں کو دیکھنا تنقید کے لیے لازم قرار دیا۔ دراصل کسی ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہی تنقیدی عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ بیش تر تخلیقات خوب سے خوب تر کی تلاش کے بعد ہی وجود میں آتی ہیں۔ اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> "آج زندگی ہر وقت رواں دواں ہے۔ اس میں ہر لمحہ ایک نئے نظریے اور نئی فکر کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اس کے امکانات اب محدود نہیں۔ اس لیے ناقص اور بہتر کی تمیز کے لیے تنقید ضروری ہے۔ تنقیدی شعور کے بغیر نہ تو اعلیٰ ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ فنی تخلیق کی قدروں کا تعین ممکن ہے اس لیے اعلیٰ ادب کی پرکھ کے لیے تنقید لازمی ہے۔" (۱)

زمانہ گزرنے کے ساتھ ادب کی پرکھ کے انداز بھی بدلے۔ اردو میں حالی نے اپنے مقدمہ "مقدمہ شعر و

شاعری " کے ذریعہ جدید اردو تنقید کی بنا ڈالی۔ بعد میں تنقید میں رومانی تنقید، جمالیاتی تنقید، سائنٹفک تنقید، تاثراتی تنقید، نفسیاتی تنقید، تقابلی تنقید وغیرہ کے دبستان وجود میں آئے۔ تنقید کے ابتدائی نظریے تعریف، تشریح اور تجزیے کی شکل میں ہیں سائنٹفک تنقید ادیب اور فن کار کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے اور اس کے ذریعہ تخلیق میں زمانے کے سماجی حالات اور خیالات کا عکس تلاش کیا جاتا ہے۔ جمالیاتی تنقید میں کسی بھی ادبی تخلیق کے مطالعے یا جائزے سے ذہن پر پڑنے والے تاثر کو اہمیت دی جاتی ہے اور تخلیق میں حظ، مسرت اور حسن کے پہلو تلاش کیے جاتے ہیں۔ تاثراتی تنقید میں کسی بھی ادبی تخلیق کے مطالعے یا جائزے سے ذہن پر پڑنے والے تاثر کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مارکسی تنقید میں ادب کا تعلق زندگی سے دیکھا جاتا ہے کہ اعلیٰ ادب وہی ہے جو اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرتا ہے اور انسانی مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے۔

نفسیاتی تنقید میں فرد پر زور دیا جاتا ہے اور تخلیق کار کی نفسیاتی الجھنوں اور تشنگیوں کو تلاش کیا جاتا ہے اس تنقید کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی دبی ہوئی خواہشات ادب اور آرٹ کی شکل میں رونما ہوتی ہیں۔

تنقید کے ان دبستانوں کے علاوہ تنقید کا تعلق تحقیق اور تخلیق سے بھی جوڑا گیا ہے اور کہا گیا کہ تحقیق کے بغیر تنقید ممکن نہیں اور تنقید کے لیے تخلیق کی ضرورت ہے اور اچھی تخلیق کے لیے اچھے تنقیدی شعور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تنقید کے بارے میں مندرجہ بالا بنیادی امور کے بعد دیکھیں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تنقیدیں کس اسلوب تنقید یا دبستان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی چند تنقیدی تحریروں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایک تنقیدی مضمون " غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار " ہفت روزہ ہماری زبان (نئی دہلی) میں دو قسطوں میں یکم اور ۸ / اگست ۱۹۹۵ء کو شائع ہوا۔ مضمون کے آغاز میں غواصی کی عظمت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ رقم طراز ہیں:

" غواصی قدیم اردو یا دکنی کا عظیم ترین شاعر ہے۔ مثنوی اور غزل دونوں اصناف میں دبستانِ گولکنڈہ اور دبستانِ بیجاپور کا کوئی شاعر اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ وہ قدیم اردو کا شاعر ہے۔ لیکن شاعرانہ فن کاری اور حسن کاری کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اگر ساری اردو

شاعری سے نصف درجن بلند پایہ شاعروں کے نام گنائے جائیں تو غواصی کو ان میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔" (۲)

غواصی کی عظمت بیان کرنے اور دکنی مثنوی کے تعارف کے بعد مضمون کے اصل موضوع کے جز "اخلاقی اقدار" کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"جنھیں ہم اخلاقی اقدار کہتے ہیں وہ انسانی معاشرہ، اس کی بقا اور کامیابی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان معاشرتی حیوان ہے اگر خیر و شر، حق و باطل، انصاف اور ناانصافی کی قدروں کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے تو ایک روٹی پر متعدد آدمی جھپٹنے لگیں گے اور انسان پھر جنگل کی دنیا میں لوٹ جائے گا۔ سارے مذاہب اور عام عظیم مفکروں نے ان ہی بنیادی قدروں کی تلقین کی ہے۔ جنھیں ہم انسانی اقدار کہہ لیں یا اخلاقی اقدار، عالمی شعر و ادب کے سارے اعلیٰ نمونے راست یا بالواسطہ طور پر اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں۔" (۳)

تمہید کے طور پر اخلاقی قدروں کا تعارف کرانے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اصل مضمون کی طرف آتے ہیں اور غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار تلاش کرنے کے لیے وہ غواصی کی دو مثنویوں "طوطی نامہ" اور "میناستونتی" کا انتخاب کرتے ہیں۔ قدیم دور کی داستانوں میں دکنی مثنویوں میں تمثیلی رنگ پایا جاتا ہے اور جانوروں کے ذریعہ داستان کو اور مثنوی نگار اخلاقی قدروں کو بیان کرتے ہیں چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "طوطی نامہ" کا مختصر خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مثنوی طوطی نامہ دراصل سنسکرت قصہ "شکاسب تتی" سے ماخوذ ہے۔ لیکن غواصی کا ماخذ فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا پہلا ترجمہ مولانا ضیاء الدین بخشی نے ۱۳۲۹ء میں کیا تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں کہ غواصی کی مثنوی چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں مثنوی کی عام روایت کے برخلاف مافوق الفطرت عناصر کم استعمال کیے گئے ہیں۔ مثنوی کا بنیادی کردار ایک طوطا ہے۔ جس کی زبان جگہ جگہ اخلاقی باتیں کہی گئی ہیں۔ قصہ یوں ہے کہ ایک نوجوان سوداگر کی شادی ایک حسین لڑکی سے ہوتی ہے۔ سوداگر بازار سے ایک دانش مند طوطا اور ایک مینا خرید تا ہے تجارت کے لیے شہر جاتے وقت دونوں کی

پرورش کی ذمہ داری اپنی بیوی کو سونپتا ہے سوداگر کی بیوی بد کار تھی، وہ ایک نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے وصال کی آرزو رکھتی تھی۔ اس کے لیے وہ مینا سے اجازت طلب کرتی ہے۔ مینا بھولی بھالی تھی، وہ عورت کو بد کاری سے منع کرتی ہے عورت غصہ میں آکر مینا کو ختم کر دیتی ہے۔ مینا کا حال دیکھ کر طوطا ہوشیار ہو جاتا ہے اور عورت کی جانب سے اجازت طلب کرنے پر وہ ایک شرط پر اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے دل کا راز کسی سے نہ کہے ورنہ اس کا حال وہی ہو گا جو ایک رانی کا ہوا تھا۔ سوداگر کی بیوی رانی کا حال جاننے کے لیے مشتاق ہوی ہے چناں چہ دانش مند طوطا سوداگر کی بیوی کو بد کاری سے باز رکھنے کے لیے رانی کا قصہ بیان کرنا شروع کرتا ہے۔ رات میں شروع ہونے والا یہ قصہ صبح تک جاری رہتا ہے قصہ پھر بھی ادھورا رہتا اور دوسری رات پھر کہانی کا سلسلہ شروع کر دیتا اس طرح ۲۹ راتوں میں ۲۵ کہانیاں سناتے ہوئے طوطا سوداگر کی بیوی کو بد کاری سے بچاتا ہے سوداگر سفر سے واپس آتا ہے۔ گھر کا حل طوطے سے دریافت کرتا ہے طوطے نے اس شرط پر حقیقتِ حال پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ حالات سننے کے بعد اسے رہا کر دے گا۔ سوداگر نے شرط مان لی، حالات سننے کے بعد سوداگر بہت رنجیدہ اور ملول ہوا۔ اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا، طوطے کو رہا کر دیا۔ مال و دولت خیرات کر کے درویشی اختیار کر لی۔ قصہ "طوطی نامہ" کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سوداگر اور اس کی بیوی کے کرداروں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سوداگر ایک شریف انسان ہے۔ اس کی بیوی بدچلن اور آوارہ ہے۔ سوداگر اخلاقی قدروں کی پاسبانی کرتا ہے۔ جب کہ اس کی بیوی اخلاقی قدروں کو پامال کرنے پر آمادہ ہے۔ کسی بھی انسان کی شخصیت اسس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے شخصیت میں انسان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں صفات موجود ہوتی ہیں اس مثنوی کے دو کردار یعنی طوطا اور مینا میں بڑی تضاد ہے۔ طوطا دانشس مند اور موقع شناسس ہے۔ جب کہ مینا بھولی بھالی اور نادان ہے۔ اپنی نادانی کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ طوطے کی ہوشیاری اور مصلحت نے اس کی جان بچائی۔ غواصی کی اس مثنوی میں نیک مرد اور بد کار مردوں کے کردار ملتے ہیں اور نیک عورتوں اور

بدکار عورتوں کے بھی۔" (۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مثنوی "طوطی نامہ" کے دو کرداروں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور انسانی فطرت کے خیر و شر کے پہلو کو واضح کیا ہے۔ ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے اور کسی بھی تخلیق کے پس پردہ تخلیق کار کا ذہن اور شخصیت کارفرما ہوتی ہے۔ مثنوی "طوطی نامہ" کے کردار سوداگر کے قصہ کے آخر میں درویشی اختیار کرلینے کے واقعہ کی غواصی سے مطابقت کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

> "مثنوی کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہ مثنوی غواصی کے آخری زمانے کی تصنیف ہے۔ جب اس کو شہرت، عزت اور دوسری تمام آسائشیں مہیا ہوچکی تھیں شاید اسی لیے وہ دنیا کے عیش و عشرت و دولت سے بیزار سا نظر آتا ہے۔" (۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مضمون کا عنوان غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار ہے۔ لیکن انھوں نے مضمون کا بیش تر حصہ مثنوی کے تحقیقی پہلو اور قصہ بیان کرنے میں صرف کر دیا۔ مثنوی سے اخلاقی اقدار کا انتخاب کرنے کے بجائے انھوں نے ایسے اشعار منتخب کیے جن سے سوداگر کی بدکار بیوی کی شخصیت جھلکتی ہے مثلاً یہ شعر کہ:

"لگیا دل مرا اک نوے یار سوں — مجھے ہیں نین اوس کے دیدار سوں" (۶)

پھر بعد میں ایسے اشعار منتخب کیے جن میں بری عورتوں سے بچنے کی تلقین ملتی ہے جیسے:

زبان دار عورت سے ڈرنا بھلا — کہ ہے یو، بلا، بد سے بدتر بلا

نہ جا ان کی ظاہر کی خوبی یہ پھول — کہ کانٹے کے ہے تیز یو گرچہ پھول

ان اشعار کے انتخاب کے ساتھ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا مثنوی "طوطی نامہ" پر تبصرہ ختم ہو جاتا ہے اور اس مثنوی سے جو اخلاقی قدریں ظاہر ہوئیں ان کی مکمل طور پر وضاحت نہیں ہو پائی۔ صرف قصہ کے بعد نیک و بد لوگوں کے بارے میں ان کی آراء سے ہی کچھ اخلاقی باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن وہ مثنوی سے مزید اشعار کا

انتخاب کرتے تو موضوع سے کچھ انصاف ہوسکتا تھا۔ "طوطی نامہ" کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" کا جائزہ لیا ہے۔ مثنوی کی تصنیف کے تحقیقی پہلو بیان کرنے کے بعد مینا ستونتی کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس مثنوی میں ایک راجہ کی بد کردار بیٹی چندا اور ایک چرواہے کی نیک صفت بیوی "مینا" کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ راجہ کی بیٹی چندا چرواہے کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ راجہ مینا کی خوب صورتی سن کر اسے ورغلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ باعصمت "مینا" سے ہار جاتا ہے۔ راجہ چندا کو سنگسار کرا دیتا ہے اور چرواہے کا سر منڈا کر سارے شہر میں پھرایا جاتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مثنوی سے شر اور خیر کو ظاہر کرنے والے اشعار منتخب کیے ہیں۔ راج کماری چندا کو ورغلانے کا انداز دیکھیے:

"چھپایا توں ہے جان جانی منجے   لگیا جیو میرا کتی ہوں تجے" (۷)

باعصمت "مینا" کے خیالات اس طرح ہیں:

"پرائی سیج میں جارا ایس کون سلاؤں   تو وہ سیج مائی میں کیوں نہ ملاؤں" (۸)

اشعار کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کرداروں کے خیر و شر کی وضاحت کی ہے اس طرح یہ مضمون اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس مضمون کے اجمالی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ کرداروں کا خیر و شر پیش کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اخلاقی اقدار کے طور پر شر کے مقابلے میں خیر کی کامیابی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ مضمون "غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار" جمالیاتی و تاثراتی تنقید کی اچھی مثال ہے۔ جمالیاتی و تاثراتی تنقید کے سلسلے میں ڈاکٹر شارب ردولوی مختلف نقادوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> "ادبی نقاد کا یہ سب سے بڑا کام ہے کہ وہ کسی فن پارے کو ایک حسین شے سمجھ کر جمالیاتی خصوصیت کی رو سے اس کا مکمل جائزہ لے ادب ایک فن ہے۔ ایک ایسی چیز ہے جو ایک خوب صورت خیال سے بنتی ہے اس لیے ایک ابدی مسرت ہے۔۔۔ جہاں تک تاثراتی

تنقید کا تعلق ہے اس میں اس نقطہ ، نظر سے غور کیا جاتا ہے کہ ادب تاثرات کی ایک فنی شکل ہے ۔ ۔ ۔ کسی ادبی تخلیق کے لیے جمالیاتی نقاد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ تخلیق ذہن پر کس قسم کا اثر ڈالتی ہے ۔ " (۹)

جمالیاتی و تاثراتی تنقید کے ضمن میں مندرجہ بالا توضیحات جاننے کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تنقیدی مضمون پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس مضمون میں انھوں نے اخلاقی اقدار کا تاثر لیا ہے اور اچھے اخلاق چوں کہ انسانی جمالیات کا ایک حصہ ہیں ۔ اس لیے اسے جمالیاتی و تاثراتی تنقید کا ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے ۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایک توضیحی و تنقیدی مضمون " صفی اورنگ آبادی کی غزل گوئی " ہے ۔ یہ مضمون ۸ / نومبر ۱۹۹۸ ، کے " ہماری زبان " کے شمارہ میں شائع ہوا ۔ صفی کا تعارف اور ان کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کرنے اور حیدرآباد سے ان کے تعلق کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صفی کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" صفی کے کلام کی نمایاں خصوصیت جو قاری کو پہلی نظر میں متاثر کرتی ہے وہ ان کی شاعری کی لفظیات اور اسلوب ہے ۔ احساس میں تازگی اور حرارت کے بعد صفی ہی وہ واحد شاعر ہیں جن کے کلام میں سہل ممتنع کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں ۔ ۔ ۔ غزل سے اور غزل گوئی سے صفی کو طبعی مناسبت تھی ۔ دراصل دیکھا جائے تو صفی کے کلام کا روشن پہلو ان کی غزل ہی ہے جس میں فطری جذبات کی مصوری سادہ الفاظ کے ذریعہ کی گئی ہے ۔ ۔ ۔ صفی کی غزلوں کا لہجہ درد و غم اور سوز و غم میں ڈوبا ہوا ہے ۔ چھوٹی بحروں اور سہل ممتنع میں صفی کا کلام ان کو اردو کے ممتاز شعرا میں کھڑا کر دیتا ہے ۔ " (۱۰)

صفی کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی بات کی تائید میں صفی کے کلام سے مختلف موضوعات سے مناسبت رکھنے والے اشعار بھی پیش کیے ہیں ۔ جن میں سے چند اشعار بہ طور نمونہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔

"اچھے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ　　سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے
وقت کو اے صفی برا نہ کہو　　وقت پیغمبروں پہ آیا ہے
جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے　　اس سے دنیا مرید ہوتی ہے
اس کے وعدہ پہ جی رہا ہے صفی　　ہائے کیا شے امید ہوتی ہے
اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے　　غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے" (۱۱)

صفی کے منتخب اشعار پیش کرنے کے بعد ان خیالات کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"صفی کا کلام پڑھ کر یا سن کر صاحبِ ذوق احساس افراد کا دل بہلتا تھا بہلتا ہے ۔ آئندہ بھی بہلتا رہے گا۔ جب تک اردو زندہ ہے صفی جیسے شاعر کو اہلِ اردو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔" (۱۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا مضمون "صفی اورنگ آبادی کی غزل گوئی" تعریفی اور توضیحی و تشریحی مضمون ہے۔ اس مضمون میں صفی کی غزل گوئی کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور تعریفی تنقید جس کی مثال تقاریظ، مقدمے وغیرہ ہیں اور جو کسی تخلیق کو مقبول بنانے کے لیے لکھے جاتے ہیں یہ مضمون اسی نوعیت کا ہے۔ اچھی تنقید میں تخلیق کے محاسن و مصائب بیان کرتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایک اور تنقیدی مضمون "شاعر لافانی۔فانی بدایونی" ہے۔ یہ مضمون روزنامہ سیاست کے سنڈے ایڈیشن میں ۵/ دسمبر ۱۹۹۹ء کو شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں صفی کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے شعری سفر کا جائزہ لیا گیا ہے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ فانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فانی فلسفہ کے طالبِ علم تھے۔ قران اور تصوف کا بھی انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اس لیے ان کی شاعری میں تصوف کی جھلک جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ فانی کو غم پرست اور قنوطی شاعر کہا جاتا ہے۔۔۔ ہماری المیہ شاعری کی کہانی میر سے شروع ہو کر فانی پر ختم ہو جاتی ہے۔" (۱۳)

فانی کے کلام کے بارے میں مختصر سے تاثراتی تبصرہ کے بعد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے فانی کے کلام سے منتخب اشعار کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ جن میں سے چند شعر اس طرح ہیں:

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہمان ہوں جسے میزبان نہیں ملتا

دلِ فانی کی تباہی کو نہ پوچھ — الم لامتناہی کو نہ پوچھ

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں — تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

تم جسے در سے اٹھا دیتے تھے — آج دنیا سے وہ ناکام اٹھا

روز بڑھتی ہی رہتی آرزو — روز ترک آرزو کرتے رہے (۱۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے مضمون کا اختتام فانی کی تعریف میں پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی آراء بھی پیش کی ہیں۔ اس مضمون کا اہم پہلو فانی کے اشعار کا انتخاب ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے فانی کے طرز اور اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ مضمون تاثراتی تنقید کی ایک اچھی مثال ہے کیوں کہ انھوں نے اس مضمون میں فانی کے کلام سے غم کے پہلو سے متاثر ہو کر اشعار پیش کیے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اکثر تنقیدی تحریریں ان کے تبصروں میں ملتی ہیں جو انھوں نے مختلف شعرا کے مجموعوں اور ادیبوں کی نفسیات اور اردو رسائل و جرائد پر کیے ہیں۔ یہ تبصرے اردو روز ناموں کے ادبی ایڈیشنوں اور اردو رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان تبصروں کو یکجا کرنے کے بعد تبصروں پر مبنی ان کی ایک کتاب "محور" کے عنوان سے زیرِ طبع ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایک تبصرہ "پروفیسر گیان چند جین کی کتاب "تحقیق کا فن" پر ہے۔ یہ تبصرہ۔۔۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے ترجمان "قومی زبان" جنوری / فروری ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ "تحقیق کا فن" پروفیسر گیان چند جین کی اصول تحقیق کے سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔ کتاب پر تبصرہ کے

آغاز سے قبل اردو تحقیق کے میدان میں پروفیسر گیان چند جین کی اہمیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ لکھتے ہیں:

"پروفیسر گیان چند جین کا نام اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے ان کی اب تک ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ایک پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک محقق ایک نقاد ایک ماہر لسانیات ایک استاد ایک ادیب اور ایک شاعر کی حیثیت سے انھوں نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اردو کا مورخ اردو کی جب بھی تاریخ لکھے گا تو پروفیسر گیان چند جین کی بے لوث خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکے گا۔۔۔ پروفیسر گیان چند جین کی اردو دنیا میں شہرت اور نام وری کا دارومدار ان کی تحقیق نگاری پر ہے۔ بہ حیثیت محقق وہ ہند و پاک کے ان چند اہم محققین میں شمار ہوتے ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔" (۱۵)

پروفیسر گیان چند جین کے تعارف کے بعد مضمون میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تحقیق کی تعریفیں پیش کیں اور تحقیق کے موضوع پر لکھی جانے والی آٹھ کتابوں کے نام پیش کیے۔ اس کے بعد "تحقیق کا فن" کا تعارف پیش کیا اور آگے کتاب میں شامل ۲۲ ابواب کا تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب کے پندرھویں باب "تدوین متن" کا تعارف پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس طرح کیا ہے:

"پندرھواں باب "تدوین متن" سے متعلق ہے۔ متن کے سلسلے میں محقق کو کئی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر جین صاحب نے ابتداً متن اور تدوین متن کی توضیح کی ہے اور پھر تدوین کی مختلف روایات مخطوطات و مطبوعات کی تدوین کے لیے نسخوں کی فراہمی، نقل کی قسمیں، اردو رسم الخط کی کمیاں، انتخاب متن، نسخوں کی گروہ بندی، نسخوں کا مرتبہ، موازنہ، قیاسی تصحیح، مشمولات متن کی تحقیق، مطالب، اختلاف نسخ وغیرہ دقیق موضوعات کو سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔" (۱۶)

تمام ابواب کے اسی انداز میں تعارف پیش کرنے کے بعد مضمون کے اختتام میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر گیان چند جین کی کتاب " تحقیق کا فن " پر ان لفظوں میں تبصرہ کیا ہے :

> " تحقیق کے موضوع پر " تحقیق کا فن " جیسی عالمانہ کتاب سپرد قلم کر کے پروفیسر گیان چند جین نے ادب کے طالبِ علموں ریسرچ اسکالروں اور اساتذہ پر ایک احسان عظیم ہے ۔ جس کے لیے وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں ۔ یہ کتاب نہ صرف تحقیق کے موضوع پر لکھی ہوئی دیگر کتابوں میں سب سے مفصل سیر حاصل اور ضخیم ہے ۔ بلکہ تحقیق کے اصول اور طریق کار کا احاطہ بھی کرتی ہے ۔ " (۱۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے پروفیسر گیان چند جین کی کتاب پر یہ تبصرہ کرتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت بیان کی ہے اور اس کی تعریف و توصیف کی ہے ۔ دیگر کتابوں پر لکھے گئے تبصروں اور مقدموں میں بھی انھوں نے یہی رنگ اختیار کیا ہے ۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تنقیدوں پر طائرانہ نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریروں میں تاثراتی ، تقابلی اور جمالیاتی تنقید کے اثرات پائے جاتے ہیں ۔ " مرزا علی لطف " کے کلام کی تدوین کے دوران انھوں نے لطف کے کلام سے مقابلہ کرتے ہوئے میر کے کلام سے تقابل کیا ہے ۔ اس طرح تقابلی تنقید کی مثالیں ان کی تحریروں میں پائی گئی ہیں ۔ ان کی تنقید میں جہاں وضاحتی ، توضیحی و تشریحی پہلو زیادہ ہے ۔ اسی طرح کسی تخلیق یا تخلیق کار کے فن پارے میں پائی جانے والی خامیوں اور کمیوں کی نشان دہی سے انھوں نے پہلو تہی کی ہے ۔ یہ ان کی تنقید کی خامی کہی جاسکتی ہے ۔ اس کے باوجود وہ اکیسویں صدی کے برِ صغیر کے معتبر اور ابھرتے ہوئے نقاد قرار دیے جاسکتے ہیں ۔ جو خاموشی سے ادب کی پرکھ اور پہچان کا کام کر رہے ہیں ۔

○●○

حوالے

۱ ڈاکٹر شارب ردولوی " جدید اردو تنقید اصول و نظریات " ص : ۳۹

۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" یکم اگست ۱۹۹۵، ص: ۲

۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" یکم اگست ۱۹۹۵، ص: ۲

۴ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" یکم اگست ۱۹۹۵، ص: ۲

۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" ص: ۲

۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" ص: ۲

۷ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" ص: ۲

۸ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" ص: ۲

۹ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اردو تنقید اصول و نظریات ص: ۲۸۱۔ ۲۸۵

۱۰ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "ہماری زبان" ۸/ نومبر ۱۹۹۸، ص: ۳

۱۱ بہ حوالہ ہماری زبان ۸/ نومبر ۱۹۹۸، ص: ۳

۱۲ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہماری زبان" ۸/ نومبر ۱۹۹۸، ص: ۳

۱۳ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "سیاست" ۵/ دسمبر ۱۹۹۹،

۱۴ فانی بدایونی۔ بہ حوالہ مضمون از پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مشمولہ سیاست۔ ۵/ دسمبر ۱۹۹۹،

۱۵ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مضمون پروفیسر گیان چند جین کی کتاب "تحقیق کا فن" مشمولہ قومی زبان، آندھرا پردیش جنوری/ فروری ۲۰۰۰، ص: ۳۵

۱۶ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مضمون پروفیسر گیان چند جین کی کتاب "تحقیق کا فن" مشمولہ قومی زبان، آندھرا پردیش جنوری/ فروری ۲۰۰۰، ص: ۳۸

۱۷ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ "قومی زبان" ص: ۲۷

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
کے متفرق علمی وادبی کارنامے

తెలుగు పరిచయ వాచకం

ابتدائی تلگو ریڈر (۱)

زبان، اظہارِ خیال کا ایک وسیلہ ہے۔ ہر زبان کے اپنے اپنے حروف ہیں، اپنی اپنی قواعد ہیں، لیکن وہی زبان ارتقاء پذیر ہوتی ہے جو دوسری زبان کے الفاظ، اصطلاحات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انسان کو اپنی مادری زبان کے علاوہ علاقائی یا مقامی یا دوسری زبانوں پر بھی عبور رکھنا چاہیے۔ ایک سے زائد زبان پر عبور کسی بھی انسان کی علمی وادبی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے اور اس میں اظہارِ خیال کی پوری پوری طاقت موجود رہتی ہے۔

اردو زبان والوں کو تلگو زبان سکھانے کے لیے تلگو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے کچھ کوششیں کی گئی ہیں۔ تاکہ آندھرا پردیش کا اردو داں طبقہ بھی اپنے علاقہ کی زبان سیکھ سکے اور اس کی تہذیب و تمدن سے واقف ہو سکے۔ ([illegible]) یعنی تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی کتاب کو تلگو اکیڈمی نے ۱۹۹۹ء میں جاری کیا۔ جس کو بزبان تلگو لکھنے والے ڈاکٹر پی۔ دکشنا مورتی ڈپٹی ڈائرکٹر (موظف) تلگو اکیڈمی ہیں۔ جب کہ اس کے مدیر ڈاکٹر ایم۔ راما ریڈی ہیں۔ تلگو اسباق کا اردو میں ترجمہ کرنے والے مسیح انجم بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ہیں۔ جب کہ اردو میں ادارت کے فرائض پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو تفویض کیے گئے۔

یہ کتاب دراصل ان ملازمین کے لیے لکھی گئی ہے جو تلگو زبان سے واقف نہیں ہیں جب کہ انھیں بہ حیثیت دوسری زبان کے تلگو پڑھنا لازم ہے۔ تلگو اکیڈمی نے ایسے ملازمین جنھیں تلگو سیکھنا لازم ہے یا ایسے لوگ جو تلگو سیکھنے کے خواہش مند ہیں ان کے لیے دو کورسس کا اہتمام کیا ہے۔ تلگو کا پہلا کورس ابتدائی نوعیت کا ہوتا ہے جو چار ماہ کے لیے ہے، دوسرا کورس بھی چار ماہ کے لیے ہے۔ان دونوں کورسس کے لیے دو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب پہلے کورس کے لیے لکھی گئی ہے۔ تلگو زبان میں یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اردو کے ذریعہ تلگو سیکھنے کے لیے تلگو بہ ذریعہ اردو کی کتاب ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کی قیمت ۳۰ روپے ہے اس کی ضخامت ۲۵۸ صفحات ہے۔

مسیح انجم تلگو کے ٹیچر رہ چکے ہیں انھوں نے تلگو سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اردو کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہیں جنھیں تلگو پر بھی قدرت حاصل ہے اس کتاب میں جملہ (۲۰) سبق ۱۳۰ مکالمے اور ۵ بیانیہ مضامین ہیں۔

چوں کہ یہ کتاب تلگو میں لکھی گئی ہے اور اس کے مترجم مسیح انجم ہیں اس لیے ہمیں اس کے متن اور اندازِ بیان سے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ کتاب میں کسی اردو جملے میں لفظی یا معنوی غلطی رہ گئی ہو یا املا کی غلطیاں ملی ہوں تو اس کی ذمہ داری ایڈیٹر پر عائد ہوتی ہے اور اسی کتاب کے ایڈیٹر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہیں اور ہمارا مطمعِ نظر یہی ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کس حد تک اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے۔

کتاب کے پہلے صفحہ پر ہی کتاب کی غلطی ملتی ہے۔ تلگو حرف و صوت کے سبق CONSONANTS کا ترجمہ "حروفِ صیح" لکھا گیا جب کہ یہ "حروفِ صحیح" ہے۔ ہر لفظ اور ہر جملے کے بازو میں اس کا اردو متن درج کیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہوتا کہ اردو متن اعراب کے ساتھ دیا جاتا تاکہ کوئی غلط فہمی ہونے نہ پاتی۔ مثلاً بغیر اعراب کے لکھنے سے یہ خامیاں سامنے آتی ہیں:

کتاب کے صفحہ نمبر دو پر ఇచ్చాను کا اردو متن "اچانو" لکھا گیا ہے جو غلط ہے صحیح متن یوں ہونا چاہیے "اِچّانو"

کتاب کے صفحہ پر نمبر تین پر దొంగ کا اردو متن "دنگا" لکھا گیا۔ لیکن مدیر نے اس کو صحیح نہیں کیا ہے۔ دنگا اردو میں مستعمل لفظ ہے۔ جو مار دھاڑ یا فساد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کہ దొంగ کو "دُنگا" لکھنا چاہیے تھا۔

کچھ مقامات پر اردو ترجمہ میں تشنگی باقی ہے۔ مدیر کی ذمہ داری تھی کہ اس جانب وہ توجہ کرے۔ مثلاً صفحہ ۱۴۰ پر تلگو اور اردو کے جملے یوں ہیں:

"ఆమె నవలలురాసి పదివేలు సంపాదించింది."

"اس نے ناول لکھ کر دس ہزار کمائے"۔

تلگو جملے میں یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ناول لکھنے والی خاتون ہیں۔ جب کہ اردو جملے میں تانیث واضح طور پر ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔

صفحہ ۱۴۱۰ پر یا تو ترجمہ غلط ہے یا پھر کتابت کی غلطی ہے۔ ان دونوں صورتوں کے ذمہ دار یقیناً کتاب کے ایڈیٹر ہیں۔

"నాతో చెప్పకుండా వెళ్ళకు." "مجھ سے بغیر کہے جاؤ"

جب کہ تلگو میں منفی اندازہ ہے اس کا صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہیے۔

"مجھ سے بغیر کہے مت جاؤ" اسی طرح کی غلطی یا لاپرواہی صفحہ ۱۴۲۰ پر بھی ہے۔

"అతను నన్ను డబ్బుఅడక్కుండా వెళ్ళిపోయాడు."

"وہ مجھ سے پیسے مانگے چلا گیا" یہ غلط ہے جب کہ تلگو جملے کا صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہیے۔

"وہ مجھ سے پیسے مانگے بغیر چلا گیا" یا پھر "وہ مجھ سے پیسے بنا مانگے چلا گیا"۔

بہ ہر حال ایسی کچھ غلطیاں کتاب میں نظر آتی ہیں۔ چوں کہ یہ کتاب تلگو زبان سیکھنے کے لیے ہے اس لیے نہایت چوکسی کے ساتھ کتاب کو شائع کرنا چاہیے تھا۔ مترجم اور مدیر دونوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کسی قسم کی لاپرواہی یا تساہل پسندی سے کام نہ لیں۔ ان خامیوں کے باوجود ایک اچھی کوشش ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

•

తెలుగు పరిచయ వాచకం
రాతపని పుస్తకం

تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی (۲) (تعارفی) کتاب

تلگو اکیڈمی کی جانب سے تلگو زبان سکھانے کے لیے دو کورسیس کا اہتمام کیا ہے۔ یہ کتاب دوسرے کورس کے لیے مختص ہے۔ یہ کورس بھی چار ماہ کو محیط ہے ویسے تلگو زبان میں یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں لکھی گئی لیکن اردو ترجمہ کے ساتھ اردو ملازمین یا تلگو سیکھنے کے خواہش مند افراد کے لیے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے تلگو نصاب کی تیاری ڈاکٹر پی دکشینا مورتی ڈپٹی ڈائرکٹر تلگو اکیڈمی کے سپرد تھی جب کہ تلگو اڈیٹر کے فرائض ڈاکٹر ایم راما ریڈی ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر تلگو اکیڈمی نے انجام دیے۔ اردو ترجمہ کے لیے ریاست علی تاج ریٹائر لکچرر کی خدمات حاصل کی گئیں جب کہ اردو مدیر کی حیثیت سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خود کو وقف کیا۔

زیرِ نظر کتاب میں جملہ (۲۱) اسباق ہیں اور ہر سبق میں دو یا تین مشقیں ہیں۔ جملہ (۱۱۶) صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت ۲۵ روپے ہے۔ کتاب کا پیش لفظ وہی ہے جو پہلی کتاب میں ہے۔

کتاب کے ابتدائی پچیس صفحات حرف مصوت (آوازیں)، مختلف حروف کی دوہری آوازیں، تلگو حرف علت اور ان کی طویل آوازوں کی کئی ایک مثالوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں ہر تلگو لفظ رومن انگریزی میں درج ہے اور ان کا اردو انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے تاکہ طلباء کو تلگو لفظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے ان کے معنی و مفہوم سے آگاہ ہونے میں سہولت ہو۔ بعض مقامات پر اردو کے مترجم اور اردو مدیر سے اس کتاب میں بھی تسامح ہوا ہے۔

اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۸ پر [illegible] ہے جس کا اردو متن آڈو۔ آڈو درج ہے جب کہ تلگو کا صحیح تلفظ کچھ اور ہے۔ اس کا اردو متن یوں ہونا چاہیے۔ "اڈُو۔ آڑو"۔

اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹ پر చొప్ప - చొప్ప لکھا گیا ہے۔ اردو میں صحیح تلفظ ادا نہیں کیا گیا ہے۔

صحیح تلفظ اس طرح سے ہے۔ "چوپاّ۔ چاپہ"

مشدّد کی غلطیاں تو ہر جگہ ہیں۔ جہاں تک تلگو الفاظ کے تلفظ کا معاملہ ہے۔ اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے تھا اس لیے جہاں مشدّد کی ضرورت ہے وہاں مشدّد ضرور دینا چاہیے ورنہ تلفظ کی غلطی رہ جائے گی۔ جیسے:

اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹ پر గద - గద్ద ان دونوں کو اردو میں گدا۔ گدا لکھا گیا ہے اس کے بجائے گدّا۔ گدا لکھا جاتا تو بہتر تھا۔

اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹ پر ہی దొమ్మ - దొమ్మ کو "دکا۔ دوما" لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے اسے یوں ہونا چاہیے۔ "دومّا۔ دوما"

تقریباً اسباق میں دو یا اس سے زائد مشقیں دی گئی ہیں ہر مشق راست طور پر شروع ہو جاتی ہے۔ بہتر یہی ہوتا کہ مشق کا پہلا سوال مثال کے طور پر حل کیا جاتا تاکہ طلبا، اس مثال کی روشنی میں مشق کے بقیہ سوالات حل کرتے۔ آخر کے دو اسباق میں Model کے طور پر ایک آدھ جملہ تحریر کیا گیا ہے۔ یہ تمام اسباق بے حد اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی مشقیں تلگو سیکھنے میں بے حد معاون ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ اسباق تیار کیے گئے ہیں تاکہ اردو طبقہ آسانی سے تلگو زبان سیکھے۔ کہیں تلگو متن کا ترجمہ اردو میں کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور کہیں اردو متن کا ترجمہ تلگو میں کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

تلگو اکیڈمی مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے تلگو سیکھنے کے لیے دو ابتدائی کورسیس کا آغاز کیا اور ان کے لیے کتابیں بھی شائع کیں۔ دونوں کتابوں کے اردو مدیر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کافی محنت کی۔ کچھ خامیاں رہ گئی ہیں جسے دوسرے اڈیشن کے موقع پر دور کیا جاسکتا ہے۔ الغرض پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نہ صرف اردو اکیڈمی بلکہ تلگو اکیڈمی میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

•

• پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ حیثیت شاعر :

پروفیسر مرزا علی بیگ اردو کے نامور محقق، معتبر نقاد، مشہور خاکہ نگار اور صاحبِ طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش گو شاعر بھی ہیں مگر اس جانب انھوں نے بہت کم توجہ دی۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ شاعری کی طرف توجہ دیتے تو یقیناً حیدر آباد کے ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہوتا۔ ذیل میں ان کے مختصر کلام سے چند غزلیں بہ طور نمونہ پیش کی جارہی ہیں۔

ان کی پہلی غزل جو ایک کالج میگزین میں ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔

مصر کے بازار میں یوسف خریداروں کے بیچ
بک گئی جنسِ وفا سکوں کی جھنکاروں کے بیچ
کل چمن تھا شاخِ گل تھی اور ہم
سر جھکائے یوں کھڑے ہیں آج تلواروں کے بیچ
آفتیں ہی آفتیں ہیں روز و شب
ہم پڑے ہیں درد کے ماروں کے بیچ
گردش ساغر نہیں یہ گردشِ حالات میں
شیخ صاحب پھنس گئے ہیں آج میخواروں کے بیچ
غم نہ بھٹکے پاس تیرے تو سدا ہنستا رہے
تو بھٹک کر بھی نہ آ ہم جیسے غم خواروں کے بیچ
تیل کے چشمے جو ابلے فیض یہ اس کا ہوا
پاؤنڈ و ڈالر جھک گئے ہیں آج دیناروں کے بیچ
آج اکبر کہکشاں دل میں اتر آئی مرے
وقت جو گزرا ہے میرا چند مہ پاروں کے بیچ

دوسری نظم رسالہ "بانو" میں نئی دہلی سے سنہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔

میری فردوس

(بیٹی سے خطاب)

رقص ہے راگ ہے سرور ہے تو
نشہ ، بادہ ، طہور ہے تو
دل ہے اکبر کا جاں سکینہ کی
چشمِ بد دور رشکِ حور ہے تو
اپنے ابا کی آنکھ کا تارا
اپنی ماں کی نظر کا نور ہے تو
نو بہ نو منزلوں کا مژدہ ہے
نو بہ نو راہوں کا نشور ہے تو
آنکھ کھولے جو لے کے انگڑائی
عکسِ تنویرِ بام طور ہے تو
دولتِ دو جہاں بھی پاس سہی
کچھ نہیں پاس اک جو دور ہے تو
دوڑ کر آمرے گلے لگ جا
روح کی راحت و فور ہے تو
رشکِ فردوس ہے جہاں تجھ سے
میری فردوس رشکِ حور ہے تو

279/1

تیسری غزل "نیا دور" ماہ نامہ لکھنو سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

سیر یوں تو جہاں کی کر گزرے
اپنی ہستی سے بے خبر گزرے
تھے بھی دنیا میں یا نہیں تھے ہم
ایسے دنیا سے بے اثر گزرے
عمر بھر نیند اب نہ آئے گی
جانے کس وقت تو ادھر گزرے
اے صبا بوئے یار لیتی آ
اس کے کوچے سے تو اگر گزرے
ہم سا رسوائے خلق ہو نہ کوئی
انگلیاں اٹھ گئیں جدھر گزرے
وضع داری کے واسطے اکبر
جو نہ کرتا تھا ہم وہ کر گزرے

•

- **پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مذہبی موضوعات پر مضامین:**

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تخلیقات میں مذہبی وابستگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ اردو کے موخر روزناموں میں مذہبی موضوعات پر ان کے مضامین آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ذیل میں مضامین کے عنوانات اور روزناموں و جرائد کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

سلسلہ	مضمون کا نام	اخبار / رسالہ	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱	بیمار کربلا حضرت علی بن حسین	ہفتہ روز بانگِ درا اربعین نمبر	ورنگل	مئی ۲۰۰۲ء

۲	پیکر وفا عباس	ہفتہ روز بانگِ درا اربعین نمبر	ورنگل	مئی ۲۰۰۱ء
۳	واقعہ کربلا میں خواتین کا حصہ	ہفتہ روز بانگِ درا اربعین نمبر	ورنگل	مئی ۲۰۰۰ء
۴	کربلا کا ننھا مجاہد علی اصغر	ہفتہ روز ندائے وقت اربعین نمبر	حیدر آباد	مئی ۲۰۰۲ء
۵	آہ! ڈاکٹر امیر مصطفیٰ علی زیدی مرحوم	ماہ نامہ صدائے جعفریہ	حیدر آباد	دسمبر ۱۹۸۸ء
۶	رعد کے نوحہ جات ایک تعارف	ماہ نامہ صدائے جعفریہ	حیدر آباد	فروری ۱۹۸۸ء
۷	مرزا علی لطف اور حب اہلِ بیتِ اطہار	انجمن پروانہ بشیر	حیدر آباد	مئی ۱۹۸۴ء
۸	ڈاکٹر میر مصطفیٰ علی زیدی مرحوم	پندرہ روزہ شعیہ	لکھنو	ستمبر ۱۹۸۹ء
۹	عباس تجھے اہلِ وفا یاد کریں گے	روز نامہ سیاست	حیدر آباد	مئی ۲۰۰۲ء
۱۰	واقعہ کربلا میں خواتین کا حصہ	روز نامہ سیاست	حیدر آباد	مئی ۲۰۰۱ء
۱۱	حضرت علی اکبر کی رخصت	روز نامہ منصف	حیدر آباد	نومبر ۱۹۸۵ء

موضوعات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اہلِ بیت اطہار کے واقعہ کربلا اور اردو کی رزمیہ شاعری سے وابستہ لوگوں کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ مضامین نہ صرف اہلِ بیت اطہار سے اپنی والہانہ عقیدت و وابستگی اور ان سے محبت کو باعث ثواب سمجھ کر لکھے ہیں۔ بلکہ ان سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اسلوب نگارش کی ادبی شان بھی جھلکتی ہے۔

○●○

ادارہ ادبیاتِ اردو

اور

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

شہر حیدر آباد کی بنیاد خلوص اور محبت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر قلی اور بھاگ متی کی محبت کا ثمرہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ فسانہ ہو لیکن اس افسانے کی بنیاد محبت ہے اور محبت سے کس کو مفر ہے اور قلی کا خلوص دیکھیے کہ رودِ موسیٰ کے کنارے آباد ہونے والے شہر کو اس دعا کے ساتھ آباد کیا تھا کہ :

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

خلوصِ دل سے مانگی ہوئی دعا کا یہ اثر ہوا کہ وہ شہر جو گولکنڈہ کے اطراف آباد تھا، اپنی حدیں توڑ کر میلوں پھیل گیا اور اب اس کی آبادی ساٹھ لاکھ نفوس سے تجاوز کر گئی ہے۔

حیدر آباد فرخندہ بنیاد، عہدِ قدیم ہی سے اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق فیروز، محمود اور خیالی، دبستانِ گولکنڈہ کے اولین شعرا ہیں۔ قطب شاہی سلاطین میں محمد قلی قطب شاہ سے ابوالحسن تانا شاہ تک سبھی صاحبِ سیف و قلم گزرے ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف میدانِ کارزار میں اپنے کارہائے نمایاں انجام دیے بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور قدردانی کی۔ خود بھی دکنی اردو میں طبع آزمائی کی۔ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ قطب شاہی دور کے شعرا و ادبا جیسے وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی، فائز، طبعی اور جنیدی نے دکنی ادب کو نئی سمت عطا کیے۔

قطب شاہی سلطنت کے زوال کے بعد آصف جاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ آصف جاہی سلاطین نے سرزمینِ دکن پر تقریباً دو صدیوں تک حکم رانی کی۔ یہ دور تاریخِ دکن میں علوم و فنون اور شعر و ادب کے

ارتقاء کے اعتبار سے ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

آصف جاہی خاندان کے ساتویں حکمران آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں کا دور مختلف علوم و فنون کے علاوہ اردو شعر و ادب کے نشو و نما کے سلسلے میں عہد زرین کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود آصف جاہ سابع نہ صرف ایک باکمال شاعر اور نثر نگار تھے بلکہ اردو زبان و ادب ترقی و ترویج اور اشاعت کے لیے بھی غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کے دورِ حکومت میں نہ صرف اردو زبان کو ایک ادبی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے فروغ حاصل ہوا بلکہ ترقی یافتہ زبانوں کے علوم و فنون کو پہلی مرتبہ باقاعدہ اور منظم طریقے سے اردو میں منتقل کیا گیا۔ یہاں کے حکمرانوں کی علم دوستی اور ادب پروری کے علاوہ اہلِ علم و ادب کی قدر دانی اور فیاضی کے چرچے عام ہوئے تو شمالی ہند سے دانش ور، ادیب، شعرا اور فن کار کشاں کشاں یہاں آنے لگے۔ ان حکمرانوں نے ان کی شایانِ شان پذیرائی کی۔ منصبوں اور خطابوں سے نوازا اور ان کے منھ موتیوں سے بھر دیے۔ اردو کے شہرہ آفاق اہلِ قلم شبلی، نعمانی، عبدالماجد دریا آبادی، سید سلیمان ندوی، ظفر علی خان، نواب میر عثمان علی خاں کی سرپرستی اور قدر افزائی کے سبب اردو زبان و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیے۔

شہر حیدر آباد کی چار سو سالہ تاریخ میں آخری صدی کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی، اس صدی میں علم و دانش اور شعور و آگہی کے ذریعے معاشی و سماجی ترقی کے نئے باب روشن ہوئے۔ انیسویں صدی کے آواخر میں حیدر آباد میں دارالترجمہ اور دائرۃ المعارف کے قیام کے ذریعے علوم شرقیہ کے ساتھ مغربی علوم و فنون کو ترقی دینے کی بنیادیں قائم ہوئیں اور بیسویں صدی کے اوائل میں نواب میر عثمان علی خاں نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا اعلان کیا۔

جامعہ عثمانیہ ملک کی پہلی یونیورسٹی تھی جس میں کسی دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جارہا تھا اور یہ دنیا کی پہلی یونیورسٹی تھی جس نے اردو ذریعہ تعلیم میں مختلف علوم و فنون جیسے سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون جیسے مضامین کی درس و تدریس کا کارنامہ انجام دیا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے نتیجے میں دنیا کے نقشہ میں حیدر آباد کو نمایاں مقام حاصل ہوا اور اسی یونیورسٹی نے ساری دنیا کے تشنگانِ علم کو شہر

حیدر آباد سے روشناس کرایا۔ حالاں کہ برِ صغیر کے طول و عرض میں ریاستیں اور بھی تھیں۔ بڑے بڑے شہر بھی تھے لیکن حیدر آباد دکن کی ریاست کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ اس نے علم و ادب کا چراغ روشن کیا۔ اس کے والی نے علوم و فنون کی ہمہ جہتی ترقی میں گہری دل چسپی لے کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ آنے والی نسلیں ہمیشہ یاد کرتی رہیں گی۔ یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ اردو یونیورسٹی کے احیاء کے لیے کسی شہر کو منتخب کیا گیا تو وہ شہر حیدر آباد ہے۔ آج اس شہر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پچھلے پانچ برسوں سے کام کر رہی ہے اور دن بہ دن ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد بہت سے نوجوان اردو کے ذریعے مختلف علوم و فنون میں فارغ التحصیل ہو کر نکلنے لگے۔ ان ہی دنوں اردو کے نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر سید محی الدین قادر زور جو یوروپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندستان لوٹے تو جامعہ عثمانیہ میں شعبہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر زور کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان نوجوان اسکالروں کی صلاحیتوں سے اردو زبان و ادب کی ہمہ جہتی ترقی کے سلسلے میں مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ بہ شرطہ کہ ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل ہو۔ کوئی پلیٹ فارم ہو جہاں یہ " سر پھرے " اردو زبان کی نشو و نما اردو تہذیب کی بقا اور اردو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ سکیں اور مشترکہ طور پر کوئی اردو زبان و ادب کی خدمت کر سکیں۔ اس مقصد کو لے کر ڈاکٹر زور نے پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیر الدین ہاشمی کے تعاون سے ۲۵ / جنوری ۱۹۳۱ء میں ادارہ ادبیاتِ اردو کی بنیاد ڈالی۔ ادارہ کے لیے ابتدائی فنڈ بھی ان ہی اصحاب کے عطیوں سے شروع ہوا عام لوگوں اور حکومت کی امداد کا انتظار کیے بغیر ڈاکٹر زور نے فراہمی زمین و عمارت کے لیے جدوجہد شروع کی۔ ۳۰ / جنوری ۱۹۳۱ء کو حضرت خواجہ حسن نظامی نے ادارہ کی عمارت کا نام "ایوانِ اردو" تجویز فرمایا۔ ۲۷ / جنوری ۱۹۵۵ء کو ادارہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ ۱۵ / اپریل ۱۹۵۵ء کو مجلسِ انتظامی نے محترمہ تہنیت النساء بیگم (بیگم زور) سے عمارت کے لیے زمین عطا کرنے کی خواہش کی۔ ۲ / اکتوبر ۱۹۵۵ء کو بیگم زور صاحبہ نے اس قطعہ زمین کو ادارہ کے نام رجسٹری کروا دی جس پر اب ایوانِ اردو کی عمارت کھڑی ہے۔ حکومت ہائے ہند کشمیر اور

حیدر آباد دکن کے علاوہ مختلف انجمنوں اور تجارتی اداروں سے سوا لاکھ روپے کے صرف سے "ایوانِ اردو" کی عمارت تقریباً آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ ۲۲/ مارچ ۱۹۶۰ء کو جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے ایوانِ اردو کا افتتاح فرمایا۔

ادارہ ادبیاتِ اردو، برِ صغیر میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔ جس کی سرگرمیاں اور زبان و ادب کے کثیر پہلوؤں کو اپنے دائرے میں سمیٹتی ہے اور گزشتہ ستر برس سے اردو کی توسیع و اشاعت اور ترقی کے لیے سرگرم عمل ہے۔

ادارہ ادبیاتِ اردو کے قیام کے وقت جو اغراض و مقاصد تھے وہ یہ ہیں:

۱۔ اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت اور تحفظ

۲ سرزمینِ دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا

۳ عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری وسائل اختیار کرنا

۴ ملک کے نوجوانوں میں انشا پردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا

۵ اردو کے مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا

۶ تاریخِ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت

۷ ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ اناث کے لیے وقف رہے گا۔" (۱)

- ریاستِ حیدر آباد کے ولی عہد نواب اعظم جاہ بہادر نے اس ادارے کا سرپرستِ اعلیٰ بننا منظور فرمایا۔ دیگر سرپرستوں میں سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ، نواب معین الدولہ اور راجہ شام راج راجونت بہادر شامل تھے۔

ادارے کی ایک مجلسِ انتظامی تشکیل دی گئی جو حسبِ ذیل عہدہ داروں اور اراکین پر مشتمل تھی۔

مجلسِ انتظامی :

صدر : نواب مہدی یار جنگ بہادر (معین امیر جامعہ، صدر المہام تعلیمات و فینانس)

نائب صدر : مولوی لیاقت اللہ خاں (معتمد، فینانس)

اراکین : (۱) مولوی سید اعظم صاحب (پرنسپل، سٹی کالج)

(۲) مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری (معتمدِ بابِ حکومت)

(۳) مولوی سید علی اکبر صاحب (نائب ناظمِ تعلیمات)

(۴) مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی (پروفیسر تاریخ، جامعہ، عثمانیہ)

(۵) مولوی عبدالقادر صاحب سروری (پروفیسر اردو، جامعہ، عثمانیہ)

(۶) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی (مددگار، ناظم رجسٹریشن)

(۷) مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی (پروفیسر دینیات، جامعہ، عثمانیہ)

معتمد : ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (پروفیسر اردو، جامعہ، عثمانیہ)

ادارے کے قیام کے بعد سے جو اصحاب صدر اور معتمد کے عہدوں پر فائز رہے ان کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

(۱) نواب مہدی یار جنگ	۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۸ء
(۲) نواب لیاقت جنگ	۱۵/ اگست ۱۹۴۸ء تا ۵/ اکتوبر ۱۹۵۸ء
(۳) نواب زین یار جنگ	۵/ اکتوبر ۱۹۵۸ء تا ۱۶/ اگست ۱۹۶۱ء
(۴) سید علی اکبر	۱۶/ اگست ۱۹۶۱ء تا ۲۰/ فروری ۱۰۸۳ء
(۵) محامد علی عباسی	۲۰/ فروری ۱۹۸۳ء تا ۱۷/ ستمبر ۱۹۸۹ء
(۶) سید ہاشم علی اختر	۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۹ء تا ۲۶/ اپریل ۱۹۹۴ء
(۷) پروفیسر جعفر نظام	۲۶/ اپریل ۱۹۹۴ء تا ۲۸/ اگست ۲۰۰۲ء

(۸) زاہد علی خاں	۲۹/ اگست ۲۰۰۲ء تا حال

معتمدین :

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین قادر زور	۱۹۳۱ء تا ستمبر ۱۹۶۲ء
(۲) پروفیسر مسندر راج سکسینہ	۲۳/ نومبر ۱۹۶۲ء تا ۲۹/ مارچ ۱۹۷۵ء
(۳) سید ہاشم علی اختر	۲۹/ مارچ ۱۹۷۵ء تا ۱۹/ جون ۱۹۸۲ء
(۴) رمن راج سکسینہ	۱۹/ جون ۱۹۸۲ء تا ۲۶/ اپریل ۱۹۹۴ء
(۵) پروفیسر مغنی تبسم	۲۶/ اپریل ۱۹۹۴ء تا حال

موجودہ مجلسِ انتظامی حسبِ ذیل اصحاب پر مشتمل ہے:

(۱) جناب زاہد علی خاں	صدر
(۲) جناب عبدالکریم خاں	نائب صدر
(۳) جناب رمن راج سکسینہ	نائب صدر
(۴) پروفیسر مغنی تبسم	معتمدِ عموی
(۵) جناب سید صفی الدین قادری	شریکِ معتمد
(۶) جناب محمد منظور احمد	رکن
(۷) بلقیس علاء الدین صاحبہ	رکن
(۸) ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ نگم	رکن
(۹) فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ	رکن
(۱۰) پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ	رکن
(۱۱) جناب موہن پرشاد	رکن
(۱۲) جناب غلام جیلانی	رکن

(۱۳) پروفیسر احمد اللہ خاں رکن

(۱۴) جناب محسن احمد صدیقی رکن "۔ (۲)

عظیم اداروں کے اغراض و مقاصد بھی عظیم ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ادارہ نے مختلف شعبہ قائم کیے تاکہ تقسیم عمل کے ذریعہ ادارے کی سرگرمیوں کو فروغ حاصل ہو اور مختلف خیال اور مکتب کے اصحاب کا تعاون حاصل ہو۔ ہر شعبے کے لیے ایک علاحدہ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ جس کا ایک معتمد یا داعی مقرر ہے۔

ادارے میں شعبہ ٔ زبان، شعبہ ٔ تنقید، شعبہ ٔ تاریخ دکن، شعبہ ٔ شعرا و مصنفین، شعبہ ٔ سائنس، شعبہ ٔ نسوان، شعبہ ٔ اطفال، شعبہ ٔ طلبہ، شعبہ ٔ امتحانات، شعبہ ٔ کتب خانہ، ماہ نامہ سب رس، شعبہ ٔ خوش نویسی، کمپیوٹر کی تربیت کا مرکز، ادارہ کے زیرِ اہتمام یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا اہتمام، مجلسِ اشاعت تاریخ و تمدن دکن، ایوانِ اردو کی سرگرمیاں اور شعبہ ٔ میوزیم ہیں۔ ان میں سے چند شعبہ جات جیسے شعبہ ٔ زبان، شعبہ ٔ تنقید، شعبہ ٔ تالیف و ترجمہ، شعبہ ٔ تاریخ دکن، شعبہ ٔ شعرا و مصنفین، شعبہ ٔ سائنس، شعبہ ٔ اطفال، شعبہ ٔ طلبہ، فی الحال غیر کارکرد ہیں۔ بقیہ کارکرد شعبوں میں شعبہ ٔ امتحانات کی سرگرمیاں فی الحال عروج پر ہیں چوں کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا زیادہ تعلق شعبہ ٔ امتحانات سے ہے۔ اس لیے شعبہ ٔ امتحانات کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

"ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں بہت سے نوجوانوں کو اپنی زبان و ادب اور تہذیب سے کما حقہ واقف ہونے کا موقع نہیں ملتا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گھریلو خواتین اور ناخواندہ بالغوں کو اس قابل بنانے کی غرض سے کہ وہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر اپنے طور پر کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنی علمی استعداد کو بڑھا سکیں ادارے نے مختلف مدارج پر مشتمل ایک نصابِ تعلیم ترتیب دیا اور ریاست کے طول و عرض میں اس کے امتحانات کے مراکز قائم کیے۔ ان امتحانوں کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دوسری زبان

والوں کو اردو سیکھنے پر مائل کیا جائے۔ ادارے کے امتحانات اردو عالم اور فاضل حکومت اور یونیورسٹی کے مسلمہ ہیں۔ ان امتحانوں کی وجہ سے ناخواندہ اور کم خواندہ افراد کے لیے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا رستہ نکل آیا ہے بلکہ ان کے لیے ملازمتوں اور روزگار کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔ دوسری طرف یہ امتحانات، تعلیمِ بالغان کے قومی منصوبے کی تکمیل میں بھی اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔ شعبہ ،امتحانات کے پہلے معتمد پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔ اب اس شعبے کے ....معتمد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہیں"۔ (۳)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اردو کے نامور محقق، نقاد، ادیب، شاعر اور بہترین منتظم ہیں۔ اس لیے پروفیسر صاحب کا مذکورہ بالا شعبوں سے کسی نہ کسی طور پر تعلق رہا ہے۔ ان کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ وہ ہر کسی کا تعاون کرنے میں ہمیشہ آگے آگے رہتے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کے ساتھ مل کر وہ ادارہ، ادبیاتِ اردو کے ہر شعبے سے خود کو شعوری اور لاشعوری طور پر وابستہ کرلیا۔ ہر شعبہ کے ذمہ داروں کے ساتھ تعاون کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ادارہ کے ذمہ داروں نے انھیں شعبہ ،امتحانات کا معتمد بنا دیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ابتدا سے ہی شعبہ ،امتحانات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اردو زبان و ادب کی حفاظت، بقاء اور ترقی کے لیے ہمیشہ تیار رہے۔

ادارہ ، ادبیاتِ اردو کے امتحانات کے انعقاد و انتظامات کے لیے ماہرین پر مشتمل موجودہ مجلسِ انتظامی کمیٹی حسبِ ذیل اصحاب پر مشتمل ہے۔

(۱) جناب زاہد علی خاں	صدر
(۲) جناب ظہیر الدین علی خاں	نائب صدر
(۳) پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ	اعزازی معتمد
(۴) پروفیسر محمد انور الدین	شریکِ معتمد
(۵) پروفیسر شریف النساء صاحبہ	رکن

(۶) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید — رکن

(۷) جناب عبدالرحیم خاں — رکن

(۸) جناب سید علی الدین قادری — رکن

(۹) جناب عبدالمقتدر — رکن

(۱۰) جناب اسلام الدین مجاہد — رکن

(۱۱) محترمہ افسر النساء صاحبہ — رکن

(۱۲) محترمہ شگفتہ شاہین صاحبہ — رکن

(۱۳) جناب کے۔ رالو — رکن

(۱۴) جناب قاسم علی خاں — اعزازی کنٹرولر آف اگزامینیشن

شعبہء امتحانات کے تحت کئی ایک امتحانات منعقد ہوتے ہیں جیسے اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو انشاء، اردو ماہر، اردو عالم، اردو فاضل۔۔۔ان تمام کے نصاب کی تیاری اور امتحان کی تیاری کے لیے کئی اصول و ضوابط مقرر کیے گئے۔ کئی ایک تبدیلیاں کی گئیں۔ شعبہء امتحانات کو کمپیوٹرائز کروانے کی تجویز خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تھی تاکہ امتحانات کے تمام مراحل سائنٹفک انداز میں طے کیے جاسکیں۔ کسی قسم کے شکوک و شبہات کی گنجائش باقی نہ رہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو ۲۹ / جنوری ۱۹۹۴ء کو شعبہء امتحانات کا معتمد نامزد کیا گیا۔ تقریباً آٹھ سال سے وہ ذمہ داری بہ حسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کے غیاب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو ہی ان کا جانشین بنایا جاتا رہا ہے۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو عالم، اردو فاضل کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مسلمہ قرار دیا ہے چناں چہ اردو عالم کامیاب امیدوار عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان پری ڈگری کورس اور اردو فاضل کامیاب امیدوار بی۔اے لنگویجس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد طلباء کے لیے ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی تک کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ کاکتیہ یونیورسٹی ورنگل کے

منعقدہ امتحانات بی۔ اے اکسٹرنل میں شریک ہوسکتے ہیں جو طلبا و طالبات باضابطہ کالجس میں نہیں پڑھ سکتے ہیں ان کے لیے یہ امتحانات ایک نعمت سے کم نہیں۔ شعبہ امتحانات اور اس کی کارکردگی کے ضمن میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ:

"ادارہ ادبیاتِ اردو کے امتحانات میں طلباء و طالبات کی تعداد ایک ہزار سے زائد کبھی نہیں بڑھی تھی جو ۱۹۹۴ء سے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کا تعاون ہمیں حاصل ہوگیا۔ اسی سال صرف اردو دانی میں (۴) ہزار کے قریب طلباء و طالبات نے اس امتحان میں شرکت کی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجلسِ انتظامات ادارہ ادبیاتِ اردو نے بھی عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ سے تعاون کرتے ہوئے اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشاء کے امیدواروں سے کسی قسم کی فیس وصول نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی تک گیارہ مرتبہ ادارہ ادبیاتِ اردو نے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تعاون سے امتحانات منعقد کیے ہیں۔ دن بہ دن طلباء و طالبات کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشاء کی کتابیں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے شہر حیدرآباد اور اضلاع کے تمام مراکز کے طلباء و طالبات کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے نئی نسل کے لیے اردو تعلیم کا جو انتظام کیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ہم یوں سمجھ رہے تھے کہ اردو اب جا رہی ہے چراغِ سحری ہے لیکن اب یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اردو واپس آرہی ہے۔ حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے بے شمار انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشاء کی تعلیم کے ٹھوس اقدامات کیے گئے ہیں۔ شہر کے بیش تر مقامات پر قائم ان مراکز سے ہمارے بچے استفادہ کر رہے ہیں نہ صرف ان امتحانات کی پڑھائی کے لیے فیس نہیں ہے بلکہ ان امتحانات میں بھی شرکت کی کوئی فیس نہیں ہے۔ یہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہی نہیں بلکہ ثوابِ جاریہ ہے۔ نئی نسل جو اردو سے قطعی نابلد تھی وہ اردو لکھنے پڑھنے

کے قابل بن رہی ہے۔ غیر مسلم طلبا، وطالبات بھی شخصی دل چسپی لے کر اردو سیکھ رہے ہیں،

پڑھ رہے ہیں یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا"۔ (۳)

عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے اردو خواندگی کی ایک نئی تحریک شروع کر دی ہے۔ اپنی انتھک کوششوں سے ٹرسٹ نے ثابت کر دیا کہ اردو کے فروغ کے لیے صرف حکومتِ وقت پر تکیہ کرنے کے بجائے اپنے طور پر انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ اس تعلیمی ٹرسٹ نے نہ صرف اردو اسکول قائم کیے بلکہ ادارہ، ادبیاتِ اردو کے مالی بحران کو دور کرنے کے لیے دو لاکھ کا ٹرسٹ قائم کیا۔ ادارہ کے تعاون سے ہر سال ٹرسٹ نے اردو دانی اور زبان دانی کے امتحانات منعقد کروائے جس میں ہزاروں اردو کے شوقین بڑے، بچے، مرد و خواتین شرکت کرتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خدمات عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے بھی حاصل کیں تاکہ ان کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اردو دانی اور اردو زبان دانی، اردو انشا کے امتحانات بہ حسن و خوبی انجام پاسکیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنا تخلیقی ذہن استعمال کرتے ہوئے اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشاء کے امتحانات کو کل ہند سطح پر پھیلایا حتیٰ کہ جیل کے قیدی بھی ان امتحانات میں شریک ہونے لگے۔ بلالحاظ مذہب و ملت کے ہزاروں افراد نے اس نادر موقع سے اور زبان سیکھتے ہوئے ان امتحانات میں کامیابی بھی حاصل کی۔ پروفیسر محمد انور الدین کے بہ قول امتحان زبان دانی کے لیے نصاب کتاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جو حسبِ ذیل اراکین پر مشتمل تھی:

"پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر محمد انور الدین، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی،

ڈاکٹر بیگ احساس، رضی الرحمان، ڈاکٹر عالیہ خاں اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ"۔ (۴)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ادارہ، ادبیاتِ اردو کے تمام امتحانات کے جوابی بیاضات کی جانچ کے لیے "Spot Valuation" منعقد کرنے کے لیے بہت کوشش کی۔ بالآخر ان کی یہ سعی کامیاب ہوئی۔ چناں چہ ان کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے اردو فاضل کے امتحانات کا ہر سال برسر موقع جانچ کا انتظام کیا جاتا رہا ہے۔

الغرض پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے خود کو ادارہ، ادبیاتِ اردو کے لیے وقف کر دیا ہے۔ مرکزی مجلسِ

انتظامی کمیٹی کے ممبر ہونے کے علاوہ مختلف نصابی کمیٹیوں کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ شعبہ ۔امتحانات کے معتمد کی حیثیت سے اپنی گراں نمایاں اور بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔

○●○

حوالے :

۱ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد " سرگزشت ادارہ ادبیات " ۱۹۴۰، حیدرآباد ص: ۱۱

۲ راقم الحروف شخصی انٹرویو۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ مقام ادارہ ادبیاتِ اردو ایوانِ اردو حیدرآباد ۵/ نومبر ۲۰۰۲ء

۳ مضمون ادارہ ادبیاتِ اردو کے مختلف شعبے، مشمولہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایڈیٹر پروفیسر محمد علی اثر۔ جامعہ عثمانیہ ۱۹۹۹، ص: ۳۳

۴ راقم الحروف شخصی انٹرویو، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بہ تاریخ ۲/ نومبر ۲۰۰۲ء

۵ پروفیسر محمد انور الدین مضمون عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ۔ اردو تعلیم کی مہم

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ
نقادوں اور معاصرین کی نظر میں

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی زندگی کے علمی ،ادبی ،سماجی و تہذیبی سفر کے دوران نامور محققین ، ادیبوں ، شاعروں ،نقادوں اور دانش وروں سے ملاقات کی ان سے استفادہ کیا ان سے متاثر ہوئے اور ان کو اپنی تحقیقی ،علمی و ادبی صلاحیتوں سے متاثر بھی کیا اور ان سے ادب کو زندگی میں اور زندگی کو ادب میں برتنے کا سلیقہ سیکھا ۔ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" کے نام سے ان کا تحقیقی کارنامہ جب منظرِ عام پر آیا تو علمی و ادبی حلقوں اور اردو ادب کے نقادوں کی جانب سے انھیں تحسین و آفرین کے تمغے ملے ۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف پر ان کے اساتذہ اور دیگر ماہرینِ ادب نے اپنی قیمتی آراء سے انھیں نوازا ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں جن محققین ،نقادوں ،ادیبوں ، شاعروں اور اساتذہ نے اپنی آراء پیش کی ان میں پروفیسر مغنی تبسم ،پروفیسر گوپی چند نارنگ ،پروفیسر عبدالستار دلوی ،پروفیسر غلام عمر خاں ،پروفیسر یوسف سرمست ،پروفیسر اکبر حیدر کاشمیری ، مرزا ظفرالحسن ،پروفیسر رفیعہ سلطانہ ،پروفیسر نثار احمد فاروقی ،ڈاکٹر جمیل جالبی ،پروفیسر مسعود حسین خاں ،پروفیسر سلیمان اطہر جاوید وغیرہ جیسی مایہ ناز ہستیاں شامل ہیں ۔

پروفیسر مغنی تبسم ،ڈاکٹر غلام عمر خاں اور پروفیسر یوسف سرمست کا شمار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے اساتذہ میں ہوتا ہے اور انھوں نے اپنے شاگرد کی تخلیقات کا پیش لفظ و تعارف لکھ کر ان کی تحقیقی صلاحیتوں کے محاسن و معائب بیان کرتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے ۔ مرزا علی لطف حیات اور کارنامے کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

" مرزا علی لطف کے نثری اور شعری کارناموں کی اہمیت متقاضی تھی کہ ان کی حیات اور ادبی خدمات کا

تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ بعض محققین نے اس طرف توجہ بھی کی لیکن کسی وجہ سے اس کام کو آگے نہیں بڑھا سکے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس موہوم امید کے ساتھ کہ وہ لطف کی حیات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ان کی شعری تخلیقات تک رسائی حاصل کر سکیں گے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ ابتدا میں انھیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ بالآخر ان کی مساعی بار آور ہوئیں۔ حیات لطف کے بارے میں چند اہم معلومات فراہم کرنے کے علاوہ انھوں نے تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لطف کے نام، توطن، تلمذ سے لے کر تاریخ وفات تک بہت سے متنازع فیہ امور کی یکسوئی کر دی۔ دوسرا اہم کام انھوں نے یہ کیا کہ "گلشنِ ہند" کا گلزار ابراہیم اور دوسرے تذکروں سے موازنہ کرتے ہوئے لطف کے اس کارنامے کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ سب سے بڑھ کر یہ انھوں نے لطف کے دیوان کو کھوج نکالا اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لے کر لطف کو صفِ دوم کے ایک قابلِ ذکر شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا۔۔۔ "ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے مقالے میں کچھ ایسے گوشے ابھارے ہیں جو اہلِ تحقیق کو دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔" (۱)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کے مجموعہ "خوش نفساں" کے پیش لفظ میں پروفیسر مغنی تبسم یوں رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ جامعہ، عثمانیہ میں اردو کے استاد ہیں۔ شعر و ادب کے مطالعے، تدریس و تحقیق کا نہ صرف اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ ذوق لگن کی حد تک پہنچ گیا ہے۔۔۔ زیرِ نظر کتاب ان سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں بعض ادبی رسائل اور زیادہ تر روزنامہ "سیاست" میں شائع ہوتے رہے۔ یہ اصل میں صحافتی انداز کی تحریریں ہیں جن کا مقصد حیدر آباد کی سماجی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں کی حیات اور کارناموں سے قارئین کو متعارف کروانا ہے۔۔۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے جن مشاہیر کے تعارف نامے لکھے ہیں، ان کا ریاست کی تہذیبی زندگی پر گہرا اثر رہا ہے۔

ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ تحقیق و تفتیش، شخصی ملاقاتوں اور انٹرویو کے ذریعہ مصدقہ سوانحی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ اس طرح یہ مضامین آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کے مستند ماخذین بن جائیں گے۔۔۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کا طرزِ تحریر سادہ اور شگفتہ ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب دل چسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔" (۲)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی مرتبہ کتاب " یدِ بیضا " میں تاثرات کے عنوان سے پروفیسر مغنی تبسم نے اپنے شاگرد کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ جو اپنے ماموں کے غیر مطبوعہ کلام کو مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ حضرت برق موسوی کی شاعری کے تمام مجموعے اب کم یاب بلکہ نایاب ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کا کلیات نہ سہی کم از کم ان کے کلام کا ایک جامع انتخاب مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ یقین ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اس اہم کام کی طرف بھی توجہ دیں گے۔" (۳)

- ڈاکٹر غلام عمر خاں :

پروفیسر مغنی تبسم کے علاوہ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے بھی اپنے شاگرد رشید پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی بیش تر تصانیف پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ چناں چہ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " کے گرد پوش پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے حالات کی چھان بین میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے تمام قابل حصول ماخذوں کو ٹٹولا ہے۔ مدلل بحثیں کی ہیں، مختلف بیانات کی تنقیح کی ہے اور اصابت رائے کے ساتھ نتائج اخذ کیے ہیں۔۔۔ اکبر صاحب شستہ اور رواں زبان لکھتے ہیں۔ اندازِ بیان محتاط اور وقیع ہے۔ جس میں علمی شان جھلکتی ہے میں ڈاکٹر صاحب

کو ان کی پہلی تصنیف کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں وہ ایک حوصلہ مند نوجوان ہیں مجھے توقع ہے کہ ان کی ادبی اور تحقیقی کاوش جاری رہیں گی اور وہ آنے والے دنوں میں اردو زبان و ادب کی دنیا میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں گے۔" (۴)

"دیوانِ لطف" کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر غلام عمر خاں یوں رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اس سے قبل لطف پر ایک مبسوط کتاب " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" شائع کرچکے ہیں۔ جو ان کے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے پر مبنی تھی۔ "دیوانِ لطف" کی ترتیب و تدوین ڈاکٹر اکبر صاحب کے تحقیقی کام کا گویا ایک تسلسل ہے۔۔۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے متعدد مخطوطوں سے ان کے چیدہ چیدہ کلام کو یکجا کیا ہے اور مختلف متون کے باہمی مقابلے کے بعد تدوین متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں "دیوان لطف" کی ترتیب و تدوین کی ہے اور ضروری تعارف کے ساتھ اسے شائع کر رہے ہیں۔۔۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ صاحب کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو اسے انہماک، جاں فشانی اور سلیقے کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیشِ نظر تحقیقی کاوش بھی متذکرہ خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔۔۔ ڈاکٹر اکبر صاحب تگ و دو کر کے ایسے (مشکل) الفاظ کو قدیم زبان کے ماہرین کی مدد سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود جو الفاظ حل نہیں ہوسکے انھیں دیانت داری کے ساتھ ان کی نشان دہی کر دی ہے۔ علمی مسائل میں تحقیق و تفحیص کی یہ لگن قابلِ قدر ہے۔" (۵)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکوں کا مجموعہ " خوش نفساں" کا تعارف لکھتے ہوئے ڈاکٹر غلام عمر خاں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ عثمانیہ یونیورسٹی میں ادبیاتِ اردو کے استاد ہیں اور گزشتہ چند برسوں سے تحقیق و تصنیف میں منہمک ہیں۔۔۔ پیش نظر کتاب چند ادبی اور سماجی

شخصیتوں کا تعارف ہے۔ جن میں سے اکثر کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے۔۔۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ نے اپنے انتخاب میں ایسی شخصیتوں کو شامل کیا ہے جو ہماری سماجی اور علمی زندگی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر یا قابلِ ذکر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔ وہ اس میدان میں اور آگے بڑھیں تو ایسی متعدد ہستیاں ماضی اور حال میں مل جائیں گی۔ جن کی خدمات کا اعتراف سماج کی خدمت بھی ہوگی اور اردو زبان کی بھی۔" (۶)

"عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" کے اندرونی گرد و پوش پر ڈاکٹر غلام عمر خاں لکھتے ہیں:

"عزیز مرزا کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کا احاطہ کرنے کے لیے ڈاکٹر اکبر صاحب نے دوسرے ماخذوں کے علاوہ خود عزیز مرزا کے ذی مرتبت اخلاف، حیدرآباد اسٹیٹ آرکائیوز اور دفاتر باب حکومت حیدرآباد کی قدیم امثلہ کی مدد سے نادر اور قیمتی مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے خوش سلیقگی کے ساتھ ناقدانہ انداز میں پیش کیا ہے۔" (۷)

"یدِ بیضا" شعری مجموعے کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ڈاکٹر غلام عمر خاں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"پیش نظر مجموعہ " یدِ بیضا " برق صاحب کی وفات کے تقریباً دو دہے بعد ان کے فاضل عزیز پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صدر شعبہ ، اردو پوسٹ گریجویٹ کالج (عثمانیہ یونیورسٹی) سکندرآباد لائقِ مبارک ہیں کہ انھوں نے اپنے منجھلے ماموں حضرت برق موسوی مرحوم کے اس مجموعے کو تلاش و تفحص کے ساتھ یکجا کیا اور اسے محققانہ بصیرت کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔" (۸)

"نظیر شناسی" کے تعارف میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ڈاکٹر غلام عمر خاں نے ان خیالات کا اظہار کیا:

"اس مجموعہ کے مرتبین ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر محمد علی اثر شعبہ ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے تحقیقی درجوں کے اساتذہ ہیں۔ جو تدریس کے ساتھ ساتھ انہماک اور وقف شدگی

کے ساتھ تحقیق و تصنیف کا حق بھی ادا کر رہے ہیں۔ تحقیق و تعلّم میں سرگرمی کے بغیر تدریس کا حق بھی ادا نہیں ہوتا، ڈاکٹر اکبر اپنی مبسوط کتابوں "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے"، "دیوانِ لطف"، "خوش نفساں" اور "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" کے ذریعہ دنیائے اردو میں متعارف ہو چکے ہیں۔ ان کی معیاری تصانیف کو اہلِ نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ان کا مقام متعین ہو چکا ہے۔" (۹)

- پروفیسر گوپی چند نارنگ :

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے نامور محقق و نقاد ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصنیف "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"مرزا علی لطف دورِ فورٹ ولیم کالج کی ان ادبی شخصیات میں سے ہیں جن پر اب تک پوری توجہ نہیں کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے تذکرہ گلشنِ ہند کے مختلف متون پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان حصوں کی نشان دہی کی ہے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے تمام نسخوں کا موازنہ کر کے اس بارے میں نہایت اہم معلومات فراہم کر دی ہیں۔۔۔ مصنف نے مرزا علی لطف کا دیوان عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں کھوج نکالا ہے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اسـ(لطف کے) سارے شعری سرمایہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور لطف کی خوش گوئی اور سخن آفرینی کی تحسین قدر کی ہے۔۔۔ مقالے کے آغاز میں لطف کی سوانحی کڑیاں ملائی گئی ہیں اور ان کی شخصیت کو مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر جگہ تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اپنی معلومات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اگر ہماری تحقیق نسبتاً غیر معروف ادبی شخصیتوں پر اس طرح توجہ صرف کرے تو ادبی تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔" (۱۰)

- ڈاکٹر نثار احمد فاروقی :

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحقیقی کام کے بارے میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں :

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ استاد شعبہ ٔ اردو نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کے لیے مرزا علی لطف کی شخصیت اور تصانیف کو منتخب کیا ہے۔ انھوں نے تمام معلوم مصادر کے علاوہ بعض ایسے ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جن کا ابھی تک پورا استعمال نہیں ہوا تھا۔ فاضل مقالہ نگار نے بہت محنت اور سلیقے کے ساتھ یہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کی اشاعت سے نہ صرف مرزا علی لطف کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ عہدِ متوسطین کی ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہمیں دست یاب ہو جاتی ہے۔ دانش گاہوں کے بہت سے تحقیقی مقالے عموماً سطحی ہوتے ہیں اور چھپوانے سے زیادہ چھپانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ علمی کاوش یقیناً قابلِ قدر اور لائقِ مبارک باد ہے۔" (۱۱)

- پروفیسر رفیعہ سلطانہ :

پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی رہ چکی ہیں۔ جامعہ ٔ عثمانیہ سے وابستہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ان کی رائے اس طرح ہے :

"اردو تحقیق کے میدان میں جامعہ ٔ عثمانیہ ایک مینارہ ٔ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جامعہ کے معلمین اور متعلمین نے اردو ادب میں عہد آفرین کارنامے پیش کر کے تحقیق کی بڑی جان دار اور شان دار روایات قائم کی ہیں۔ " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " کے مصنف ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تحقیق میں اس روایت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کی حیات اور کارناموں بالخصوص اس کے اہم اور مشہور تذکرے "گلشنِ ہند" پر ناقدانہ اور محققانہ نظر ڈالی ہے۔۔۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے ہند اور بیرونِ ہند کے کتب خانوں سے نایاب و نادر مواد اکٹھا کر کے محققین اردو کے سامنے ایک نیا باب کھولا ہے۔ نوجوان مصنف ایک برگزیدہ اور علم دوست خاندان کے نام لیوا ہیں۔ ان کے بزرگوں نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ مرزا علی لطف کی حیات اور کاناموں کے ذریعہ اردو تحقیق کے ایک وسیع میدان میں ایک جانباز، ذہین سپاہی کا داخلہ ہو رہا ہے۔ اسس کے مطالعہ کے بعد "مشک آنست کہ خود ببوید" کے مصداق اس کا اندازہ خود قارئین کو ہوگا۔" (۱۲)

- ڈاکٹر جمیل جالبی :

اپنی تاریخ ادب اردو کی تالیف کے لیے مشہور پاکستان کے ڈاکٹر جمیل جالبی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تحقیقی کارناموں پر اس طرح اپنی رائے ظاہر کر رہے ہیں:

"آپ کی دو کتابیں "خوش نفساں" اور "دیوانِ لطف" موصول ہوئیں جن کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ جس خلوص سے اور توجہ سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں قابلِ تحسین بات ہے۔" (۱۳)

- ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری :

کشمیر یونیورسٹی کے ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیقی کاوشوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"آپ نے "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" مرتب کر کے اردو تنقیدی ادب میں ایک گراں بہا اضافہ فرمایا ہے۔ آپ کی محنت کی داد دل کی گہرائیوں سے دیتا ہوں۔ آپ نے اس (گلشنِ ہند) تذکرے کی جو اہمیت بیان کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ امید ہے کہ تحقیقی

کاموں کے سلسلے میں یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔" (۱۴)

- مرزا ظفرالحسن :

مرزا ظفرالحسن ادارہ یادگار غالب کراچی پاکستان سے وابستہ ہیں۔ وہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے فن پر یوں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"آپ نے ایک ایسی شخصیت پر مقالہ لکھا اور کتابی صورت میں شائع کیا جس کے نام سے نئی نسل کو خیر کیا واقف ہوگی ہماری پشت کے لوگ بھی جنھیں تحقیق کا چسکا نہیں۔ یا اس نوع کے اسلاف کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کرتے لطف کے نام تک سے ناآشنا ہوں گے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ موضوع کا انتخاب کیا ہوگا اور مواد کی تلاش میں بھی آپ کو مشکل پیش آئی ہوگی۔ آپ نے نہ ہمت ہاری ہوگی اور نہ مایوس ہوئے ہوں گے۔ میں آپ کی کاوش اور ہمت کی دل سے داد دیتا ہوں۔ میں اس کتاب کو ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔" (۱۵)

- پروفیسر یوسف سرمست :

جامعہ عثمانیہ کے استاد اردو پروفیسر یوسف سرمست اپنے شاگرد اور رفیق کار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ میرے رفیق کار ہیں۔ وہ بڑے فعال اور متحرک انسان ہیں۔ گرم دمِ جستجو ہی نہیں گرم دمِ گفتگو بھی رہتے ہیں انھوں نے مسلسل کوشش و کاوش سے زندگی کے کٹھن مرحلے اور دشوار گزار راستے طے کیے ہیں۔ ان کو ہمیشہ اپنی محنت کا پھل ملا۔ مسلسل جدوجہد کے ذریعہ ترقی حاصل کی ہے۔ آج وہ اردو کے ریڈر کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔۔۔ان کی ترقی بہ ظاہر حیران کن ہے لیکن یہ یقین محکم اور عمل پیہم

کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ دانائے راز نے کہا ہے عمل ہی کے ذریعہ زندگی جنت بھی بنتی ہے جہنم بھی اور اسی سے یہ خاکی نوری فاری بنتا ہے اسی اجمال کی تفصیل اکبر کی زندگی میں ملتی ہے۔۔۔ حرکت و عمل سے ایک گلہری بھی پہاڑ پر فوقیت حاصل کرلیتی ہے۔ اگر کسی پہاڑ میں یہ حرکت و عمل کی قوت آجائے تو وہ کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ اس کو اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اکبر کو دیکھیے اکبر اپنے ڈیل ڈول ہی نہیں طرز تخاطب سے بھی متاثر کرتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا ہی نہیں دوسروں کا بھی کام انہماک اور لگن کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی ایک بار ان سے ملتا ہے بہت اچھا تاثر لے جاتا ہے اور انھیں یاد کیے بغیر نہیں رہتا۔۔۔ اکبر نے اپنی لگاتار جدوجہد کوشش و کاوش سے زندگی کے جن شعبوں میں کامیابی حاصل کی ان ہی میں سے ایک ادبی میدان ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے ہی تحقیقی کام "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" کے ذریعہ دنیائے ادب میں مقام حاصل کرلیا ہے۔ اس کے بعد وہ ادبی اور تحقیقی کام میں لگے رہے اور "دیوانِ لطف" کو مرتب کر کے شائع کیا۔ وہ تخلیقی نوعیت کے کام بھی انجام دے سکتے ہیں۔ جس کا ثبوت ان کی کتاب "خوش نفساں" ہے اس میں مختلف سربرآوردہ شخصیتوں کے خاکے ہیں۔ خاکہ نگاری کے بعد وہ سوانح نگاری کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ ان کی زیرِ نظر کتاب "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" مختصر سوانح عمری ہے۔ جو بہت دل چسپ انداز ہی میں نہیں بلکہ بڑی تحقیق کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انھوں نے ہر ممکن طریقہ پر عزیز مرزا کے تعلق سے مواد حاصل کیا ہے۔ ۔۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں قدیم حیدرآباد کی زندگی کا ایک اہم رخ بے نقاب ہوتا ہے۔ امید ہے کہ اکبر کی اس کتاب کی پذیرائی دنیائے ادب میں حسبِ دل خواہ ہوگی اور ان کو اپنی محنت اور کاوش کی پوری طرح داد ملے گی۔" (١٦)

• پروفیسر مسعود حسین خاں :

پروفیسر مسعود حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ ، اردو رہ چکے ہیں وہ اپنے شاگرد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"آپ کی گراں قدر تصنیف مرزا علی لطف حیات اور کارنامے پڑھی اور لطف آیا یقیناً اس لائق تھی کہ مختلف اردو اکیڈیمیوں کے انعامات سے نوازی جائے اپنے اس علمی شوق کو جاری رکھیے۔ آج کل اردو میں کام کرتے رہنا قوت فرحت ہستی کے غم سے کم نہیں۔ لیکن یہ اہم اس لیے ہے کہ اس میں "مےَ وانگبین" کی کوئی لاگ نہیں ! آپ نے واقعی بہت محنت کی اور کئی دور کی کوڑیاں لائے ہیں۔" (۱۰)

• پروفیسر عبدالستار دلوی :

پروفیسر عبدالستار دلوی بمبئی یونیورسٹی کے صدر شعبہ رہ چکے ہیں۔ وہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ سے میں گزشتہ پندرہ سال سے متعارف ہوں۔ ان کی تحقیقی کی دل چسپیاں فورٹ ولیم کالج کی اس عظیم روایت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے نثر نگاری کی بنیادیں استوار ہو سکیں اور ہمارے یہاں روایتوں کی پاسداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ ہمیشہ سے تحقیقی کاموں میں سرگرمِ عمل رہے اور ادبی تاریخ کے مختلف گوشوں کو اہلِ ادب کے سامنے پیش کرتے رہے۔ ۔ ۔ ان کے تحقیقی سفر کا آغاز مرزا علی لطف تھے جو اردو نثر اور تذکرہ نویسی کے جد امجد تھے۔ انھوں نے مرزا علی لطف کی حیات اور کارناموں کو انتہائی محنت اور لگن کے ساتھ پایہ ، تکمیل کو پہنچایا اور پھر دیوانِ لطف کو بھی مرتب کیا۔ ان کی دل چسپیاں متنوع ہیں چناں چہ تحقیق کے ساتھ خاکہ نگاری کو بھی انھوں نے اپنا موضوع بنایا اور اچھے خاکے تصنیف کیے۔ انھوں نے دیگر متعدد موضوعات پر بھی کتابیں تصنیف کیں۔ جنھیں اب زیورِ طبع سے آراستہ ہونا ہے، 'محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے' بھی ان کی تحقیقی فتوحات میں سے ایک ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب انھوں نے اپنی دل چسپیوں کو اور وسعت دے کر ڈاکٹر محمد علی اثر کے ساتھ نظیر شناسی کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اپنی ان ادبی خدمات کے لیے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔" (۱۸)

- پروفیسر سلیمان اطہر جاوید :

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی کے صدر شعبہ رہ چکے ہیں اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے رفیق ہیں۔ اپنے ساتھی کے بارے میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ شعبہ ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے تحقیقی درجہ کے استاد ہیں اور تدریس کے ساتھ ساتھ انہماک اور وقف شدگی کے ساتھ تحقیق و تصنیف کا حق بھی ادا کر رہے تحقیق و تعلم میں سرگرمی کے بغیر تدریس کا حق بھی ادا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اکبر اپنی مبسوط کتابوں "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے "، "دیوانِ لطف "، "خوش نفساں "اور "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے "کے ذریعہ دنیائے اردو میں متعارف ہو چکے ہیں۔ ان کی معیاری تصانیف کو اہلِ نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ان کا مقام متعین ہو چکا ہے۔۔۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے ایک مختصر عرصہ میں جامعہ ، عثمانیہ کے نئے لکھنے والوں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ جس موضوع پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا اس کا حق ادا کیا۔ علمی حلقوں میں ستائش کی نظر سے دیکھے گئے اور داد حاصل کی۔ نظیر شناسی شعر و ادب سے ان کے غیر معمولی شغف ہی کا اظہار نہیں ایک عظیم شاعر کو خراج عقیدت بھی ہے۔" (۱۹)

- عابد علی خاں :

عابد علی خاں (مرحوم) حیدرآباد سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ سیاست کے مدیر تھے۔ اخبار کا ادبی ایڈیشن اردو تخلیق کاروں کے لیے اظہار کی ترسیل کا ذریعہ رہا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خاکہ

نگاری کے بارے میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے سوانحی مضامین کے مجموعے کی ترتیب و اشاعت کو میں حیدر آباد سے شائع ہونے والی نئی مطبوعات میں اہم مقام کا حامل سمجھتا ہوں۔ بیگ صاحب سے دو سال قبل میں نے خواہش کی تھی کہ وہ نواب سعید جنگ بہادر کے حالاتِ زندگی قلم بند کریں۔ .. بیگ صاحب نے جب یہ مضمون لکھا میں نے ان سے ممتاز ماہرِ تعلیم پروفیسر سید علی اکبر پر بھی مضمون قلم بند کرنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد انھوں نے حیدر آباد کی ممتاز شخصیتوں سے انٹرویو لیے۔ ان کے تمام مضامین شائع ہوئے۔ اب یہ مضامین کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں ... بیگ صاحب نے جن شخصیتوں کا حیدر آباد کی ہمہ جہتی زندگی سے تعلق رہا ہے۔ اس لیے یہ مضامین تاریخی اور سوانحی اہمیت رکھتے ہیں۔" (۲۰)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے فن پر مشاہیرِ ادب نے نہ صرف خطوط کی شکل میں نثر میں اپنی آرا۔ کا اظہار کیا ہے بلکہ منظوم انداز میں بھی ان پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ حیدر آبادی شاعر صاحبِ حیدر آبادی نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف "دیوانِ لطف" اور "خوش نفساں" کی رسم رونمائی بہ تاریخ ۳۰ / دسمبر ۱۹۸۳ء مطابق ۱۴۰۴ھ کے حساب سے دو قطعات تاریخ لکھے ہیں وہ اس طرح ہیں:

- صاحبِ حیدر آبادی :

قطعہ تاریخ اشاعت "خوش نفساں"

خاکے لکھے ہیں ڈاکٹر اکبر نے خوش نما
صاحب ہیں صاحبانِ ادب ان میں سب کے سب
میں نے نکالا سال یہ طبع کتاب کا
محبوب نام خوش نفسانِ علا ادب (۲۱)

۱۴۰۴ھ

طبع دیوانِ لطف

تدوین بھی ہوئی ہے اشاعت بھی ہوگئی
آئینہ کمال ہے دیوانِ لطف کا
صاحب جو پوچھے سال تو اکبر سے تم کہو
فیض در جمال ہے دیوانِ لطف کا (۲۲)

۱۴۰۴ ھ

• ڈاکٹر عقیل ہاشمی :

ڈاکٹر عقیل ہاشمی استاد شعبہ ، اردو جامعہ ، عثمانیہ و پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے رفیق کار ہیں۔ انھوں نے اپنے ساتھی کی کتاب " عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے " کی رسم اجرا مورخہ ۱۲/ اپریل ۱۹۸۷ء م ۱۴۰۷ھ پر یہ قطعہ تاریخ کہا :

تاریخی قطعہ بے مثل ، ۱۹۸۷ء

ہیں میرے دوست بیگ عالی جناب
نکتہ داں و فہیم اور شاداب
صاحبِ طرزِ ادیب اور شاعر
جانتے ہیں وفا کے بھی آداب
حق ادا کرتے ہیں ادب کا جو
ان کی تحقیق ہے برک زر تاب
ہے یہ تصنیفِ تازہ کی ندرت
بادہ ، شوق کا ہے لب لباب
کارنامے حیات شخصیت

سب پہ رکھتے ہیں نظر احتساب
پیش تو بھی عقیل اب کر دے
اپنے جذباتِ تہنیت فر داب
سچ یہی ہے عزیز مرزا پر
منفرد جان شاندار کتاب

۱۴۰۷ھ ۱۰از نتیجہ ۔فکر زیبا ڈاکٹر عقیل ہاشمی (۲۳)

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں مشاہیرِ ادب اور معاصرین کی آراء کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے محققین نقادوں ،شعرا ،ادیبوں اور دانشں وروں نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیقی صلاحیتوں کی داد دی ہے۔ ان کی داد اس امر کی غماز ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک نامور محقق ہیں اور دیگر اصنافِ ادب پر بھی عبور رکھتے ہیں اور اتنے زیادہ مشاہیر اور معاصرین کی آراء سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ علمی و ادبی حلقوں میں بھی نہ صرف ہر دل عزیز ہیں بلکہ مشہور بھی ہیں۔ گزشتہ صفحات میں پیش کردہ مشاہیر اور معاصرین کی آراء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے فن اور شخصیت کے صرف محاسن بیان کیے گئے ہیں۔ معائب بیان نہیں کیے گئے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے چند ایک مقامات پر اشاروں میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے ان کے فن کی وسعت طلبی کا اظہار کیا ہے لیکن عمومی طور پر ان تبصروں میں تصویر کا ایک رخ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کی تقاریظ میں عموماً مصنف کی خوبیوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور خامیوں سے جان بوجھ کر پردہ پوشی کی جاتی ہے۔ یہ عموماً آپسی تعلقات دوستی اور استاد شاگرد کے خوش گوار رشتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اردو تنقید میں یہ خامی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اس سے کسی تخلیق کا غیر جانب دارانہ جائزہ نہیں ہو پاتا۔ اس کے علاوہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے نام لکھے گئے خطوط میں یہ آراء ملتی ہے اور یہ خطوط خود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف میں شامل کیے گئے ہیں۔ کوئی بھی مصنف اپنی تصانیف میں اپنی خطوط کو شامل کرتا ہے جن میں اس

کی مدح سرائی کی گئی ہو۔ ان تمام امور سے قطع نظر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے آج سے دس بیس سال پہلے جو کچھ تحقیق، تدوین اور مضامین تخلیق کیے ہیں وہ اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کو سراہا جائے۔ چناں چہ مشاہیر اور معاصرین ادب کی آراء میں مدح سرائی سے زیادہ ایک پائے کے محقق کی حقیقی معنوں میں تعریف و توصیف ہے۔

○●○

حوالے

۱ پروفیسر مغنی تبسم بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ۲ تا ۴

۲ پروفیسر مغنی تبسم بہ حوالہ "خوش نفساں" ص: ۱۰ تا ۱۳

۳ پروفیسر مغنی تبسم بہ حوالہ "ید بیضا" ص: ۲۰

۴ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" گرد پوش

۵ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "دیوانِ لطف" ص: ۷ تا ۱۰

۶ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "خوش نفساں" ص: ۸، ۹

۷ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" گرد پوش

۸ ڈاکٹر غلام عمر خاں بہ حوالہ "ید بیضا" ص: ۷۔ ۱۶

۹ ڈاکٹر غلام خاں بہ حوالہ "نظیر شناسی" ص: ۸

۱۰ پروفیسر گوپی چند نارنگ بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ی

۱۱ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بہ حوالہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ص: ک

۱۲ پروفیسر رفیعہ سلطانہ بہ حوالہ "دیوانِ لطف" ص: ۱۳۹

۱۳ ڈاکٹر جمیل جالبی بہ حوالہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص: ۲۳۸

۱۴ ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری بہ حوالہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۲۵۱

۱۵ مرزا ظفرالحسن بہ حوالہ "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۲۵۲

۱۶ پروفیسر یوسف سرمست بہ حوالہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۱۲

۱۷ پروفیسر مسعود حسین خاں بہ حوالہ "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۲۴۶

۱۸ پروفیسر عبدالستار دلوی بہ حوالہ "نظیر شناسی" ڈسٹ کور

۱۹ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید بہ حوالہ "نظیر شناسی" ص:۸۔۱۴

۲۰ عابد علی خاں بہ حوالہ "خوش نفساں" ص:۶۔۷

۲۱ صاحب حیدر آبادی بہ حوالہ "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۲۵۳

۲۲ صاحب حیدر آبادی بہ حوالہ "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۲۵۳

۲۳ ڈاکٹر عقیل ہاشمی بہ حوالہ "عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" ص:۲۵۴

○●○

مشاہیرِ ادب و معاصرین

دوست احباب، رشتے داروں اور شاگردوں کے تاثرات

- **پروفیسر مغنی تبسم سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی :**

پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پی ایچ۔ ڈی مقالہ کے نگران پروفیسر مغنی تبسم رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عرصہ تک جامعہ، عثمانیہ میں دونوں رفیق کار کی حیثیت سے کام کرچکے ہیں۔ تاحال ادارہ، ادبیاتِ اردو معتمد عمومی پروفیسر مغنی تبسم ہیں اور اسی ادارہ کے اعزازی معتمد شعبہ، امتحانات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہیں۔ ہر معاملہ میں دونوں میں بڑی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے مرزا اکبر علی بیگ کے متعلق کیوں رقم طراز ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ میرے عزیز شاگرد رہے ہیں۔ نامساعد معاشی حالات کی وجہ میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ملازمت اختیار کرلی لیکن ان کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی لگن تھی۔ اورینٹل اردو کالج کا قیام عمل میں آیا تو انھیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع مل گیا۔ اردو کالج کی کلاسیں شام میں ہوتی تھیں۔ اکبر علی بیگ صاحب نے ڈپ۔ او۔ ایل میں داخلہ لیا جو انٹرمیڈیٹ کے مماثل تھا۔ وہ دن میں ملازمت کرتے اور شام کو کالج میں تعلیم پاتے۔ بی او ایل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ام۔ اے۔ کیا۔ سٹی کالج میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ چند سال بعد انھوں نے میری نگرانی میں مرزا علی لطف پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام ہے انھوں نے مواد کی فراہمی کے لیے ہندستان اور بیرونِ ہند کے تمام اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ۱۹۸۰ء میں اس مقالے کی اشاعت ہوئی جسے علمی ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمی کو جاری رکھا۔ محمد عزیز مرزا کی حیات اور کارناموں پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اسی سال ان کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ خوش نفساں بھی شائع ہوا۔ اس مجموعے میں

مختلف عالموں، ادیبوں اور دانش وروں کے سوانحی خاکے شامل ہیں۔ ان کا ایک اور اہم کام دیوانِ حفیظ دہلوی کی تدوین ہے۔ مرزا اکبر علی بیگ نے مضمون نگاری کی ابتدا اردو کالج میگزین سے کی جس میں "جان فٹنر جیرالڈ کنیڈی پر ان کا پہلا مضمون شائع ہوا پھر اکبر الہ آبادی پر ایک عمدہ مضمون تحریر کیا۔ ان کے کئی مضامین اور تبصرے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ جنھیں یک جا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جانا چاہیے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ گزشتہ کئی سال سے ادارہ ادبیاتِ اردو کی مجلسِ انتظامی کے رکن اور شعبہ امتحانات کے معتمد ہیں۔ ان کی کاوشوں سے ادارے کے امتحانات کو فروغ ہو رہا ہے۔

مرزا اکبر علی بیگ کی شخصیت بڑی دل کش ہے ہنس مکھ، خوش مذاق اور شریف النفس انسان ہیں جس محفل میں شریک ہوتے ہیں اپنی زندہ دلی سے اسے خوش گوار بنا دیتے ہیں۔ مرزا اکبر علی بیگ کی شخصیت کا ایک اہم وصف وفاداری بہ شرطِ استواری ہے۔ ان کے بچپن اور طالبِ علم کے ساتھی آج بھی ان کے دوست ہیں۔ اپنے اساتذہ کا آج بھی پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ مرزا اکبر علی بیگ ایک جذباتی انسان ہیں ان کی خودداری کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ کسی مصلحت کا خیال کیے بغیر اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے انھوں نے نقصان بھی اٹھائے ہیں اور ان کی صحت بھی متاثر ہوئی دوستی محبت اور خلوص میں بھی جذباتی کا دخل رہتا ہے۔

آدمی کی شخصیت اور کردار کا اندازہ اس کی گھریلو زندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ مرزا اکبر علی بیگ ایک محبت کرنے والے شوہر ہیں، میاں بیوی میں شاید ہی کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔ ان کی بیگم بھی شوہر اور بچوں کا پورا خیال رکھنے والی سگھڑ ہنس مکھ اور ملن سار خاتون ہیں۔ وہ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر انھوں نے پوری توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک لڑکی ڈاکٹر ہے اور دو لڑکے امریکہ میں برسرِ کار ہیں۔ ان کا گھر خوش حالی کا مرقع ہے میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

۲۳/ دسمبر ۲۰۰۲ء

مغنی تبسم

سابق پروفیسرِ ان اردو عثمانیہ یونیورسٹی

•

• پروفیسر مسعود حسین ،سابق صدر شعبہ ،اردو عثمانیہ یونیورسٹی :

پروفیسر مسعود حسین خاں ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے مشفق اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی شاگردی میں دو برس سیر حاصل علمی تشنگی سے سیراب ہوئے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں اپنے اس شاگرد خاص کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

مجھے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ مرزا اکبر علی بیگ صاحب ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۸ء ایم۔ اے اردو میں میرے طالبِ رہے ہیں اور اس دوران انھوں نے "محمد عزیز مرزا شخصیت ، حیات اور کارنامے " پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھا تھا جو زیور طبع سے ہو کر سامنے آچکا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب پر نو کتابیں بھی شائع کی ہیں۔اس کے بعد زینہ بہ زینہ ترقی کر کے وہ جامعہ ، عثمانیہ کے شعبہ ، اردو کے پروفیسر اور صدر کے مناصب تک پہنچے تھے۔ آدھا درجن طلبہ اور طالبات نے ان کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی ہے۔

شروع سے ان کی شخصیت کا تاثر میرے ذہن میں ایک " چھلکتے ہوئے سیماب " کا سا رہا ہے ، پُر جوش اور پُر خلوص ،وفادار اور عقیدت مند ،ان تھک کام کرنے والے سامنے آجائیں تو ایک سیلاب کا سا گمان ہوتا ہے! ان کی شخصیت اور خلوص ایسا کہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا ،میں ان کے مراتب کے لیے ہمیشہ دست بہ دعا رہتا ہوں:

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

تاریخ ۱۵/ ۱۲/ ۲۰۰۲ء

مسعود حسین

سابق صدر شعبہ ،اردو ،عثمانیہ یونیورسٹی

•

- **پروفیسر غلام عمر خاں، سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی :**

پروفیسر غلام عمر خاں مرزا اکبر علی بیگ کے شفیق استاد رہ چکے ہیں جو ہائی اسکول کے زمانے ہی سے مرزا اکبر علی بیگ سے بہ خوبی واقف ہیں بعد میں رفیق کار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں پروفیسر غلام عمر خاں مرزا اکبر علی بیگ سے متعلق اپنے تاثرات اس طرح قلم بند کیے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں گزشتہ دو تین دہوں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان میں ایک اہم تحقیقی ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کی دریافت ہے۔

انسانی اکائی یا انسانی خودی مختلف صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ صلاحیتیں پوشیدہ اور خفتہ حالت میں ہوتی ہیں اور ابھرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ لیکن کارزار حیات میں انسانی خودی کو اپنی جیسی بے شمار انسانی اکائیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جو اپنی نمود اور حرکت و عمل کے لیے جدوجہد کرتی رہتی ہیں اور فطری طور پر ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں، برملا یا پوشیدہ طور پر۔ اس ازلی تصادم میں صلاحیتیں ایک عامل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف حالات و اتفاقات کا عامل (factor) بھی کارفرما ہوتا ہے، جو دوسری خودیوں کی جدوجہد پر مبنی ہوتا ہے۔ کبھی مستحقہ صلاحیتوں کا عامل کام کر جاتا ہے اور کبھی حالات و اتفاقات کی منفی قوت۔ پہلی صورت میں فرد کی صلاحیتوں کا نشوونما، ماحول کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے اور منفی قوت کی کامیابی متعلقہ انسانوں کی بدبختی پر منتہی ہوتی ہے۔ قدرت ایک ظالم تماشائی کی طرح بازیچہ اطفال کا یہ تماشا دیکھتی رہتی ہے۔

اکبر صاحب کو لڑکپن سے شعر گوئی کا چسکا پڑ چکا تھا۔ ان کے خاندان کے متعدد اصحاب کو شاعری اور تصنیف و تالیف سے دل چسپی رہی ہو۔ ۱۹۷۰ء میں جب اکبر صاحب نے شعبہ اردو سے ڈاکٹریٹ کیا تو پھر وہ یکسوئی اور انہماک سے تصنیف و تحقیق کے میدان میں داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی سروس میں آئے تو وقف شدگی کے ساتھ تحقیقی کام میں منہمک ہو گئے۔ ان کی تصانیف کی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوئی۔ متعدد آوارڈس ملک کے وقیع علمی اداروں کی طرف سے انھیں حاصل ہوئے جن کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ ڈاکٹر اکبر رواں اور معیاری زبان لکھتے ہیں اور خیالات کو موثر اور دل کش اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے

ہیں جامع انداز میں اس کا احاطہ کرتے ہیں۔ کسی شخصیت کا تعارف کرائیں گے تو اس کے ابتدائی حالات ہوسکے تو اس کے اجداد کی بھی خبر لائیں گے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں اس کی مصروفیات کا احاطہ بھی ہوگا۔ صاحب موضوع کا انتقال ہوچکا ہو تو اس کا تاریخ وفات بھی تحقیق کے ساتھ متعین کریں گے اور آخر میں اس کے کام کی قدر و قیمت کا جائزہ بھی پیش ہوگا۔

ڈاکٹر اکبر ایک کامیاب استاد رہے ہیں۔ ضروری تیاری کر کے لکچر دیتے ہیں۔ انھیں اپنے موضوع اور اطراف کے مسائل پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہ کھوکھلی لفاظی یا غیر متعلق باتوں سے کبھی طلبا کا وقت ضائع نہیں کرتے۔ ان کا لکچر ختم ہوتا ہے تو سننے والے اس اعتماد کے ساتھ اُٹھتے ہیں کہ انھوں نے کچھ حاصل کیا ہے یہی سبب ہے کہ وہ طلبا میں ہمیشہ مقبول رہے ہیں اور طلبا اور طالبات ان کا احترام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اکبر نیک سیرت اور صاحب کردار انسان ہیں۔ وہ بہ ظاہر مذہبی مزاج کے آدمی دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن ان کا کردار مذہب کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اکبر اور ان کی بیگم سکینہ اکبر دونوں پنج گانہ نماز کے عادی ہیں۔ رمضان کے مہینے میں صحت کے معمولی مسائل کے باوجود دونوں پابندی سے پورے روزے رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تینوں بچوں کی صرف تعلیم پر نہیں، ان کی کردار سازی پر بھی بڑی توجہ کی ہے۔ بچوں کی مذہبی اساس پر تربیت ہمیشہ ان کی سیرت پر گہرے اثرات مرتب کرجاتی ہے اور بعد کی منزلوں میں والدین کے لیے سکون و مسرت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ان کی بڑی لڑکی فردوس فاطمہ جو ڈاکٹر ہیں اور دونوں لڑکے غضنفر اور مرتضیٰ جو امریکہ میں انجینیئر ہیں سعادت مند اور اولاد کی طرح والدین کی صحت اور آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور بزرگوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس طرح اکبر صاحب اور بیگم سکینہ خوش نصیب والدین میں سے ہیں۔ خود اکبر صاحب کے کردار میں بزرگوں کا پاس و ادب اور خوردوں پر شفقت کا رویہ، ان کے شریفانہ خصائل میں داخل ہے۔

اکبر قوی سیرت انسان ہیں۔ خوش مزاج ہیں، لوگوں سے گرم جوشی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس لیے اجنبیوں سے بھی پہلی ملاقات ہی میں اچھے روابط پیدا کرلیتے ہیں۔ صاف گو ہیں اور بےلاگ گفتگو کرتے ہیں۔ اسی خصوصیت کی بنا پر لوگ ان کی صداقت کی قدر بھی کرتے ہیں۔

ان کی صاف گوئی کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی چیز راز نہیں ہوتی۔ ان سے راز کی بات نہیں کی جاسکتی۔ وہ ایسی کسی بات کو دبی زبان میں یا برملا فاش کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک بار ان سے اسی خصوصیت کا ذکر ہو رہا تھا۔ بیگم اکبر بھی موجود تھیں کہنے لگیں، صاحب میں تو ان سے کہتی ہوں آپ کسی قتل کے مجرم بھی ہوں، جرم کے مرتکب بھی ہوں، کوئی اس کا سراغ نہ لگا سکے تو بالآخر آپ ہی کی گفتگو سے اس کا انکشاف ہو کر رہے گا۔ اکبر صاحب کہتے ہیں زندگی کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد یہ عادت کر دی ہے سکینہ بی بی سے اس کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔

پروفیسر اکبر علی بیگ کی زندگی ایک نمونہ ہے کس طرح انسان ناسازگار حالات سے دوچار ہونے کے باوجود کسی اعلیٰ تر مقصود کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے منتخب محنت اور جدوجہد کے ذریعہ اپنا راستہ بناتا ہے اور زندگی کے کسی میدان میں اپنا دیرپا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اکبر صاحب میرے عزیز دوست ہیں جن کی بہی خواہی اور خلوص و محبت نے میری زندگی کو خوش گوار بنائے رکھا ہے۔

۱۰/ دسمبر ۲۰۰۲ء　　　　پروفیسر غلام عمر خاں

سابق شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

•

- **پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، سابق صدر شعبہ اردو، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی :**

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے رفیقِ خاص ہیں جن کی رفاقت ایک دوسرے کے لیے باعث افتخار ہے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہوئے راقم ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اچھے شاعر، اچھے محقق، اچھے ناقد، اچھے مرقع نگار، اچھے استاد۔۔۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ ایک اچھے دوست ہیں۔ باغ و بہار آدمی، کھلے دل کے، جب بھی ملیے، جہاں بھی ملیے، ہنستے بولتے اور اپنی خوش طبعی کے جلو میں۔ دوستوں عزیزوں اور طلبہ سے تعاون اور وقت پڑنے پر ان کی ہر طرح مدد کرنے کے لیے تیار۔ میرے ان کے مراسم کم از کم ۳۵-۴۰ سال سے ہیں اور جیسے

جیسے وقت گزرتا رہا یہ مراسم اور گہرے اور مخلصانہ اور قریبی ہوتے رہے۔ اس دوران مجھے تو ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی اور یقین ہے انھیں بھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہی ہوگی۔ جب بھی ملے محبتوں کے پھول برساتے ہوئے۔ وہ اکثر ملتے ہیں اور گھنٹوں ساتھ رہتا ہے لیکن طبیعت چاہتی ہے کہ وہ اور ملیں اور ملیں اور زیادہ وقت ان کا ساتھ رہے۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو دوست احباب میں انھیں مقبول بنائے رکھا ہے۔ دوستوں کا حق ادا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں جو بھی وقت ملتا ہے وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے ہیں اور یہ معمولی بات نہیں کہ تاحال ان کی تصنیف و تالیف اور ترتیب دی ہوئی دس کتابیں ہیں اور پانچ سات کتابیں تیار جو اشاعت کی منتظر ہیں اور یقین ہے کہ جلد شائع ہوں گی۔ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" ان کی اہم تحقیقی کتاب ہے جو انھوں نے غیر معمولی محنت، لگن اور توجہ کے ساتھ تحریر کی ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے "دیوانِ لطف" کی تدوین بھی کی ہے۔ "گلشنِ ہند" (تذکرہ۔ علی مرزا لطف) پر بھی اکبر علی بیگ کام کر رہے ہیں۔ برلن، لندن اور فرانس کے کتب خانوں سے انھوں نے اس تذکرہ کی فوٹو کاپیاں زرِ کثیر صرف کر کے حاصل کی ہیں۔ یہ کام اپنی نوعیت کا اور لاجواب ہوگا۔ دیوانِ حفیظ دہلوی اور برق موسوی کے شعری مجموعہ "یدِ بیضا" کی تدوین بھی انھوں نے کی ہے۔ "محمد عزیز مرزا کی شخصیت حیات اور کارنامے" بھی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا امتیازی کام ہے جس میں عزیز مرزا صاحب کی زندگی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے جو زیورِ طبع سے جلد آراستہ ہونے والا ہے۔ انھوں نے عزیز مرزا کے غیر مطبوعہ مضامین "نگارشاتِ عزیز مرزا" کے عنوان اور عزیز مرزا کے مکاتیب "مکاتیبِ عزیز مرزا" ترتیب دیے ہیں انھیں جلد سے جلد شائع ہونا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ڈاکٹر محمد علی اثر کے اشتراک سے "نظیر شناسی" جیسی ضخیم کتاب بھی ترتیب دی جس میں نظیر اکبر آبادی پر تحریر کردہ نامور اہلِ قلم کے مضامین یکجا ہیں۔ نظیریات کے سلسلے میں اس کتاب کی قدر و قیمت ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو مرقع نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ انھوں نے کئی شخصیات کے مرقعے ایسے دل چسپ پیرایہ میں تسوید کیے ہیں کہ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم ان شخصیات کے بارے میں پڑھ نہیں رہے

ہیں ان شخصیات کے ساتھ ہیں ان سے ملاقات کر رہے ہیں "خوش نفساں" ان کے مرقعوں کا مجموعہ ہے اور دوسرا مجموعہ "نفوسِ گرامی" زیرِ طبع ہے۔ ان مرقعوں سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی انشا پردازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی شگفتہ طرزِ تحریر کا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا شعر و ادب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اس کا اندازہ ان کے مضامین اور تبصروں سے لگایا جاسکتا ہے جو ملک کے موقر اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کئی مضامین اور تبصرے لکھے ہوں گے اور اب تو ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نقطہ نظر" اور تبصروں کا مجموعہ "محور" بھی شائع ہونے والے ہیں۔ تنقید و تبصرہ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ غیر جانب داری اور معروضیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے موضوع کا سیر حاصل احاطہ کرتے ہیں اور تنقید کے جدید اور اعلیٰ اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قلم اٹھاتے ہیں وہ تنقید سے دل آزادی کا کام نہیں لیتے بلکہ ادبی اور تہذیبی قدروں کی روشنی میں حق ادا کرتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے تلگو اکیڈمی اندھرا پردیش کے لیے تلگو ٹسٹ بک اور تلگو ورک بک بھی ترتیب دیے ہیں جو اردو داں حضرات کو تلگو سکھانے کے لیے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ادبی سفر شان دار ہے ان کی خدمات وسیع ہیں۔ آج بھی وہ لکھ رہے ہیں ان کا قلم خاموش نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اور لکھیں گے اور لکھتے رہیں گے۔ اردو شعر و ادب میں ان کی تحریریں روشن چراغوں کی طرح دور دور تک اجالا پھیلاتی رہیں گی۔۔۔ لیکن آخر میں میں پھر وہی بات کہوں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ہیں اور بہت کچھ ہیں لیکن وہ جو کچھ ہوں ایک اچھے دوست بھی ہیں اور مجھے ان کی دوستی بڑی پیاری ہے۔ ان جیسا دوست بہت کم لوگوں کو ملتا ہے اور ایسا دوست اسی وقت ایسا دوست ہوتا ہے جب وہ اچھا انسان ہو اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک اچھے انسان ہیں۔ میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں، ہمیشہ ہمیشہ!

۱۱/ دسمبر ۲۰۰۲ء سلیمان اطہر جاوید

صدر شعبہ، اردو، سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی۔

•

• پروفیسر حبیب ضیاء، سابق صدر شعبہ ء اردو، یونیورسٹی کالج فار ویمن، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد :

پروفیسر حبیب ضیاء، جو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے رفیق کار بھی ہیں مرزا اکبر علی بیگ کے ادبی خدمات، اصول پسندی کی کافی معترف ہیں جو اپنے تاثرات کو تحریری جامہ پہناتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بلند پایہ محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ جامعہ ء عثمانیہ میں انھوں نے اپنی تدریسی ذمہ داریوں کو بہ حسن و خوبی نبھایا۔ اساتذہ اور طلباء میں یکساں مقبول ہیں۔ وظیفہ پر سبک دوشی کے بعد بھی وہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ حیدرآباد کی کئی انجمنوں اور اداروں سے وابستگی، اردو زبان و ادب سے ان کے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ ادارہ ء ادبیاتِ اردو کے شعبہ ء امتحانات کے معتمد ہیں۔ اس اہم کام کو وہ بڑی مستعدی اور جانفشانی سے انجام دیتے ہیں۔۔۔ جامعہ ء عثمانیہ کی اہم ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ بچے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے خوش حال زندگی گزار رہے ہیں اور ماں باپ کا نام روشن کر رہے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اصول پسندی اور ادبی دیانت داری کے سبھی قائل ہیں۔ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔۔۔ حیدرآباد میں تنقیدی و تحقیق کے فروغ کا تذکرہ ترتیب دیا جائے یا کوئی تاریخ لکھی جائے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی خدمات کو یقیناً شامل کیا جائے گا۔

پروفیسر حبیب ضیاء ۲/ دسمبر ۲۰۰۲ء

سابق صدر شعبہ ء اردو، یونیورسٹی کالج فار ویمن، جامعہ عثمانیہ

•

• **پروفیسر محمد علی اثر، عثمانیہ یونیورسٹی کالج آف ویمن کوٹھی، حیدرآباد :**

پروفیسر محمد علی اثر اور پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ملازمت میں رفیق کار رہے ہیں اسی طرح نظیر شناسی کو اشتراک میں ترتیب دے کر دونوں جس طرح اردو ادب میں ایک مثالی رفاقت کا نمونہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد علی اثر اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ عثمانیہ یونیورسٹی کے ان اساتذہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تدریسی خدمات کے پہلو بہ پہلو تحقیق و تدوین اور تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ وہ ایک باغ و بہار، ملنسار اور مرنجان مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ ان سے ملنے والا کوئی بھی شخص پہلی ہی ملاقات میں ان سے متاثر ہو جاتا ہے۔ وہ بہ یک وقت اپنے اساتذہ رفقائے کار دوست احباب اور طلبہ میں یکساں طور پر مقبول رہے ہیں۔ وہ اپنی پُر مزاح گفتگو اور پُرلطف اشعار سے محفل کو زعفران زاد بنا دیتے ہیں۔ سامعین اور مخاطبین کی متاثر کرنے اور انھیں اپنا گرویدہ بنالینے میں ان کی بھاری بھرکم اور قد آور شخصیت کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کے ایسے کام وہ منٹوں میں کروالیتے ہیں جسے دوسرا شخص کئی دنوں میں نہیں کرواسکتا۔

راقم الحروف پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے دو دہوں سے زاید عرصے سے دوستی کا شرف حاصل ہے۔ ان کی مثالی زندگی اور دوستی کو میں اپنا ایک قیمتی سرمایہ، حیات سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں اور میں اپنے بڑے بھائی کی طرح ان کا ادب و احترام کرتا ہوں۔ ہم دونوں کا انتخاب عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ، اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ۱۹۸۲ء میں عمل میں آیا۔ اس سے پہلے وہ سٹی کالج پر درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے اور راقم آرٹس کالج جامعہ، عثمانیہ میں بہ حیثیت اڈھاک لکچرر کارگزار تھا۔ اپنی دیرینہ تدریسی و تحقیقی خدمات کی بنا پر وہ مجھ سے پہلے ریڈر اور پروفیسر بن گئے تاہم میرے ساتھ ان کے مخلصانہ برتاؤ میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ ہم دونوں نے تقریباً دس سال تک پوسٹ گریجویٹ کالج بشیر باغ پر درس و تدریس کی خدمات انجام دی ہیں۔ مذکورہ کالج اکبر صاحب کے دولت خانے سے بہت قریب تھا۔ ہم دونوں پروفیسر غلام عمر خاں اور پروفیسر مغنی تبسم کے چہیتے شاگرد، ادارہ، ادبیاتِ اردو کے شعبہ، امتحانات کے ممبر اور مخطوطہ شناسی کی

جماعتوں کے اساتذہ بھی تھے اس لیے میرا زیادہ سے زیادہ وقت اکبر صاحب کے ساتھ گزرتا تھا۔ اکثر علمی و ادبی اور تحقیقی موضوعات پر تبادلہ ٔ خیال ہوا کرتا۔ چاہے کالج کے اسٹاف روم میں ہوں، اپنے اساتذہ کے دولت خانوں میں یا ادارہ ٔ ادبیاتِ اردو میں ہم نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ استفادہ کیا ہے۔۔۔ اپنے مضامین و مقالات کے سلسلے میں تصانیف کے سلسلے میں اپنے طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی کے سلسلے میں ہماری یہ دوستی و محبت اور خصوصاً ہماری تصانیف شعبے کے دیگر اساتذہ کے لیے باعث رشک تھیں۔ پوسٹ گریجویٹ کالج بشیر باغ میں ہماری ملازمت کے دوران اکبر صاحب کی کتابیں خوش نفساں، دیوانِ لطف، عزیز مرزا اور دیوانِ حفیظ منظرِ عام پر آئیں اور راقم کی دکنی غزل، دکنی شاعری، دبستان گولکنڈہ حرفِ نم دیدہ اور تحقیقی نقوش کے علاوہ ہم دونوں کی مشترکہ کتاب "نظیر شناسی" شائع ہوئے۔ اس کتاب کی اردو دنیا میں بڑے وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی متعدد جامعات میں اسے شامل نصاب کیا گیا اور مبصرین اور محققین نے اس کی بے حد ستائش کی اور ہمارے اس اشتراکی کام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ کسی نے ہم کو محمد عمر نور الہی کہا تو کسی نے اکبر علی اثر۔

"نظیر شناسی" کے سلسلے میں ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ پی جی کالج کے شعبہ ٔ اردو میں ایک دفعہ وائی وا کے سلسلے میں پروفیسر رزاق فاروقی صدر شعبہ ٔ اردو گلبرگہ یونیورسٹی تشریف لائے تھے۔ ہم دونوں نے مل کر انھیں نظر شناسی و تحفہ پیش کیا۔ کتاب کے مرتبین کی حیثیت سے جب انھوں نے دو اساتذہ اردو کا نام یکجا دیکھا تو بلا مبالغہ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دونوں کو گلے سے لگا کر دعائیں دینے لگے اور کہا کہ اردو کے دو اساتذہ کو اس طرح مل کر کام کرتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا عموماً لفظ اردو کی طرح اساتذہ اردو ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں کبھی نہیں ملتے۔ لیکن آپ نے دوستی اور محبت کی ایک روشن مثال قائم کی ہے۔

غالباً ۱۹۹۰ء میں پوسٹ گریجویٹ کالج بشیر باغ، پی جی کالج سکندرآباد میں ضم کر دیا گیا تو راقم کا تبادلہ یونیورسٹی کالج فار ویمن میں ہو گیا اور اکبر صاحب سکندرآباد کالج میں اپنی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ صدر شعبہ ٔ اردو بھی بنے اور وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش بھی ہو گئے لیکن ہمارے دلوں کے درمیانی فاصلے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ میں اب بھی انھیں اپنے دل کے قریب سمجھتا ہوں اگرچہ اپنی خرابی صحت کی وجہ سے ان

کے دولت خانے پر کم کم ہی جاتا ہوں لیکن وہ اپنے چھوٹے بھائی سے ملاقات کے لیے غریب خانے پر ضرور تشریف لے آتے ہیں۔

ع عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

۳/ دسمبر ۲۰۰۲ء محمد علی اثر

پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کالج آف ویمن۔

•

• **مجید بیدار، ریڈران اردو عثمانیہ یونیورسٹی، آرٹس کالج، حیدرآباد :**

ڈاکٹر مجید بیدار پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ سے زانوے ادب تہہ کرنے کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں اس کے علاوہ رفیق کار کی حیثیت سے بھی کچھ عرصے تک خدمات انجام دے چکے ہیں اپنے تاثرات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اردو کے ایک مخلص استاد اور طلبہ کے ہم درد کی حیثیت سے شہر حیدرآباد میں جن اشخاص کو ہم قیام حاصل ہوا ہے ان میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ابتدا میں وہ محکمہ صحت سے وابستہ رہے جہاں خدمت ان کا شعار رہا اور جب اس محکمہ کو خیرباد کہا تو تدریس کو اپنایا یہ محکمہ بھی ایسا ہے جس کے ذریعہ انسانوں کی خدمت اور ان کی ذہن سازی کا کارنامہ انجام دیا جاتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تدریس اور خلاقانہ مہارت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب کہ میں اپنے دوست احباب کے ہم راہ سٹی کالج میں اردو کی جماعتوں میں شرکت کا موقع ملا۔ مجھے سٹی کالج کے ڈگری سیکشن سے صرف اس وجہ سے دل چسپی رہی کہ وہاں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اردو پڑھاتے تھے۔ گو کہ میں دوسرے کالج کا طالبِ علم رہا لیکن اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے سٹی کالج کی اردو جماعتوں میں شرکت کرتا رہا جہاں خاص انداز سے اردو سمجھانے کے اوصاف کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی صورت میں نمایاں ہوتے دیکھا۔ اس طرح ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ دوسروں کے دکھ درد سے دل چسپی کے علاوہ حق گوئی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی

سرشت میں شامل ہے اور اپنی راست بازی کی وجہ سے انھوں نے عملی زندگی میں نقصانات بھی اٹھائے ہیں اس کے باوجود بھی سنتِ حسینی پر قائم ہیں۔ پکی دھن کے ساتھ کام میں محو رہنا ان کی عادت ثانیہ ہے چناں چہ یومِ قلی قطب شاہ اور یومِ زور کے علاوہ ادارہ ادبیاتِ اردو کے امتحانات کے انعقاد کے سلسلے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ عملی اقدامات کے قائل ہیں ساری زندگی صبر و تحمل میں گزاری۔ یار باشی ان کا وطیرہ نہیں۔ بہترین ادیب اور نقاد ہیں، تحقیق سے خصوصی شغف ہے اور اپنے شاگردوں میں ان جراثیم کے منتقل کرنے کے سزاوار ہیں۔ چوں کہ انھیں قابل اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا ہے اسی لیے پیشہ تدریس میں کسی وقت بھی مفاہمت کو پسند نہیں کیا۔ مغل خاندان سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر دوستی بھی کھل کر کی اور دشمنی بھی ڈنکے کی چوٹ پر کی۔ کبھی اپنی خودی کے پرچم کو سرنگوں ہونے نہیں دیا۔ انتہائی خودداری اور جہدِ مسلسل میں زندگی بسر کی اور شاید اسی کے نتیجہ میں خدا نے انھیں سکون و راحت کے تمام مواقع فراہم کر دیے۔ ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزارتے ہوئے طلبہ کی رہنمائی کے لیے ہمیشہ اپنا دست تعاون دراز کرتے رہے ہیں قدرت نے انھیں اپنے خزانے سے سب کچھ عطا کیا ہے۔ صبرِ حسین کے پیکر ہیں اور جب جھوٹ اپنے حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو جلالِ اکبری کا پیکر بھی بن جاتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور حیدر آباد کے نامور قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تحریر میں لذت کے بجائے حقیقت جھلکتی ہے چناں چہ صورت اور چاشنی کے بجائے اپنی تحریروں کو مقصدیت سے وابستہ رکھتے ہیں۔ انسان کی قدر کرنا خوب جانتے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے سے مہر و مروت کے علاوہ اخلاص کا برتاؤ ان کی خوبی ہے۔ جس طرح تھکا ماندہ مسافر گھنے درخت کی چھاؤں میں سکون محسوس کرتا ہے وہی راحت اور آرام طلبہ کو پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تدریس سے ملتا ہے اور ان کی شخصیت کا سحر انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

۱۲/ دسمبر ۲۰۰۲

مجید بیدار

ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی، آرٹس کالج حیدر آباد

●

- **ڈاکٹر عثمان علی اسد ،معاون پروفیسر اردو پی۔ جی کالج ،سکندر آباد ،عثمانیہ یونیورسٹی :**

ڈاکٹر عثمان علی اسد معاون پروفیسر اردو ، پی جی کالج سکندر آباد ، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے تجربات اور کہنہ مشقی کے نا صرف معترف ہیں بلکہ ان کی کہنہ مشقی اور تجربات کو اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھتے ہیں اور اپنے تاثرات کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

بڑے بھائی پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحبسابق صدر شعبہ ،اردو پی۔ جی کالج سکندر آباد۔

یکم مارچ ۱۹۸۵ء میں جب میرا تقرر بہ حیثیت لکچرار اردو ہوا دوسرے دن ہی پی جی کالج سکندر آباد میں چلا گیا جہاں پر میں ایک سال سے جزوقتی لکچرار سے کام کر رہا تھا۔ اس وقت اس کالج میں صرف زبانِ دوم اردو ہی تھا ۱۱طلبا زیرِ تعلیم تھے صرف ۸ پریڈ یہاں پر لینا پڑتا تھا باقی ۴ پریڈ نظام کالج اور ۴ پریڈ کا کام بشیر باغ کالج میں دیا گیا تھا۔ پہلی مرتبہ ۴ پیریڈ کے لیے بشیر باغ کالج چلا گیا وہاں پر اس وقت صدر شعبہ ، اردو پروفیسر سید محمود قادری صاحب مرحوم تھے جو میرے استادِ محترم تھے بہت خوش ہوئے دیگر اساتذہ سے میرا تعارف کروایا اور کہا کہ یہ میرا شاگرد عثمان ہے جو بڑی محنت سے پڑھ کر یونیورسٹی میں نوکری کرتے ہوئے لکچرار بن گیا ہے یہ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ہے "مغل بچہ ہے دل کا سچا اور زبان کا اچھا ہے "۔ پہلی مرتبہ بیگ صاحب سے ملاقات بشیر باغ کالج میں ہوئی بغل گیر ہوئے اور انھوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کس طرح عثمان یہاں تک پہنچے ہیں۔ پھر اس کے بعد روزانہ ملاقات ہوتی رہی اسی دن انھوں نے کہا ہے تم میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو کسی چیز کی ضرورت پر مجھ سے مدد لیا کرو۔ دھیرے دھیرے میں ان کے قریب ہوتا گیا۔ نظام کالج میں ۴ پریڈ ہونے کی وجہ سے ہفتہ میں دو دن جانا پڑتا تھا وہاں پر محترم رفیع روؤف صاحبہ تھیں ان کی نگرانی میں تقریباً تین سال تک جاتا رہا پھر ۱۹۹۱ء میں بشیر باغ کالج سے اردو کے ساتھ ساتھ تمام شعبہ پی جی کالج منتقل ہوگئے تب صدر شعبہ ، اردو پی جی کالج میں بیگ صاحب صدر شعبہ رہے اور ان کی صدارت میں ڈاکٹر محمد تاتار خان اور میں کالج میں پڑھاتے رہے۔ بیگ صاحب کبھی بھی صدر ہونے کا احساس بھی نہیں دکھایا بلکہ بڑے بھائی کی طرح پیش آتے تھے اور کچھ دنوں کے لیے فاطمہ پروین صاحبہ بھی ہمارے کالج آگئیں بیگ صاحب ایک خاندان کی طرح ہم سب سے حسن سلوک کرتے

رہے اور ہم شعبہ کی ذمہ داری ایک خاندان کی طرح رہ کر شعبہ ، اردو کو مقبولیت بخشی ۔ بیگ صاحب کا تعلق میرے ساتھ بہت ہی مشفقانہ رہا ہمیشہ میری مدد کرنے کا سوچتے رہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہی مجھے پہلی مرتبہ کالی کٹ یونیورسٹی سے بہ حیثیت اردو پیپر سٹر کی حیثیت سے میری سفارش کی اور مجھے اس طرح کالی کٹ یونیورسٹی جانا پڑا جہاں پر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک بہت ہی نیک مشفیق اور مخلص پروفیسر ہیں اس ملاقات کے وہ بھی میری رہنمائی کرتے رہے اور وہیں پر پروفیسر مسعود سراج صاحب صدر شعبہ ،اردو میسور یونیورسٹی سے ملاقات ہوئی اور جہاں جہاں جس جس یونیورسٹی میں بیگ صاحب جاتے وہاں پر میرے لیے ضرور سفارش کرتے اس طرح بیگ صاحب کی کوشش ہی کے نتیجہ میں مجھے ایک بار میسور یونیورسٹی بھی جانا پڑا ۔ اس طرح بیگ صاحب ہر جگہ ایک بڑے بھائی کی طرح میری مدد کرتے رہے ۔

بیگ صاحب بہت ہی مخلص ہمدرد اور شفیق بڑے بھائی ثابت ہوئے اتنا ہی نہیں بلکہ جب ان کو بنگلور میں (WBT) ورلڈ بائیبل ٹرانسیشن کا کام ملا تو انھوں نے مجھے بائیبل کا آسان اردو ترجمہ کرنے کے لیے مجھے بھی بنگلور لے گئے جہاں پر میں نے بھی تقریباً عنوانات کا سلسیں اردو میں ترجمہ کیا ۔ جس کا اچھا معاوضہ ملا رہنے کھانے پینے کے علاوہ آنے جانے کا خرچ ملا اس طرح میری مالی مدد بھی فرمائی بیگ صاحب یوں تو مذہبی خیالات کا پاس ولحاظ کرتے ہی ہیں اور خاص طور پر رمضان میں صوم و صلواۃ کے پابند اور زیادہ نظر آتے ہیں ۔ غریبوں کی مدد کرنا ریا کاری سے کوسوں دور حسبِ مقدور صرف اور صرف خوشنودیِ خداوندی کے لیے غریبوں کی مدد کرتے دیکھا ہے ۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی صدارت شعبہ ،اردو یونیورسٹی کا واقعہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں ایک دن ایک سفید پوش فرد پتہ نہیں کسی وجہ سے ان کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی تو وہ یونیورسٹی آئے اور صدر شعبہ سے درخواست کی اور بتایا کہ پریشان ہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہے اس وقت بیگ صاحب وہاں موجود تھے انھوں نے کہا کے میڈم اس طرح کوئی بھی پیسے مانگنے آتے ہیں اس پر میڈ نے کہا نہیں بیگ کوئی ضرورت مند ہی ہے اور اللہ کا واسطہ دے رہا ہے تو اس وقت میڈم نے اکبر صاب سے ۵۰۰ روپے لیے اور اس فرد کو دے دیا ۔ اس طرح زینت آپا کا بھی خلوص نظر آیا ۔ زینت آپا کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے ان سے بھی میں کئی دفعہ ملاقات کی اور میری رہنمائی بھی فرمائی ۔

بیگ صاحب جن دنوں صدر شعبہ ٔ اردو کی حیثیت سے جائزہ لیا ان دنوں ایک آزمائشی دور سے گزرے شعبہ کے دیگر اساتذہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ صدر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں رہے ان کو ذہنی تکلیف دیے اور کچھ طلبا کو ان کے خلاف ورغلایا اور وہ ایک ذہنی کرب میں مبتلا رہے۔ میں اور تاتار خان نے بہت ہمت دلائی اور وہاں سے پھر پی جی کالج صدر کی حیثیت سے پھر واپس آگئے۔ ان تمام واقعات سے وہ بہت دل برداشتہ ہوگئے اور پھر میرے اور تاتار خان کی دلجوئی سے پھر بہ حال ہوگئے اور آخری دم تک یعنی مئی ۲۰۰۰ ء تک بہ حیثیت صدر رہے اور شعبہ میں تمام اساتذہ سے بہت ہی اچھے انداز میں ملتے رہتے تھے ایک نام اس کالج میں کمایا۔ کالج میں جب بھی تعلیمی تفریح کا پروگرام ہوتا ہمارے ساتھ ضرور چلتے بچوں کو اس بات کا احساس تک نہیں دلاتے کے تفریح میں وہ ایک استاد ہیں بلکہ ایک دوست کی طرح رہتے تھے کتنے اچھے دن رہے۔ آج سب ایک کے بعد دیگر واقعات یاد آتے رہتے ہیں۔

بیگ صاحب جب کالج آتے اپنی ڈائری میں لکھتے۔ College Attended پر کوئی نہ کوئی کسی خط کا جواب دیتے۔ ہر ہفتہ ان کا کوئی نہ کوئی مضمون ہماری زبان دلی میں ضرور چھپتا اور مجھے ضرور بتاتے۔ بیگ صاحب کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اساتذہ اکثر ایک دوسرے کے خلاف رہتے ہیں وہیں پر بیگ صاحب نے "نظیر شناسی" پروفیسر محمد علی اثر کے ساتھ مرتب کر کے اردو دنیا میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ میرے علم میں چند ایک میں "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے"، "خوش نفساں"، "یدِ بیضا" قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ برق موسوی حیات اور کارنامے جیسے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھے جو خواص و عوام میں بے حد مقبول ہوئے۔

بیگ صاحب ایک بہت ہی شفیق مخلص استاد ہیں۔ ان کی نگرانی میں کئی طلبا اور طالبات ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تلگو میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں۔ غیر تلگو داں افراد کو تلگو سکھانے کے لیے۔

یونیورسٹی کی مصروفیات کے علاوہ ان کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ ادارہ ٔ ادبیاتِ اردو کی مصروفیات ہیں۔ معتمدِ اعزازی شعبہ ٔ امتحانات کی ذمہ داری اور ادارہ کی مصروفیات کے ہیں اپنے خاندان میں

بہت ہی مقبول ہیں۔ ایک اچھے شوہر، ایک اچھے باپ کے علاوہ ایک نیک سیرت انسان ہیں۔ یونیورسٹی میں آنے سے پہلے وہ سٹی کالج میں بھی پڑھاتے رہے۔ سٹی کالج کے دیگر شعبہ کے اساتذہ سے جب کبھی بھی ملاقات ہوتی تھی بہت ہی عزت کے ساتھ وہ بیگ صاحب کا نام لیتے ہیں دل سے قدر کرتے ہیں۔

بیگ صاحب اپنے خاندان میں کس قدر مقبول و مصروف ہیں اس کا اندازہ ان کی ایک بہن سے ہوتا ہے۔ مجھے ان کی بہن کی بچی کو عربی پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ انتہائی شریف سلیقہ مند خاتون اور ان کے بہنوائی جو ایک مشہور کمپنی کے سرکردہ ہیں بہت ہی مخلص ہیں۔

بیگ صاحب نے اپنے بڑے بھائی ہونے کا ثبوت ہر قدم پر دیا۔ میں ہر وقت ان کی صحت و تندرستی کے لیے پروردگارِ عالم سے دعا گو رہتا ہوں۔ ان چیدہ چیدہ خیالات کا اظہار کر تو دیا ہوں جس طرح بیگ صاحب کے بارے میں لکھنا چاہیے میں ان کا حق ادا نہیں کر پا رہا ہوں۔ امید کے مجھے وہ معاف کریں گے۔

بیگ صاحب کی ایک اور اہم بات کا ذکر کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں جو کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ ہے بڑوں کی عزت کرنا۔ میں نے پروفیسر غلام عمر خاں صاحب سے ملتے ہوئے دیکھا کہ کس طرح عاجزی انکساری سے اور عقیدت مندی ادب و احترام سے غلام عمر خاں صاحب سے مل رہے ہیں یہ ہی نہیں بلکہ پروفیسر مغنی تبسم صاحب سے آج بھی جہاں کہیں ملاقات ہوتی ہے نہایت ہی ادب و احترام سے ملتے ہیں۔ جن لوگوں میں اپنے بڑوں سے ادب و احترام سے ملنے کی عادت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی عزت ان کے چھوٹوں سے ان کے شاگردوں سے اس انداز سے کرواتے ہیں۔ تو گویا جو عزت حاصل کرنے چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کے اپنے بڑوں کی عزت کریں۔ بیگ صاحب اپنے عمر سے بڑے لوگوں سے بہت ہی ادب و احترام سے ملتے ہیں اور ہم عمر سے بھی خوش دلی کے ساتھ ملتے ہیں اور اپنے سے چھوٹوں سے محبت و شفقت سے ملتے ہیں۔

بیگ صاحب اپنے اندر ایک انجمن کی سی کیفیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عثمان علی اسد

معاون پروفیسر اردو پی جی کالج سکندر آباد۔

۲۳ / دسمبر ۲۰۰۲ء

- **مخدوم محی الدین، کمرشیل ٹیکس آفیسر، حیدرآباد :**

مخدوم محی الدین جو مرزا اکبر علی بیگ کے لڑکپن کے ساتھی ہیں جن کی دوستی کا عرصہ تقریباً چار دہوں پر محیط ہے مرزا اکبر علی بیگ سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پیکرِ ناز خلوص نیت، وسیع النظری، ہم دردی، اپنائیت اور منفی پہلوؤں سے اجتناب ایسی صفات ہیں جو سچی محبت کی متقاضی ہوتی ہیں۔ دروغ بر گردنِ راوی اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دوستی کے ان تمام اچھے صفات کا مجموعہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ہیں جن کا ہمارا ساتھ ربع صدی سے زیادہ عرصہ سے ہے جب کہ وہ سٹی کالج میں لکچرار تھے۔ شمشیر میاں کے ذریعہ جب ان سے ملاقاتیں ہوتے رہتی تو ان کا حسن سلوک انجانے طور پر مجھے ان سے قریب کرتا گیا جب میں ان کا اسیر ہوا جا رہا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر با عزت میری کر دیا کہ یار اپنی شخصیت پر اتنا ظلم نہ کرو۔ اپنی خودی کا خیال رکھو۔ کسی کی مرعوبیت کا شکار نہ ہو۔ ان کی یہ انکسارانہ طبیعت ہماری دوستی کی حدوں کو وسیع کرتی چلی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سوچنے سمجھنے کا ایک ہی انداز ہوا کرتے رہتا ہے۔ ایک دوسرے کی فکروں میں حصہ دار ہوا کرتے ہیں۔ نہ ہماری مشترکہ فکریں اپنے بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی یہی وجہ ہے کہ آج ان کے دو صاحب زادے امریکہ میں بہ حیثیت انجینیئر شان دار زندگی کے مالک ہیں۔ اکلوتی صاحب زادی ڈاکٹر فردوس اپنے شوہر اشرف بابا جو کہ انجینیئر اور ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری رکھتے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ مگن ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی اور حبیب پاک کے صدقہ کا طفیل ہے کہ اس نے ہماری کاوشوں کو پورا کیا اور اب ہماری پُرسکون زندگی کی موجیں اپنے ساحل کی طرف رواں دواں ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے اور اپنے کرم میں رکھتا رہے۔

اس یار باش کا نظریہ دوستی کے بارے میں بڑا وسیع ہے۔ کہتے ہیں دوستی کرنا آسان ہے دوستی نبھانا بڑا نازک کام ہے۔ دوستی ہو جائے تو اسے تادم زیست نبھاتے رہو۔ خلاف طبیعت کچھ نازیبا حرکت ہو جائے تو اسے نظر انداز کرنا ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ دوستی توڑنے کو وہ اخلاقی جرم کہتے ہیں۔ ان کی یہی صفات ہیں جو ہماری دوستی کو مضبوط بندھن میں باندھے رکھی ہے۔

صاحب موصوف محفل میں برجستہ اشعار سے ہٹر بونگ مچاتے رہتے ہیں اور ہم نثر میں قہقہے لگا رہتے ہیں۔ موقع کی نزاکت کے لحاظ سے برجستہ اشعار کا زبان پر آجانا ایک خداداد صفت ہے۔ کسی پر ڈائرکٹ ریمارک کرنے کے بجائے محفل میں اچھل کود کر کے بغلی گھونسے چلاتے رہتے ہیں۔

اس مغل شہزادے کے چہرہ کو میں نے لال پیلا ہوتے بھی دیکھا ہے جب کوئی قسمت کا مارا ان کی اسکوٹر سے گستاخی کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے یا کوئی نازیبا حرکت کر دے تو ایسے وقت مغلیہ جاہ و جلال حرکت میں آجاتا ہے اور وہ کھڑی بولی کا استعمال شروع کر دیتے ہیں اور سامنے والا ان کی بھاری بھر شخصیت کے تلے دب جاتا ہے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ یہ بھاری بھر جسم ان کی کم زوری پر غالب آتا رہا ہے۔ جب ان کا پارہ چڑھنے لگتا ہے تو ان کے بلڈ پریشر کا گراف بھی بڑھتے جاتا ہے۔ اسی لیے ان کی بیگم صاحبہ ان کے کار چلانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ورنہ معلوم نہیں کون قسمت کا مارا ان کے بلڈ پریشر کا شکار ہو کر ان کی کھڑی بولی کی زد میں آتا۔ جہاں بھابی ان کی کم زوری رہی ہیں تو وہاں بھابی کی کم زوری بیگ بھائی رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ بیگ بھائی ایک اطاعت گزار شوہر ہیں تو دوسری جانب سکینہ بھابی ایک وفا شعار بیوی رہی ہیں۔ اس مغلیہ چشم چراغ کے منصوبوں کی عمل آوری میں ان کی بہت مدد رہتی ہے۔

یہ یار باش بہت معاملہ فہم ہے۔ پے چیدہ سے پے چیدہ کام کو آسانی سے طے کر دینے کا گر اچھا جانتے ہیں سوئی کی جگہ سبل لگانا ان کے لیے آسان ہے۔ گھٹنوں میں درد رکھتے ہوئے اپنے استادِ محترم مغنی تبسم صاحب کے لیے آسمان سے تارے توڑ لانا اپنا فرض سمجھتے ہیں مغنی صاحب اب ان کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں ہر کام میں وہ اکبر علی بیگ کا دخل ضروری سمجھتے ہیں۔ مغنی صاحب ہمیشہ نفاست پسندانہ معیار maintain کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ریسرچ کرنے والے شاگردوں سے ریسرچ کا اتنا کام کراتے ہیں کہ اس کے کام میں اعلیٰ معیار برقرار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دورِ استادی میں (پی ایچ۔ ڈی طلباء کی گائیڈ) صرف اکبر علی بیگ ہی واحد شاگرد تھے۔ جو ان کے معیار پر اترے اور ڈاکٹریٹ کر سکے۔

بیگ پیکر ناز: پیارا مخلص دوست، اپنوں پر جان چھڑکنے والا دوست:

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے کرم سے ہر طرح سے نوازا ہے

اب کوئی ایسی دعا نہیں جو ان کے لیے کروں۔ صرف

ایک ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پیکرِ ناز کو اپنی رفیق

حیات کے ساتھ صحت و عافیت و سلامتی کے ساتھ

اپنے بچوں پر ان کا سایہ سلامت رکھے

آمین۔ ثمہ آمین

۱۸ / دسمبر ۲۰۰۲ء

مخدوم محی الدین

کمرشیل ٹیکس آفیسر، حیدر آباد

•

- **شمشیر علی خان، پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن، حسینی عالم، حیدر آباد :**

شمشیر علی خاں جو مرزا اکبر علی بیگ کے سٹی کالج کی ملازمت کے دوران رفیق کار رہے ہیں پروفیسر صاحب سے بے حد متاثر ہیں شمشیر علی خاں اپنے تاثرات کو یوں قلم بند کرتے ہیں۔

جناب پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، سابقہ صدر شعبہ، اردو پی جی کالج سکندر آباد اے۔پی یونیورسٹی سے پی جی کیمسٹری کی ڈگری کے کچھ ہی دن بعد راقم کا گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد اے۔پی پر ۹ / دسمبر ۱۹۷۱ء کو تقرر ہوا۔ اچانک ایک تبدیلی یعنی جن نشستوں پر بیٹھ کر استاد کا لکچر سنتے تھے آج بہ حیثیت استاد اہلِ نشستوں کا سامنا تھا۔

خیر پرنسپل صاحب کو تقرر نامہ بتلانے کے بعد باہر آکر راہ داری میں کھڑا تھا۔ کیوں کہ کوئی جانی پہچانی شخصیت یہاں پر نہیں تھی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب گورے چٹے، لحیم شحیم، چوڑ چکلا سینہ میرے پیچھے کھڑے ہیں۔ اپنا تعارف کروانے لگے کہ میں شعبہ، اردو سے وابستہ ہوں آپ کو پرنسپل صاحب کے اجلاس پر دیکھا اور معلوم ہوا کالج پر آپ کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ پھر اپنے ساتھ لے کر شعبہ، لسانیات کو لے گئے اور پھر فرداً فرداً ہر ایک سے تعارف کروانے لگے۔ تعارف میں اتنی اپنائیت

کے تھوڑی دیر کے لیے اجنبیت کا احساس ختم ہوا ۔ پھر باری آئی اپنے متعلقہ شعبہ کیمیاء کی ۔ یہاں پر بھی موصوف نے میری رہنمائی کی اور تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میرا چھوٹا بیٹا شمشیر خان آپ کے شعبہ ، کیمیاء میں شامل ہوگیا ہے ۔ دن گزرتے گئے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ رہا اور تجربہ حاصل کرتا رہا ۔

ان ہی دنوں میں موصوف سیتارام باغ سے حیدرگوڑہ منتقل ہوئے اور گھر پر ایک تقریب منعقد کی یہاں پر معلوم ہوا کہ موصوف میرے ننھیالی عزیز ہیں ۔ یعنی دوستی اور رشتہ داری اور دونوں اٹوٹ بندھن ۔

پھر میرا تبادلہ گورنمنٹ پالی ٹیکنک مان صاحب ٹینک حیدرآباد ہوا مگر ہمارا خلوص اور موصوف کی شفقت اسی طرح جاری رہی ۔

شفیق باپ : اسی زمانے میں میری سکونت ملے پلی سے ہمایوں نگر منتقل ہوگئی ۔ بڑی بیٹی فردوس فاطمہ کے لیے فزیکل سائنس میں کوچنگ کی ضرورت پڑی ۔ تو مجھ سے کہہ کہ آپ کو ذمہ داری نبھانی ہوگی ۔ انکار کا سوال ہی نہیں تھا ۔ موصوف کا یہ معمول ہوتا کہ صبح ، بجے اپنی بیٹی کے ساتھ پہنچ جاتے اور ساتھ واپس جاتے ۔ پابندی کا یہ حال کہ چاہے کتنی سردی ہو یا بارش ، معمول میں تبدیلی نہیں ۔ جس کا نتیجہ آج سامنے ہے کہ فردوس فاطمہ ، میڈیسن مکمل کرنے کے بعد آپ پیشہ طب سے وابستہ ہیں اور ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں اور قوم کی خدمت میں مصروف ہیں ۔ اس طرح باپ کی شفقت اور اپنی اولاد کے لیے قربانی ایک مثال کی طرح باقی رہے گی ۔ یہی حال دونوں بیٹوں کے لیے بھی تھا اور بیٹوں کی ہر موڑ پر رہنمائی کی ۔ چناں چہ آج دونوں بیٹے امریکہ میں ایم ۔ ایس کرنے کے بعد خوش حال زندگی گزار رہے ہیں ۔ یہ دونوں بیٹے بھی میرے شاگرد رہ چکے اور سعادت مندی میں بے مثال ۔

اچھے استاد : ان ہی دنوں موصوف گورنمنٹ ملازمت سے یونیورسٹی کی ملازمت میں آگئے اور صدر شعبہ ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی بن گئے ۔ یونیورسٹی میں سیاست اور مختلف اسباب کی بناء پر اپنا تبادلہ پی جی کالج سکندرآباد اور وظیفہ خدمت تک وہیں پر رہے ۔

اچھے دوست اور ہمدرد : آباواجداد فوجی ہونے کے ناطے موصوف بھی سیدھے سادے اور وعدے کے پکے رہے ۔ دوستی نبھانا خوب جانتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ دوستی کرو کھل کے اور دشمنی کرو کھل کے ۔

ہم دردی کا حال یہ ہے کہ جب کبھی ضرورت ہو فوری سامنے آجاتے۔ ہمت ہارنا کبھی نہیں سیکھا۔ دنیا جھکتی ہے جھکانے والا چاہیے۔ دھن کے بہت پکے، جو کام سوچ لیتے پایہ، تکمیل کو پہنچاتے۔ ادارہ، ادبیاتِ اردو سے بھی وابستہ ہیں اور خدمت میں مصروف ہیں۔ جب بھی ضروری ہو مشوروں سے نوازتے اور مشورے بھی ایسے کہ آسانی سے قابلِ عمل اور مفید۔

گھریلو زندگی انتہائی پُرسکون۔ شریکِ حیات بھی ایسی پائی کہ جو ہر امتحان میں پورا اترے محترمہ ایک پُرخلوص، ملنسار ہیں۔ آپ بھی شعبہ، تدریس سے وابستہ رہیں۔ ہم بھابی سے مخاطب کرتے ہیں اور وہ بھابی و ماں دونوں رول بہ خوبی نبھاتی ہیں۔ ہر انسان کی ترقی میں اس کی شریکِ حیات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح موصوفہ ہر پل پروفیسر صاحب کی معاون و مددگار رہیں۔

جناب پروفیسر بیگ صاحب ہمارے لیے ایک آئیڈیل رہے ہیں ہمارے دوست و احباب آپ کی ترقی کی مثال دیتے ہیں۔

موصوف کے اردو کے لیے خدمت کا حال یہ ہے کہ باوجود صحت کی خرابی کے ادارہ، ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ میں پابندی سے موجود رہتے اور اردو کی خدمت میں جٹے رہتے ہیں۔ موصوف کی کاوش کی وجہ سے گورنمنٹ آندھرا پردیش نے اردو عالم و فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا۔ جس کی وجہ سے کئی اردو جاننے والے طلباء کا مستقبل درخشاں ہو گیا اور وہ گرایجویشن و پوسٹ گرایجویشن کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف صحت سے رہیں اور عمر دراز ہو تاکہ قوم آپ کی خدمات سے مستفید ہوتی رہے۔ آمین۔

۸/دسمبر ۲۰۰۲ء

شمشیر علی خان
پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن
حسینی عالم، حیدرآباد

•

•

• مرزا غضنفر علی بیگ فرزند مرزا اکبر علی بیگ :

مرزا غضنفر علی بیگ لائق فرزند مرزا اکبر علی بیگ کے جو جذبات سے پُر تاثرات ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

Memories of my childhood will remain etched in my mind forever. I think the main reason is the people involved in the making of those memories. My father was a very simple, modest hard-working man with clear cut idea of what he wanted to accomplish in life. He always used to say "Get an education first then good things will follow". Baba had lost his father when he was two years old and had a pretty tough childhood. He was determined to give us all the opportunities that he had missed out because of not having a father. He was 17 when he started his first job as a health inspector. He could have been content with his accomplishments when he became a lecturer and started a family but my father persevered and got his Ph.D. Even then baba was clear as to what his goals were-he wanted to be a professor and a head of the department before he retired. Baba's perseverance in the face of many odds has inspired all his children. After coming to America the first few years as a student were tough but I found inspiration from Baba's dedication and the sacrifices that he had made for my education. Baba always said he wanted his two sons to be engineers and his daughter a doctor. His desire was based on the respect these professions commanded. Our career paths were decided when we were five of six years old-many years latter my dad got what he wanted two engineers and one doctor. It was just not Baba's wishful thinking that made this happen. Baba left his

childhood friends and his family house in Asifnagar to come to Hyderguda so that go to good schools. This move enabled us children to to to schools like Saint Paul's and Rosary Convent which have contributed a lot to where we are today. In the days where money was tight I remember my father wearing worn out shoes, driving an old vespa which needed quite few kicks before it would start. I remember him having to drive the vespa with a wife and three kids to save money on transportation. He made compromises on his clothes, his vehicle, his entertainment but he never made any compromise on our education. We went to the best schools, learnt from the best tuition master's, and had an Arabic ustad for reading the holy Quran and to learn our prayers. In all Baba provided for a very happy and memorable chilhood. He had planted mango, gova, anar, anjeer and a host of other fruit threes and vegetable plants to ensure that our nutritional needs were met.

I have been in America 10 years now and even this far away from baba I feel his presence in every action I take and every decision I make. Even I have bought a house close to a school and have decided to have 3 kids. Even though 2 of my kids are three years old and my newborn is just a week old I find myself wondering about their educational and spritual needs. I just hope and pray that I have the wisdom and strength like my father to make the right decision for my children and inspire and influence them to live principled lives.

Mirza Ghazanfar Ali Baig

United State of America

- **ڈاکٹر سلمان عابد، لکچرر اردو آرٹس ایوننگ کالج، حمایت نگر، حیدرآباد :**

ڈاکٹر سلمان عابد اردو آرٹس ایوننگ کالج میں لکچرر ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ وہ اپنے استاد محترم کے بارے میں یوں تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب

گزشتہ زمانوں میں جس طرح سنتے تھے کہ استاد اتالیق ہوتے تھے مگر آج اتالیق گم اور بس استاد اور بسا اوقات برائے نام استاد رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل آداب زندگی اطوار حیات در تطہیر حیات کے صحیح رویے، برتاؤ اور عمل سے پرے پرے چل رہی ہیں۔

مگر شکر ایزد تعالیٰ ہے کہ ہمارے حق میں ہمارے اساتذہ اکثر و بیش تر ایسے نہیں اور ہزار شکر کہ ان اساتذہ میں دو ایک اتالیق کا درجہ رکھنے والے جن میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا نام میرے لیے باعث مرحمت ہے۔

جامعہ، عثمانیہ کے فرزندوں میں شامل ہونے کے شوق میں میں نے بہ حیثیت استاد سرکاری ملازمت سے استفادہ دے کر آرٹس کالج جامعہ، عثمانیہ میں ایم۔اے میں داخلہ لیا پروفیسر صاحب میرے استاد تھے میں اور میرے نوجوان ساتھی طلبا کا جمگھٹا ہمیشہ انہی کی گرد رہتا۔ حالاں کہ دیگر کئی اساتذہ اس وقت شعبہ میں موجود تھے۔

میرے لیے استاد محترم کی شفقت کالج کے طالبِ علمی کے زمانے سے شروع ہوئی اور کالج میں بہ حیثیت لکچرر آج تک جاری ہے کیوں کہ ایم۔اے اردو میں میرا دلی و ذہنی ربط ضبط انہی کے ساتھ رہا اور جس وقت میری موجودہ ملازمت کے لیے انٹرویو لیا جا رہا تھا یہی مشفق و مہربان اتالیق مجھ سے مخاطب تھے۔ یہ فیض آج تک جاری و ساری ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اکثر و بیش تر ہندستانی جامعات کے بالخصوص شعبہ ہائے اردو میں کس طرح کی چشمک، آپسی رنجشیں اور مخاصمت اور عناد کی فضا بنی رہتی ہے۔ ہمارا شعبہ، اردو میں ایسی ہلکی و گہری فضا سے بسرا نہیں تھا۔ جب ایم۔ فل کے لیے گائیڈ کے انتخاب کی بات آئی تو میری دلی خواہش تھی کہ میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی نگرانی میں تحقیق کروں۔ جب درخواست فارم کے ساتھ میں نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے ایک اور

استاد کی جانب اشارہ کر کے مجھے مشورہ دیا کہ میں "ان" پروفیسر صاحب کے ساتھ اپنی تحقیق کا کام کروں تا کہ آگے ملازمت وغیرہ میں سہولت میسر آسکیں۔ یہ شفقت کے اس پاک شکم سے پیدا فراغ دلی تھی جو اس لمحہ مجھ پر نچھاور تھیں۔۔۔ یہ کوئی دس بارہ برس پہلے کا لمحہ ہے مگر میرے لیے آج بھی اتنا ہی نیا اور اتنا ہی تازہ ہے جتنا اس وقت رہا تھا۔

ان کی مہربانی کی ایک اور مثال مجھے ذہن پر بار ڈالے بغیر میرے سامنے ہے کہ جب جامعہ، عثمانیہ کے محکمہ بہبودئ طلبہ کی جانب سے بین ریاستی و قومی مسابقتی مقابلوں کے لیے جگہ کی اسپانسر شپ کی خاطر مقامی سطح کے ابتدائی مقابلے جامعہ میں منعقد کیے گئے تو میری باطنی صلاحیتوں کو جو جانے کس نہج پر تھیں پروفیسر صاحب نے اپنی نظر گیر شناس سے تاڑ لیا اور مجھے منتخب کیا۔ اس وقت ان باطنی صلاحیتوں کے خد و خال میرے لیے غیر محسوس تھے۔ پروفیسر صاحب کی اس شفقت نے دلی اور کشمیر میں مجھے جامعہ کی نمائندگی کے سنہرے مواقع عطا کیے۔

پڑھنے اور آگے بڑھنے کے لیے ان کی پدرانہ شفقت نے ہمارے ذوق مطالعہ کو وسعت بخشی اور طالبِ علمی کے دوران اس کے نتیجہ میں دو گولڈ میڈل میرے حصے میں آئے۔

یوں تو کئی اساتذہ ہمارے لیے رہے۔ مگر ہم سے اس قدر شفقت کا سلوک کرنے والے استاد کے لیے ہی دیگر اساتذہ نے سوہان روح کا بھی کام کیا۔ یہ میری آنکھوں نے دیکھا۔۔۔ یہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کا دل ہے، ہمت ہے، حوصلہ ہے اور اللہ و مولا کا فضل ہے کہ ہمارے جامعاتی اساتذہ اور پروفیسر بیگ صاحب کے اپنے رفقا کے ہاتھوں پروفیسر بیگ صاحب کے لیے آرٹس کالج میں "دوزخ" کا ماحول بنائے جانے کے باوجود میری آنکھوں نے دیکھا کہ ان کی ہمت مرداں نے اس آگ کو بھی بہ باطنِ گلزار میں تبدیل کرنے کا عمل جاری رکھا۔ اپنوں کی لگائی اس آگ میں کتنوں کی انگلیاں جلیں، کتنوں پور جھلسے مگر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کی ساکھ، مرتبہ اور مراتب کے لیے یہ آگ "کندن" بنانے کا کام کر گئی۔ میری دعا ہے کہ یہ اپنی صحتِ کاملہ کے ساتھ اپنا دست شفقت ہم پر ہمیشہ بنائے رکھیں۔ آمین۔

ڈاکٹر سلمان عابد

لکچرر اردو آرٹس ایوننگ کالج۔

۱۶/ دسمبر ۲۰۰۲ء

•

• عتیق اقبال، لکچرر اردو آرٹس ایوننگ کالج حمایت نگر، حیدرآباد :

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے عزیز شاگرد عتیق اقبال جو اردو آرٹس ایوننگ کالج میں بہ حیثیت اردو لکچرار ہیں انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا ہے ۔

جامعہ عثمانیہ کو اپنے جن فرزندوں پر ناز ہوسکتا ہے ان میں سے ایک ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ صاحب بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف ادیب ہیں بلکہ مورخ نقاد اور شاعر بھی ہیں اور پھر ان کی یہ مختلف النوع حیثیت ماہرِ فن کی صورت رکھتی ہے ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب سے مجھے اس وقت شرف نیاز حاصل ہوا ۔ جب میں بہ حیثیت طالبِ علم ایم۔اے اور ڈپلومہ برائے مخطوطہ شناسی میں شاگرد تھا۔ آپ کی پرشکوہ اور متاثر کن شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ اپنے حسنِ سلوک علمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے نہ صرف کالج میں بلکہ ادبی دنیا میں بھی بے حد مقبول ہیں ۔ وہ ایک علم دوست خاندان کے چشم و چراغ ہیں ۔ آپ کا وجود ہماری تہذیب و تمدن کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے ۔ آپ ہم حیدرآبادیوں کے لیے باعث فخر ہیں ۔ بیگ صاحب کو ادبی ذوق اور تصنیف و تالیف کا شوق اپنے ورثہ میں ملا ہے ۔ تعلیمی دنیا میں تجربات کا وسیع میدان طے کر کے اعلیٰ معلومات اور مہارت حاصل کی ۔ اپنی ذاتی قابلیت دیانت داری محنت جفا کشی رواداری اور ہم دردی کی بدولت خاص و عام میں اپنا اثر پیدا کیا اور اعلیٰ خدمات پر فائز رہے ۔ تعلیمی دنیا میں اور باہر کے لوگ بھی انھیں ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے جانتے ہیں ۔ بیگ صاحب نہایت سلجھے ہوئے آزاد خیال بااصول اور انصاف پسند شخصیت کے مالک ہیں اور کبھی بھی وہ کسی کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا کام نہایت وسیع ہے وہ ہمیشہ کسی نہ کسی تحقیقی کام میں ڈوبے ہوئے رہتے ہیں ۔ ان کی کیفیت ایک مشن کی طرح ہے ۔ جو بروقت چلتی رہتی ہے ۔ بہ ظاہر وہ وظیفہ حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوگئے ہیں لیکن ان کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جو کبھی سبک دوش نہیں ہوئے ۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں اور کئی کتابوں کو اتر پردیش، مغربی بنگال، بہار اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمیوں سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔

حال ہی میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے یونیورسٹی کی سطح پر بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے نوازا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت اور کشش ہے۔ ایک مرتبہ ملنے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ دوبارہ ملنے کی خواہش نہ ہو۔ گفتگو کا خاص انداز ہے۔ تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں ہے۔ جب بات چیت کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خوش بیانی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس میں کہیں کہیں ظرافت اور خوش مزاجی کی چاشنی بھی ہوئی ہے۔ آپ کی باتوں سے ذہن اور جذبات کو جلا ملتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب نے کبھی اپنا اثر و رسوخ کا بیجا استعمال نہیں کیا اور نہ کبھی کسی اعزاز کے متمنی رہے وہ صرف محنت کا ثمر حاصل کر کے مطمئن رہے۔

۲۳/دسمبر ۲۰۰۲ء

عتیق اقبال

لکچرار اردو آرٹس ایوننگ کالج

•

- **ڈاکٹر محمد عطا اللہ خاں، لکچرار اورینٹل اردو ایوننگ کالج، حمایت نگر، حیدرآباد :**

ڈاکٹر محمد عطا اللہ خاں شعبہ اردو اورینٹل ایوننگ کالج حمایت نگر سے وابستہ ہیں اور وہ پی جی ڈپلوما مخطوطہ شناسی میں ڈاکٹر صاحب کے طالبِ علم رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب سے متعلق اپنے تاثرات اس طرح بتاتے ہیں۔

پروفیسر اکبر صاحب قلی قطب شاہ کے شہر میں جامعہ عثمانیہ کے فرزندان فکر و نظر و ادب کے مرکز حیدرآباد کے صاحب علم و ادب پاسباں مرمت قلم اپنے فکر و شعور کے نور سے دنیا ادب کو روشن کرتے آرہے ہیں وہ شخصیت کوئی اور نہیں ہے میرے استاد محترم پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب ہیں اکبر صاحب سے میں اس وقت سے واقف ہوں آج سے بیس سال پہلے جب میں مخطوطہ شناسی کا پی جی ڈپلوما کر رہا تھا اکبر صاحب مبادیات تحقیق پڑھاتے تھے بہت مزے لے کر پڑھاتے تھے اکبر صاحب کے پڑھانے کا انداز ہی کچھ دل چسپ ہوتا تھا خواہ مضمون کتنا ہی ثقیل اور خشک ہوں اکبر صاحب کی زبان سے پھول جھڑتے تھے۔ اکبر صاحب بہت

خوش مزاج ملنسار ہر فرد چاہیں چھوٹا ہو یا بڑا ہر ایک سے خوش اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں بعض شخصیتیں کبھی بھلائی نہیں جاسکتی ان میں سے اکبر صاحب بھی ایک استاد ہیں۔ اکبر صاحب میرے پھوپھی زاد بھائی کے کلاس میٹ ہیں یہ ساٹھ باسٹھ عیسوی کی بات ہے میرے بھائی جب بھی گھر آتے ہیں تو کہتے ہیں "اکبر کیسا ہے "اکبر صاحب کا سب سے اہم ادبی کارنامہ۔ تحقیق۔ مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " کے ذریعہ دنیائے ادب میں اپنا مقام حاصل کرلیا تحقیق تو سب ہی کرتے ہیں ان میں اکبر صاحب کی تحقیقی جستجو سب سے الگ ہے وہ ہر باریک سے باریک بات تو چھانٹ چھانٹ کر اپنی تحقیق میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے "دیوانِ لطف" بھی مرتب کیا وہ اپنی تخلیقی نوعیت کا کام بھی انجام دے کر۔ خوش نفساں " کے ذریعہ حیدرآباد کے سربرآوار شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں خاکہ نگاری کے بعد وہ سوانح نگاروں کی طرف مائل ہوئے "عزیز مرزا " جو بہت دل چسپ انداز میں بڑی تحقیقی نظر سے مرتب کیا "نظیر شناسی " بہ اشتراک پروفیسر محمد علی اثر بھی مرتب کی "دیوانِ حفیظ دہلوی " بھی تدوین کیا۔ اکبر صاحب کی طبعیت میں بہت زیادہ جستجو رہتی ہے انھوں نے اپنے ماموں برق موسوی کا قلمی دیوان بہ قلم برق موسوی کو من و عن طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے علاوہ اکبر صاحب کے بیسوں مضامین ہند و پاک کے جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اکبر صاحب کے ساتھ شعبہ امتحانات ادارہ ادبیاتِ اردو میں اعزازی خدمت کا دس سال موقع بھی ملا تھا اس عرصہ میں کبھی بھی اکبر صاحب سے کوئی بھی تلخ گفتگو نہیں رہی وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اور میری بات پر پورہ بھروسہ کرتے تھے ان کی بے لوث محبت میں ہمیشہ یاد رکھوں گا میری دلی خواہش ہے کہ حیدرآباد میں جشن اکبر بھی منایا جائے تاکہ آپ کی ادبی علمی خدمات کی تلافی ہوسکتے۔

۱۹/ دسمبر ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر محمد عطا اللہ خاں

لکچرر اورینٹل اردو ایوننگ کالج حمایت نگر ، حیدرآباد

●

- **ڈاکٹر احمد علی شکیل، لکچرر اردو، سردار پٹیل کالج سکندرآباد:**

ڈاکٹر احمد علی شکیل لکچرر سردار پٹیل کالج سکندرآباد سے وابستہ ہیں اور ان کا شمار ڈاکٹر صاحب کے آخری شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے متعلق اپنے تاثرات کو اس طرح پیش کیا ہے۔

میرے مشفق و مہربان استاد محترم پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب

حیدرآباد ابتدا ہی سے علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے یہاں کی سرزمین نے بڑی بڑی ہستیوں کو جنم دیا ہے اردو علم و ادب کے اس اہم اور بڑے مرکز کے لیے بانی شہر محمد قلی قطب شاہ کی دعا باآور ثابت ہوئی جس نے شہر سنگِ بنیاد رکھتے وقت یہ دعا مانگی تھی کہ - میرا شہر لوگاں سو معمور کر - تو یہ شہر نہ صرف لوگوں سے معمور ہوتا گیا بلکہ بے شمار شعرا ادبا، محققین اور ناقدین سے بھی معمور ہوتا گیا اور اس طرح سے ادبی افق پر شہر حیدرآباد کا نام ایک درخشاں ستارے کی طرح جگمگانے لگا۔ شہر حیدرآباد کی اولین جامعہ، عثمانیہ نے علمی و ادبی کارناموں کے ذریعہ اس شہر کا نام اور اونچا کیا۔ جامعہ کے سپوتوں نے اس گلشن کی بر وقت آبیاری کی اور قلی کی دعا اپنا رنگ دکھانے لگی۔ ساری دنیا میں اس جامعہ کے سپوتوں سے نام کمایا اور قومی و بین الاقوامی سطح پر اپنی اہمیت اور شناخت کے حامل رہے اسی جامعہ کے گلستان کے ایک مہکتے ہوئے پھول کا نام پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ۹/ اپریل ۱۹۴۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور ڈپلوما ان پیلو گرافی (مخطوطہ شناسی) کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ پہلے سٹی کالج میں اور پھر بعد میں شعبہ اردو جامعہ، عثمانیہ میں پیشہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ اس طرح علمی و ادبی تحقیقی و تنقیدی کاموں کا ایک لاختم سلسلہ شروع ہوگیا۔ تدریس کے ساتھ تحقیقی کاموں کا جاری رکھنا اور طلبہ کی رہنمائی کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن بیگ صاحب نے یہ سارے فرائض مسکراتے ہوئے انجام دیتے رہے۔ ایک طرف شاگردوں میں اضافہ ہوتا گیا تو دوسری طرف کتابوں کی اشاعت بھی جاری رہی اور کم و بیش ۵۰ کتابوں کے مصنف مرتب کی حیثیت اختیار کرلی۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لیے

اور چمکتی آنکھوں کے ذریعہ بیگ صاحب پر پریشان کن اور دشوار مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیگ صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ذہن میں علم و ادب کا ایک طوفان پوشیدہ ہے جس سے طلبہ ہر وقت فیض یاب ہوتے رہے۔ بیگ صاحب کے طالبِ علموں کی ایک طویل فہرست ہے اور جس میں میں بھی ایک خوش نصیب ہوں کہ بیگ صاحب سے مستفید ہونے کا مجھے موقع ملا۔ پندرہ برس سے میں بیگ صاحب کی نگرانی میں زانوے ادب طے کررہا ہوں۔ ان ہی کی نگرانی میں میں نے ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور بہ فضلِ تعالیٰ لکچرار بھی بن گیا۔ بیگ صاحب کے لکچرس ہمیشہ معلوماتی، پرُ جوش اور دل کش ہوتے تھے اور طالبِ علموں میں ایک تحریک پیدا ہوتی تھی اور بار بار طلبہ آپ کی صحبت میں رہنا پسند کرتے تھے۔ میرے اندر جو بھی صلاحیت تھی اس کو اجاگر کرنے میں بیگ صاحب کی شفقتیں شامل ہیں۔ میں نے امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کامیاب کیا تو بیگ صاحب نے میرے اندر یہ جوش پیدا کیا کہ میں آگے تعلیم جاری رکھوں اس طرح میں نے ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یونیورسٹی کے گزرے ہوئے دنوں کی جب یاد آتی ہے تو ہمیں خمار کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

اتنا کیا ہے یاد انھیں ہم نے اے خمار
اک عمر چاہیے ہے بھلانے کے واسطے

بیگ صاحب ایک زندہ دل شخص ہیں، زندہ دلی کے ساتھ ساتھ رحم دل بھی ہیں اپنے طالبِ علموں کو وہ اپنے ذاتی کتب خانے سے کتابیں مہیا کرتے اور وقتاً فوقتاً ان کی رہنمائی کرتے ہیں اور طلبہ کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ کوئی بات ایک نقش بن کر ذہن میں محفوظ ہو جاتی ہے اور کسی طرح کی کوئی تشنگی یا اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ طلبہ ہر لکچر کے بعد ایک نیا حوصلہ پاتے۔ ایسی شخصیات و ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں بلکہ آج کل تو ایسی بوقلمونی صفات شخصیتوں کے سانچے تک نہیں بن پاتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں ایم۔ فل کے لیے مقالہ لکھنے بیٹھتا تو ہزار مرتبہ سوچتا کہ مقالہ کس طرح لکھ پاؤں گا۔ لیکن بیگ صاحب کی ہمت افزائی اور حوصلہ نے مجھ کو لکھنے کا سلیقہ سکھایا۔ پھر میں نے لکھنا بند

نہیں کیا بلکہ آج تک لکھتا چلا آرہا ہوں۔ بیگ صاحب ایک مشفق اور رحم دل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت استاد ایک سخت انسان ہیں۔ علمیت کو ابھارنے وہ کسی طرح کا کوئی سمجھوتا نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی سختیوں نے طلبہ میں ایک کامیابی اور مکمل پن پیدا کیا۔ سچ ہے کہ اگر استاد کی سختی نہ ہو تو پھر طلبا کسی بات کے پابند نہیں ہوسکتے۔ بیگ صاحب نے اپنے طالبِ علموں کے لیے جتنی بھی سختی کی وہ ان کی کامیابی کی ضامن بنتی گئی۔ بیگ صاحب سے مستفید ہونے والوں میں میرا شمار ان کے آخری شاگردوں میں ہوتا ہے اور مجھے بیگ صاحب کا شاگرد کہلانے میں فخر محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح کی خوش نصیبی اب آئندہ کسی شاگرد کو نصیب نہیں ہوگی اور نہ ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایسے استاد مستقبل میں پیدا ہوں گے۔ حالات اور ماحول بدلتا جارہا ہے اور انسان کی زندگی حالات اور ماحول کی محتاج ہوتی ہے۔ آج کے حالات بدل گئے ہیں آج کے اس مشینی دور میں خود انسان ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ اب کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کسی اور کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور پروان چڑھانے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔ بلاشبہ استاد ہوں گے، طلباء ہوں گے، تحقیقی کام بھی ہوں گے لیکن وہ بات نہ ہوگی جس سے پتہ چل سکے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان ایک روحانی رشتہ ہوتا ہے۔۔ اسی روحانی رشتہ کے بل بوتے پر ہی تو طالبِ علم اعتماد کے ساتھ چلنا سیکھتا ہے، لکھنا سیکھتا ہے اور اسی طرح ایک استاد کی صلاحیتیں شاگردوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ خدا کرے ایسے اساتذہ کی سرپرستی ہمیشہ ہم پر قائم رہے اور ہم طالبِ علم اپنی علمی شمعوں کو روشن کرتے رہیں۔ آمین۔

۲۲/دسمبر ۲۰۰۲

ڈاکٹر احمد علی شکیل
لکچرار اردو، سردار پٹیل کالج سکندرآباد

○●○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

کی علمی و ادبی خدمات کا اجمالی تنقیدی جائزہ

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کے زیرِ عنوان اس تحقیقی مقالہ کے گزشتہ ابواب میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی سوانح و شخصیت، علمی و ادبی کارناموں اور سماجی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اجمالی طور پر ان کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کو ان کے تحقیقی کارنامے " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " کی بدولت شہرت ملی۔ اردو ادب کے مشاہیر اور معاصرین نے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیق کی تعریف ان کے لطف پر کیے گئے تحقیقی کام کے حوالے سے ہی کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے دیگر تحقیقی و تصنیفی کارنامے قابلِ قدر نہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تحقیق کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے یہ کام دورانِ ملازمت اور شادی شدہ زندگی میں صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد کیا تھا۔ ملازمت کی پابندیوں اور گھریلو مصروفیات کے باوجود انھوں نے تحقیق کے لیے اتنا وقت نکالا کہ حیدر آباد کے مختلف کتب خانوں میں مواد تلاش کیا اور ضرورت پڑنے پر تحقیقی مواد کے حصول کے لیے متعدد بار شمالی ہند کا بھی سفر کیا۔

اردو تحقیق کے طلباء کے گھٹتے ہوئے معیار پر تنقید کرتے ہوئے مشہور محقق پروفیسر گیان چند جین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ہماری جامعات میں اکثر طلباء پی ایچ۔ ڈی۔ میں بہ مجبوری داخلے لیتے ہیں۔ لڑکے ملازمت کی تلاش میں اور لڑکیاں شادی کے انتظار میں وقت کاٹنے کے لیے ریسرچ میں داخلہ لیتے ہیں۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے دورانِ ملازمت شادی شدہ زندگی میں نہ صرف ایک اچھی تحقیقی کاوش پیش کی

بلکہ تحقیق و تصنیف کے سلسلے کو جاری رکھا۔ ان کا موضوع اس نوعیت کا تھا کہ اس پر پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے درکار مواد ملنا بہ ظاہر مشکل تھا۔ کیوں کہ بہ قول پروفیسر مغنی تبسم مرزا علی لطف کا شمار فورٹ ولیم کالج سے وابستہ دوسرے درجہ کے شاعر و مصنف کے طور پر ہوتا ہے۔ لیکن موضوع کے انتخاب کے بعد انھوں نے مواد کی تلاش میں کافی دوڑ دھوپ کی۔ جامعہ عثمانیہ کی لائبریری سے دیوانِ لطف کا مخطوطہ حاصل کیا اور مختلف اردو تذکروں میں شامل لطف کے کلام سے موازنہ کرتے ہوئے لطف کی شاعری کے مختلف پہلو اجاگر کیے۔ تذکروں کے ذریعہ حاصل ہونے والی معلومات سے انھوں نے مرزا علی لطف کی حیات کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا۔ لطف کے سنہ پیدائش کے بارے میں مختلف آرا، کو پیش کیا۔ لطف نے اپنی زندگی کے آخری ایام حیدرآباد ہی میں گزارے تھے۔ لطف کی حیات کا وہ پہلو بہ طور خاص اہمیت کا حامل ہے جب کہ وہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر تذکرہ گلشنِ ہند کی تالیف کر رہے تھے۔ اس دور کے واقعات اور حیدرآباد میں مختلف درباروں سے لطف کی وابستگی کے بارے میں واقعات کی کھوج میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی لگن و جستجو جھلک دکھاتی ہے لطف کے تذکرہ گلشنِ ہند کا مختلف تذکروں سے موازنہ تقابلی تنقید کی اچھی مثال ہے۔ اس کے لیے انھوں نے تقریباً ایک درجن سے زائد تذکروں سے استفادہ کیا۔ تحقیق میں دست یاب مواد سے رائے قائم کرنے کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ تحقیقی مقالہ ہونے کے سبب " مرزا علی لطف حیات اور کارنامے " کا اسلوب خشک نوعیت کا سلاست و روانی سے عاری ہے۔ لطف کی حیات اور تذکرہ گلشنِ ہند کے نسخہ ملنے کے واقعات بیان کرتے ہوئے اسلوب میں دل چسپی پیدا کی گئی ہے۔ لطف کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اس میں اچھی شاعری کے لوازمات سادگی، سلاست روانی، عشق حقیقی کے جذبے، تصوف، زبان و بیان کی پختگی وغیرہ کا جائزہ لیا اور میر کے اشعار سے لطف کا موازنہ کرتے ہوئے لطف کی شاعرانہ عظمت بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنا پہلا کام ہونے کے باوجود پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا یہ تحقیقی کارنامہ لائق ستائش ہے اور اس سے انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ادبی منظر نامے کے ساتھ اس دور کے شعرا کے حالات اور اردو شاعری کے مزاج سے واقفیت ہوتی ہے۔

اردو کا ہر محقق عام طور سے قدیم متون کی تدوین اور دیگر شعری و نثری تصانیف کی ترتیب و تالیف کا کام بھی کرتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بھی محققین کے اسی زمرے میں شامل ہیں۔ مرزا علی لطف پر اپنے تحقیقی کام کو مزید وسعت دیتے ہوئے دیوانِ لطف کی تدوین کا کام کیا۔ ان کا یہ کام اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے تحقیق کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کی لائبریری میں مخزونہ دیوان لطف کا قلمی مخطوطہ حاصل کیا اور تذکروں میں شامل لطف کے کلام سے موازنہ کرتے ہوئے تدوین متن کے اصولوں کی روشنی میں دیوان مرتب کیا۔ لطف کے دور کی زبان آج کے دور کے مقابلے میں قدیم ہے کئی الفاظ متروک ہوچکے ہیں۔ چناں چہ زبان کے ماہرین سے مل کر انھوں نے متروک الفاظ کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی اور فرہنگ ترتیب دے کر لطف کے کلام کو قارئین کے لیے عام فہم بنانے کی کوشش کی اور جن الفاظ کے معنی معلوم نہ کرسکے اس کے بارے میں اعتراف کرلیا لطف کے دیوان کی تدوین کے ساتھ انھوں نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔ جس میں اپنے پہلے کام "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" سے استفادہ کرتے ہوئے لطف کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ کیا۔ البتہ مقدمہ کے آخر میں دست یاب متن کی تدوین و ترتیب میں استعمال کیے گئے طریقہ کار کی تفصیلات بیان کیں۔ اس طرح لطف کے کلام کی تدوین ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ تاہم اس کتاب میں ایک کمزوری یہ کھٹکتی ہے کہ بہت سے اشعار متروک الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے مشکل پسند ہوگئے ہیں اور تدوین متن کا کام اسی وقت صد فی صد مکمل ہوتا ہے جب کہ اس میں شامل تمام مشکل مقامات کے قارئین کو سمجھ میں آسکے۔ لیکن انھوں نے مقدمہ میں لطف کے سہل ممتنع قسم کے اشعار کا میر کے کلام سے تقابل کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لطف کا کلام اس قابل ہے کہ تدوین متن کے ذریعہ اسے محفوظ کیا جاسکے۔

دیوانِ لطف کے علاوہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے "دیوانِ حفیظ" کے عنوان سے حفیظ دہلوی کے کلام کو بھی مدون کیا اور حیدرآباد کے ایک صاحبِ طرز شاعر کاظم علی برق موسوی کا مجموعہ کلام "یدِ بیضا" ترتیب دے کر شائع کیا۔ دیوانِ حفیظ اور یدِ بیضا میں مبسوط مقدمہ لکھ کر شعرا کے کلام کی تشریح بھی کی دیوان حفیظ میں فرہنگ نہیں دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے یہ محسوس کیا ہو کہ حفیظ کا کلام چوں

کہ عہد حاضر سے ملتا جلتا ہے اور دبستانِ دلی کے شاعر ہونے کے ناطے ان کے کلام میں سادگی، سلاست پائی جاتی ہے لہذا انھوں نے فرہنگ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دیوانِ حفیظ کی تدوین کے لیے انھوں نے تقریباً چھ نسخوں سے کلام کا موازنہ کیا اور مقدمہ کے آخر میں متن کی تدوین کے دوران استعمال کیے گئے اصول بیان کیے۔ شعرا و ادیبوں کے کلام کی تدوین و ترتیب کے ذریعہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے قدیم دور کے ادب کو محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے شاعری کی تین کتابوں کے علاوہ نثر میں "نظیر شناسی" کے عنوان سے بھی ایک کتاب اپنے ساتھی ڈاکٹر محمد علی اثر کے اشتراک سے ترتیب دی اور اردو ادب کے نسبتاً گم نام شاعر نظیر اکبر آبادی کی حیات اور ان کی شاعری کے بارے میں مختلف ناقدین فن کے تحریر کردہ مضامین کو یکجا کر کے شائع کیا اور اس کتاب کے لیے ذریعہ نظیر کی شاعری کے عوامی پہلو، قومی یک جہتی، لفظیات وغیرہ پر اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب سے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نظیر کے بارے میں اہم مواد جمع کرنے کی سعی کی ہے۔ اس طرح بہ حیثیت محقق، مدون و مرتب پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اردو کے نامور محققین کی فہرست میں جگہ پانے کے لائق بن جاتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ایک معتبر نقاد بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریریں ان کی تصنیف کردہ کتابوں "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" دیوانِ لطف (تدوین) دیوانِ حفیظ (تدوین)، یدِ بیضا (مرتبہ)، محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے (سوانح)، خوش نفساں (خاکے)، نفوسِ گرامی (خاکے زیرِ طبع)، نظیر شناسی (مرتبہ) میں شامل پیش لفظ، مقدموں وغیرہ میں اور مختلف جرائد، رسائل اور روزناموں میں شامل مضامین اور اردو کی کتابوں پر لکھے گئے تبصروں میں ملتی ہے۔ تبصروں اور تقاریظ میں چوں کہ شعرا و مصنفین کی تعریف و ستائش کرتے ہوئے کتاب کی اہمیت بڑھانا مقصود ہوتا ہے۔ چناں چہ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے تبصروں میں کتابوں کے محاسن بیان کرنے پر زور دیا اور مصائب بیان کرنے سے پہلو تہی اختیار کی جب کہ ایک اچھی تنقید میں محاسن و مصائب کا یکساں دونوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ دیگر تنقیدی مضامین جیسے "غواصی کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار"، "شاعر لافانی، فانی بدایونی" اور "صفی اورنگ آبادی کی غزل

گوئی - وغیرہ میں تاثراتی تنقید کی جھلک ملتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے مضامین میں تنقیدی پہلو سے زیادہ وضاحتی پہلو پایا جاتا ہے اور ان کے یہ مضامین تنقیدوں سے زیادہ اچھے معلوماتی مضامین ہیں۔ چند ایک پیراگرافوں کے ذریعہ ان کا تنقیدی شعور جھلکتا ہے۔ بہ حیثیت نقاد وہ اردو کے ابھرتے ہوئے نقاد کہلائے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نامور محقق و معتبر نقاد کے علاوہ ایک بلند پایہ خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ "خوش نفساں" میں بارہ شخصیتوں پر خاکے موجود ہیں۔ جب کہ "نفوس گرامی" کے نام سے دوسرا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ جس کے مسودے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں شامل خاکے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ابتدا میں مدیر سیاست جناب عابد علی خاں کی فرمائش پر اخبار سیاست کے لیے حیدرآباد کی تہذیبی و سماجی زندگی سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کے خاکے لکھنے شروع کیے۔ بعد میں ان خاکوں کی تہذیبی سماجی و علمی اہمیت کے پیش نظر انھیں کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔ ان خاکوں کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان شخصیتوں کے حالات آنے والی نسلوں کے لیے رہنما بن سکتے ہیں۔ یہ خاکے معلوماتی نوعیت کے ہیں۔ شخصیت کی پیدائش سے لے کر اس کی عمر کے آخری دور تک معلومات کو یکجا کیا جاتا ہے اور ان کے کارناموں کے تفصیلی بیان پر توجہ دی گئی ہے۔ عام طور سے "خاکے" انشائیوں کی طرح ادبی چاشنی کے حامل ہوتے ہیں اور خاکہ نگار اپنے مخصوص اسلوب نگارش سے کسی شخصیت کے حالات کو زندہ جاوید کر دیتا ہے۔ لیکن پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے سادہ اور بیانیہ اسلوب نگارش اختیار کرتے ہوئے یہ خاکے لکھے۔ اسلوب نگارش میں سادگی کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ یہ اخباری ضرورت کے لیے لکھے گئے تھے اور اخبارات میں عموماً معلوماتی مضامین شامل ہوتے ہیں جن کا اسلوب سادہ اور رواں ہوتا ہے۔

ان خاکوں میں مختصر خاکے بھی ہیں اور طویل خاکے بھی، پروفیسر غلام عمر خاں پر لکھا گیا خاکہ طویل ہے جب کہ پروفیسر مغنی تبسم پر لکھا گیا خاکہ ادبی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ اس طرح پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے خاکے حیدرآباد کے تہذیبی ورثے کے محافظ قرار پاتے ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے ایک سوانحی کتاب "محمد عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے" بھی

لکھی ہے۔ اس کتاب میں بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں حیدر آباد میں وزیرِ داخلہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے محمد عزیز مرزا کی شخصیت ان کی خدمات اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دراصل پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا ایم۔ اے کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جسے بعد میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ شائع کیا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ ابتدا ہی سے عزیز مرزا سے متاثر تھے۔ چناں چہ انھوں نے عزیز مرزا کے رشتہ داروں، دوست احباب ان کے خطوط اور نظام دور حکومت کے سرکاری کاغذات کی مدد سے عزیز مرزا کے حالات جمع کیے۔ ۱۹۰۸ء کی موسیٰ ندی کی طغیانی کے بعد امدادی کاموں میں عزیز مرزا کی خدمات وغیرہ کے واقعات کو تفصیلی سے بیان کیا اور عزیز مرزا کی تصانیف تراجم اور سوانح وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا نیز عزیز مرزا کی شخصیت کے کامیاب پہلوؤں کو توصیفی انداز میں پیش کیا اور عزیز مرزا کی شخصیت کو ایک کامیاب شخصیت قرار دیا۔ کتاب چوں کہ جامعہ کی ضرورت کے تحت لکھی گئی اس لیے اس میں تحقیقی پہلو غالب ہے۔ جگہ جگہ حوالوں کا ذکر تحریر کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ تحقیق کے طالبِ علموں کے لیے یہ کتاب رہنما ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے ذریعہ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے حیدر آباد کی تاریخ سے بھی واقفیت ہوتی ہے چناں چہ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی اس کتاب کی سوانحی حیثیت سے زیادہ تاریخی اہمیت زیادہ معلوم ہوتی ہے اور حیدر آباد اور حیدر آبادیوں کے بارے میں یہ کتاب ایک اچھا اضافہ ہے۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی عمر کا ایک عرصہ اردو تدریس اور کتابوں کی تصنیف و تالیف میں گزرا ہے۔ لیکن آندھرا پردیش میں چوں کہ علاقائی اور سرکاری زبان تلگو ہے اور انگریزی دفاتر کی زبان ہے۔ اس لیے عام طور سے یہاں کے سرکاری ملازمین جن کی مادری زبان اردو ہے وہ بھی تلگو پر بھی اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں لیکن انھوں نے اردو کی ترسیل و ترویج کے لیے تلگو والوں کے لیے آسان قواعد کے ساتھ اردو سکھانے کے لیے دو کتابیں تلگو ریڈر (مشقی بیاض) ابتدائی تلگو ریڈر اور تلگو سیکھنے والوں کے لیے ابتدائی (تعارفی) کتاب اپنی ادارت میں شائع کرائیں یہ کتابیں اپنی افادیت سے قطع نظر پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کے علمی و ادبی کارناموں میں ایک وقیع اضافہ نہ تصور کی جائیں گی اور حیدر آباد کی

گنگا جمنی تہذیب کی عملی ترجمان ثابت ہوں گی۔

ایک اچھے تخلیق کار میں اچھی شعری صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ خیالات کو ترتیب دینے کی اس عادت کو انھوں نے شاعری کے اظہار کے سانچے میں ڈھالا اور چند ایک غزلیں بھی کہی ہیں جو ان کے سلجھے ہوئے شعری مزاج کی غمازی کرتی ہیں۔ اگر وہ اپنے شعری سرمایہ کو وسعت دیں تو ان کی شاعری کی سمت کا تعین ہوسکتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے مسلک سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے اہلِ بیت اطہار کے بارے میں اثر انگیز مضامین لکھے ہیں اور اردو کی رزمیہ شاعری وغیرہ کے بارے میں تاثراتی مضامین بھی لکھے ہیں۔ یہ تمام سرگرمیاں ان کے متفرق علمی و ادبی کارناموں میں شمار ہوتی ہیں اور ان کی ہمہ پہلو شخصیت کا اظہار کرتی ہیں۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اپنی ملازمت کے سلسلے میں مصروف بہ کار رہنے کے علاوہ مختلف تہذیبی، سماجی انجمنوں سے وابستہ رہنے اور تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ وہ کئی انجمنوں سے وابستہ ہیں لیکن ان کی خدمات ادارہ ادبیاتِ اردو کے لیے لائق ستائش ہیں۔ وہ بہ حیثیت معتمدِ امتحانات اس ادارہ سے گزشتہ آٹھ سال سے وابستہ ہیں۔ ادارہ کے امتحانات اردو ماہر، اردو عالم اور اردو فاضل کے کامیاب انصرام کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ ادارہ کے امتحان اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دینے کے حکومتی اعلامیہ کے اجراء کے لیے انھوں نے کامیاب کوشش کی ہے۔ آج ادارے کے مراکز ریاست بھر میں پھیل گئے ہیں۔ سال میں دو بار امتحانات منعقد ہوتے ہیں جس میں اوسطاً پانچ ہزار طلباء شرکت کرتے ہیں اور اردو فاضل کی سند کے ذریعہ انگریزی میڈیم کے طلباء ڈی ایس سی امتحان کے لیے اہلِ قرار پاتے ہیں اور سینکڑوں امیدوار سرکاری ملازمتیں حاصل کرتے ہیں اس طرح ادارے کی کامیابی میں پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا رول نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تصانیف میں جا بجا اردو ادب کے مشاہیر نقادوں اور ادیبوں کی آراء اپنی تصانیف کے بارے میں شائع کی ہیں۔ اس سے ایک طرف جہاں خود ستائی کی عادت کا اظہار ہوتا ہے اردو کی کتابوں کا یہ المیہ ہے کہ لوگ کتاب پڑھ کر اپنی رائے قائم نہیں کرتے بلکہ کتاب کے بارے میں مشاہیر کی آراء

پڑھ کر اسے قبولیت کی سند دیتے ہیں۔ اس لیے یہ رواج پڑ گیا ہے کہ مصنفین خود فرمائشیں کر کے اپنی تصانیف کے بارے میں مشاہیر سے اچھی آرا، لکھوا لیتے ہیں۔ لیکن اردو کے حلقوں کے لیے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نئے نہیں ہیں اور خود ان کے تحقیقی کارنامے بھی اس قابل ہیں کہ ان کے بارے میں مشاہیر کی آرا، صداقت پر مبنی محسوس ہوتی ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کی تصانیف کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ مختصر جملوں میں وہ بات کو بیان کرتے ہیں ان کے تنقیدی مضامین اور خاکوں میں اسلوب کی یہ خصوصیت دیکھی جا سکتی ہے۔ جب کہ ان کی تحقیقی تصانیف میں حوالوں کی موجودگی اسلوب میں خستگی اور رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اسلوب شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ روز مرہ زندگی میں جیسے خوش بیاں ہیں اسی طرح ان کا اسلوب نگارش بھی لوگوں کو مطالعہ کے لیے راغب کرتا ہے۔ مجموعی طور پر مرزا اکبر علی بیگ کی علمی و ادبی خدمات اردو زبان و ادب کے لیے ایک سرمایہ ہیں اور آنے والی نسلیں ان کے کارناموں کو مشعلِ راہ بنا کر آگے بڑھیں گی۔

○●○

کتابیات

کتابیات

سلسلہ	مصنف	تصنیف	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱	آدم شیخ ڈاکٹر	انشائیہ	ممبئی	۱۹۶۵ء
۲	آلِ احمد سرور	تنقیدی اشارے	لکھنو	۱۹۶۳ء
۳	احتشام حسین سید	تنقیدی نظریات	لکھنو	۱۹۷۳ء
۴	اطہر پرویز، ڈاکٹر	ادب کا مطالعہ	علی گڑھ	۱۹۶۳ء
۵	اعجاز حسین پروفیسر	نئے ادبی رجحانات	الہ آباد	۱۹۵۷ء
۶	انور الدین خان محمد	سوانح عمری صفی اورنگ آبادی	حیدر آباد	۱۹۸۹ء
۷	جمیل جالبی ڈاکٹر	ارسطو سے ایلیٹ تک مغربی تنقید کے شاہکار مضامین کا اردو ترجمہ	دہلی	۱۹۸۲ء
۸	حامد حسین قادری	داستان تاریخِ ادب	آگرہ	۱۹۳۸ء
۹	خورشید الاسلام پروفیسر	تنقیدیں	لکھنو	۱۹۵۷ء
۱۰	زور محی الدین قادری پروفیسر	اردو اسالیبِ بیان	حیدر آباد	۱۹۲۷ء
۱۱	زور محی الدین قادری پروفیسر	تنقید مقالات	حیدر آباد	۱۹۳۲ء
۱۲	زور محی الدین قادری پروفیسر	داستان ادب حیدر آباد	حیدر آباد	۱۹۵۱ء
۱۳	زور محی الدین قادری پروفیسر	روحِ تنقید	حیدر آباد	۱۹۲۵ء

۱۴	زور محی الدین قادری پروفیسر	فرخندہ بنیاد حیدر آباد	حیدر آباد	۱۹۵۲ء
۱۵	سیدہ جعفر ڈاکٹر	اردو مضمون کا ارتقاء ۱۹۵۰ء تک	حیدر آباد	۱۹۷۲ء
۱۶	سلیمان اطہر جاوید	نذرِ مغنی تبسم	حیدر آباد	۲۰۰۰ء
۱۷	شارب ردولوی ڈاکٹر	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	لکھنو	۱۹۸۱ء
۱۸	صابرہ سعید	اردو ادب میں خاکہ نگاری	حیدر آباد	۔
۱۹	صلاح الدین نیر	روشن، خوش بو، مہک، ، تاثراتی مضامین کا مجموعہ	حیدر آباد	۲۰۰۲ء
۲۰	ظہیر احمد صدیقی پروفیسر	مومن شخصیت اور فن	دہلی	۱۹۹۵ء
۲۱	عبارت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقاء	علی گڑھ	۱۹۹۵ء
۲۲	عارف مجاہد ڈاکٹر	ڈاکٹر حفیظ قتیل حیات و خدمات	حیدر آباد	۱۹۸۹ء
۲۳	عبدالحق ڈاکٹر	چند ہم عصر	دہلی	۱۹۳۲ء
۲۴	عبدالمحمود و مغنی تبسم	نذرِ فانی بدایونی	۔	۔
۲۵	عبداللہ ڈاکٹر سید	اشارات تنقید	دہلی	۱۹۶۶ء
۲۶	عتیق اقبال	نقد اور تحقیق	حیدر آباد	۱۹۹۶ء
۲۷	عزیز مرزا محمد	سیدۃ المحمود	بدایوں	۱۹۲۷ء
۲۸	قمر رئیس ڈاکٹر	ترجمہ کا فن	دہلی	۱۹۷۶ء
۲۹	قیوم صادق احمد پوری	اردو ادب میں تنقید کی اہمیت	۔	۱۹۶۶ء
۳۰	قیوم ایم۔ اے	نقطہ نظر	پٹنہ	۱۹۶۵ء
۳۱	گوپی چند نارنگ	ادبی تنقید اور اسلوبیات	دہلی	۱۹۸۹ء
۳۲	گیان چند جین	تحقیق کا فن	لکھنو	۱۹۹۰ء

۳۳	محمد احسن فاروقی	اردو میں تنقید	-	-
۳۴	محمد نواب کریم	اردو تنقید حالی سے کلیم تک	دہلی	۱۹۹۳ء
۳۵	محمد یسین ڈاکٹر	کلاسیکی مغربی تنقید	دہلی	۱۹۷۵ء
۳۶	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	مرزا علی لطف حیات اور کارنامے	حیدرآباد	۱۹۷۹ء
۳۷	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	دیوانِ لطف	حیدرآباد	۱۹۸۳ء
۳۸	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	خوش نفساں	حیدرآباد	۱۹۸۳ء
۳۹	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	محمد عزیز مرزا شخصیات حیات اور کارنامے	حیدرآباد	۱۹۸۷ء
۴۰	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر اور محمد علی اثر ڈاکٹر	نظیر شناسی	حیدرآباد	۱۹۸۸ء
۴۱	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	دیوانِ حفیظ	حیدرآباد	۱۹۹۳ء
۴۲	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	یدِ بیضا (حضرت برق موسوی)	حیدرآباد	۱۹۹۵ء
۴۳	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	نفوس گرامی (مسودہ) زیرِ طبع	-	-
۴۴	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے (بہ زبان انگریزی) زیرِ طبع	-	-
۴۵	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	تلگو پری چیا واچکم راتا پنی بوستکم	حیدرآباد	۱۹۹۹ء
۴۶	مرزا اکبر علی بیگ ڈاکٹر	تلگو پری چیا وچا کم	حیدرآباد	۱۹۹۹ء
۴۷	مرزا خلیل بیگ	"نذرِ مسعود" (حیدرآباد میں بیرونی شعرا کے مضامین)	علی گڑھ	۱۹۸۹ء
۴۸	مظفر شہ میری	نذرِ جاوید	-	-

۴۹ مقصود حسین ڈاکٹر حامد اللہ افسر میرٹھی

حیات، شخصیت اور کارنامے دہلی ۱۹۹۱ء

۵۰ مسیح الدین مرحوم ڈاکٹر اردو تنقید کی تاریخ لکھنو ۱۹۸۷ء

۵۱ نورالحسن نقوی فن تنقید اور اردو تنقید نگاری علی گڑھ ۱۹۹۰ء

۵۲ نذیرالدین احمد سوانح بہادر یار جنگ حیدرآباد ۱۹۸۲ء

۵۳ نذیر نیازی سید دانائے راز، سوانح حیات حکیم الامت

حضرت علامہ اقبال لاہور ۱۹۷۹ء

رسائل

سلسلہ نشان	نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱	آج کل (ماہ نامہ)	دہلی	اپریل ۱۹۸۰ء
۲	آج کل	نئی دہلی	اگست ۱۹۸۷ء
۳	اقبال ریویو (ششماہی)	حیدرآباد	جون ۱۹۹۸ء
۴	انشاء	کلکتہ	نومبر / دسمبر ۱۹۹۹ء
۵	بانو (ماہ نامہ)	نئی دہلی	مارچ ۱۹۸۱ء
۶	خوش بو کا سفر (ماہ نامہ)	حیدرآباد	جنوری ۱۹۹۹ء
۷	خوش بو کا سفر	حیدرآباد	نومبر ۱۹۹۹ء
۸	خوش بو کا سفر	حیدرآباد	جون ۲۰۰۰ء
۹	سب رس (ماہ نامہ)	حیدرآباد	جون / اگست ۱۹۸۲ء

۱۰	سب رس	حیدرآباد	جولائی ۱۹۸۴ء
۱۱	سب رس	حیدرآباد	ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۶ء
۱۲	سب رس	حیدرآباد	جولائی ۱۹۹۴ء
۱۳	سب رس	حیدرآباد	اکتوبر/نومبر ۱۹۹۵ء
۱۴	سب رس	حیدرآباد	اپریل ۲۰۰۲ء
۱۵	عقاب (ماہ نامہ)	کرنول	اپریل ۲۰۰۲ء
۱۶	عقاب	کرنول	مئی ۲۰۰۲ء
۱۷	عقاب	کرنول	جون ۲۰۰۲ء
۱۸	عقاب	کرنول	جولائی ۲۰۰۲ء
۱۹	عقاب	کرنول	ستمبر ۲۰۰۲ء
۲۰	عقاب	کرنول	اکتوبر ۲۰۰۲ء
۲۱	نیا دور (ماہ نامہ)	لکھنو	اپریل ۱۹۷۹ء
۲۲	نیا دور	لکھنو	جولائی ۱۹۹۵ء

میگزین

۱	اردو کالج میگزین	حیدرآباد	۱۹۶۴-۱۹۶۳ء
۲	الکاظمی	حیدرآباد	-
۳	سوویز (ادبی ٹرسٹ ۳۲ واں		
	کل ہند مشاعرہ)	حیدرآباد	نومبر ۲۰۰۰ء
۴	گورنمنٹ کالج میگزین	حیدرآباد	۱۹۷۹ء-۱۹۷۸ء
۵	وقار (سالانہ مجلہ)	علی گڑھ	۱۹۸۵ء-۱۹۸۴ء

اخبارات

سن اشاعت	مقام اشاعت	نام	سلسلہ نشان
فروری ۲۰۰۲ء	پٹنہ	انقلاب جدید	۱
نومبر ۱۹۹۹ء	حیدرآباد	رہنمائے دکن (روز نامہ)	۲
اپریل ۱۹۷۳ء	حیدرآباد	سیاست (روز نامہ)	۳
نومبر ۱۹۷۵ء	حیدرآباد	سیاست	۴
دسمبر ۱۹۷۵ء	حیدرآباد	سیاست	۵
ستمبر ۱۹۸۰ء	حیدرآباد	سیاست	۶
ستمبر ۱۹۸۰ء	حیدرآباد	سیاست	۷
ستمبر ۱۹۸۰ء	حیدرآباد	سیاست	۸
ستمبر ۱۹۸۰ء	حیدرآباد	سیاست	۹
مارچ ۱۹۸۱ء	حیدرآباد	سیاست	۱۰
نومبر ۱۹۸۱ء	حیدرآباد	سیاست	۱۱
اپریل ۱۹۸۲ء	حیدرآباد	سیاست	۱۲
اپریل ۱۹۸۳ء	حیدرآباد	سیاست	۱۳
مئی ۱۹۸۳ء	حیدرآباد	سیاست	۱۴
اگست ۱۹۹۲ء	حیدرآباد	سیاست	۱۵
دسمبر ۱۹۹۳ء	حیدرآباد	سیاست	۱۶
مئی ۱۹۹۵ء	حیدرآباد	سیاست	۱۷

۱۸	سیاست	حیدرآباد	جولائی ۱۹۹۵ء
۱۹	سیاست	حیدرآباد	جنوری ۱۹۹۹ء
۲۰	سیاست	حیدرآباد	ستمبر ۱۹۹۹ء
۲۱	سیاست	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۹۹ء
۲۲	سیاست	حیدرآباد	مارچ ۲۰۰۰ء
۲۳	سیاست	حیدرآباد	اپریل ۲۰۰۰ء
۲۴	سیاست	حیدرآباد	نومبر ۲۰۰۰ء
۲۵	سیاست	حیدرآباد	دسمبر ۲۰۰۰ء
۲۶	سیاست	حیدرآباد	اپریل ۲۰۰۱ء
۲۷	سیاست	حیدرآباد	جولائی ۲۰۰۱ء
۲۸	سیاست	حیدرآباد	مئی ۲۰۰۲ء
۲۹	سیاست	حیدرآباد	ستمبر ۲۰۰۲ء
۳۰	منصف (روزنامہ)	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۸۳ء
۳۱	منصف	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۸۳ء
۳۲	منصف	حیدرآباد	دسمبر ۱۹۸۷ء
۳۳	منصف	حیدرآباد	جولائی ۱۹۹۱ء
۳۴	ندائے ملت (ہفتہ روز)	لکھنو	جون ۱۹۹۵ء
۳۵	ہماری زبان (ہفتہ روز)	نئی دلی	اگست ۱۹۷۸ء
۳۶	ہماری زبان	نئی دلی	جون ۱۹۹۵ء
۳۷	ہماری زبان	نئی دلی	جولائی ۱۹۹۴ء

۳۸	ہماری زبان	نئی دہلی	اگست ۱۹۹۵ء
۳۹	ہماری زبان	نئی دہلی	نومبر ۱۹۹۵ء
۴۰	ہماری زبان	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۹۵ء
۴۱	ہماری زبان	نئی دہلی	جنوری ۱۹۹۶ء
۴۲	ہماری زبان	نئی دہلی	جنوری ۱۹۹۶ء
۴۳	ہماری زبان	نئی دہلی	جون ۱۹۹۶ء
۴۴	ہماری زبان	نئی دہلی	اگست ۱۹۹۶ء
۴۵	ہماری زبان	نئی دہلی	اگست ۱۹۹۶ء
۴۶	ہماری زبان	نئی دہلی	فروری ۱۹۹۷ء
۴۷	ہماری زبان	نئی دہلی	اپریل ۱۹۹۷ء
۴۸	ہماری زبان	نئی دہلی	اپریل ۱۹۹۷ء
۴۹	ہماری زبان	نئی دہلی	نومبر ۱۹۹۸ء

شخصی انٹرویو

سلسلہ	نام	مقام	تاریخ
۱	مرزا اکبر علی بیگ	حیدر گوڑہ، حیدر آباد	۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۲ء
۲	کنیز سکینہ (اہلیہ مرزا اکبر علی بیگ)	حیدر گوڑہ	یکم نومبر ۲۰۰۲ء
۳	مرزا اکبر علی بیگ	ادارہ، ادبیاتِ اردو	۲/ نومبر ۲۰۰۲ء

DEPT. OF URDU,
SCHOOL OF HUMANITIES,
UNIVERSITY OF HYDERABAD, HYDERABAD - 500046

CERTIFICATE

This is to certify that I, MD. ABRARUL BAQUI, have carried out the research embodies in the present thesis **entitled "Prof. Mirza Akbar Ali Baig; Shaqsiyat aur Ilmi-o-Adabi Khidmaat"** (PROF. MIRZA AKBAR ALI BAIG; PERSONALITY, LITERARY & ACADEMIC ACHIEVEMENTS) for the full period prescribed under Ph.D ordinance of the University.

I declare to the best of my knowledge that no part of this thesis was earlier submitted for the award of research degree of any University.

31/12/02

(Signature of the candidate)
Name: MD. Abrarul Baqui
M. A., M. Phil,
Enrolment No.2KHUPH05

31/12/2002

(Signature of the supervisor)
Prof. Mohammed Anwaruddin

31/12

अध्यक्ष/Head
उर्दू विभाग/Department of Urdu
Head Department of Urdu,
University of Hyderabad.
University of Hyderabad
हैदराबाद-500 046

5.1.03

/c **Dean, School of Humanities,**
University of Hyderabad.

DEAN
SCHOOL OF HUMANITIES
University of Hyderabad

"Prof. MIRZA AKBAR ALI BAIG; SHAQSIYAT AUR ILMI-O-ADABI KHIDMAAT"

(Prof. Mirza Akbar Ali Baig; Personality, literary & academic achievements)

THESIS

Submitted to the UNIVERSITY OF HYDERABAD in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of DOCTOR OF PHILOSOPHY in Urdu.

SUBMITTED BY

MD. ABRARUL BAQUI
M.A., M. Phil,

SUPERVISED BY

Dr. Mohammed Anwaruddin
Professor Department of Urdu,
University of Hyderabad.

DEPT. OF URDU,
SCHOOL OF HUMANITIES,
UNIVERSITY OF HYDERABAD, HYDERABAD - 500 046

December 2002